رات چور اور چاند
بلونت سنگھ

رات، چور اور چاند

رات، چور اور چاند

بلونت سنگھ

مکتبۂ اردو ادب

بازار ستھاں اندرون لوہاری گیٹ، لاہور

ناشر ———— سرفراز احمد
مطبع ———— سکہ پرنٹرز لاہور
قیمت ———— ۲۵۰ روپے

۱
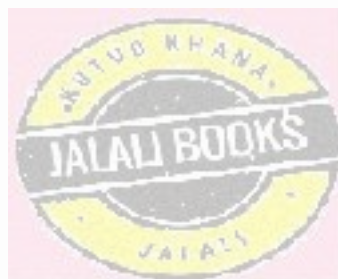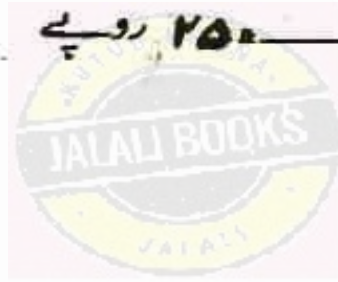
جب پالا سنگھ بابے کی بوسیدہ سمادھ کے قریب پہنچا تو اُس کے قدم رُک گئے۔

سورج غروب ہو رہا تھا اور چند ہلکی سُرخ بدلیوں کو چیر کر آسمان کے دوسرے سرے تک پہنچتی ہوئی کرنیں یوں دکھائی دیتی تھیں جیسے کوئی ڈوبتا ہوا شخص سہارے کے لئے بازو پھیلا دے۔ کھیتوں میں اُگے ہوئے پودے ساکت کھڑے تھے۔ بل کھاتی ہوئی پگڈنڈیاں جیسے دھوپ کی تمازت سہہ کر نڈھال ہو چکی تھیں۔ درختوں کے سائے مضحکہ خیز حد تک طویل ہو گئے تھے۔

لاری سے اُترنے کے بعد پالا سنگھ کو پانچ کوس کا فاصلہ پیدل طے کرنا پڑا۔ وہ تھکاوٹ کی وجہ سے نہیں رُکا تھا...... وہ ایک لمبا تڑنگا نوجوان شخص تھا۔ ہاتھ میں لٹھ لیے دھوئیں کے مرغولے کی طرح بل کھاتا، لہراتا اور گاتا ہوا وہ یہاں تک چلا آیا تھا۔ طویل عرصے کے بعد ایک مرتبہ پھر اسے اپنا گاؤں دکھائی دینے لگا تھا بہت دور درختوں کے جھنڈ میں کچھ پوشیدہ اور کچھ عیاں، گاؤں کا مبہم خاکہ دکھائی دیا۔ تو وہ ٹھہر گیا اور بابے کی سمادھ کے سامنے بنے ہوئے چبوترے کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

وہ پتھر کے مجسمے کی طرح جامد کھڑا تھا۔ اس کے لٹھ کی برنجی شام رخصت ہوتی ہوئی دھوپ میں جگمگا اٹھی۔ اس کا کھدر کا تہمد ایک مرتبہ لہرایا اور پھر اس کے جھول پیچھے کی طرف گر گئے۔ اس کے بیضوی چہرے کا رنگ پیلے تانبے کے مانند تھا۔ چڑھتی

جوانی کا عالم تھا۔ اس لیے چہرہ ابھی مکمل طور پر بھر انہیں تھا۔ اس کی اُونچی آریائی ناک چہرے کے مقابل کچھ لمبی ہی معلوم ہوتی تھی۔ رخساروں کی ہڈیاں خاصی اُبھری ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ داڑھی کے باریک بال اُگ آئے تھے لیکن گلوں اور ٹھوڑی کی درمیانی جگہ ہنوز خالی تھی۔ اس کے جوڑے پر بندھی ہوئی ہلکے گلابی رنگ کے تاگوں کی جالی سے جوڑے کا حجم نمایاں ہو رہا تھا۔ گدی کے چند چھوٹے چھوٹے بال جو لمبے بالوں کے ساتھ سمٹ نہ سکتے تھے ہوا میں لہراتے رہتے تھے اور اگر کبھی وہ سر اِدھر اُدھر گھماتا تو یہ بال کانوں کی لوؤں کو چُوم لیتے تھے۔ اس کی سیاہ چمکیلی آنکھیں اُفق پر جمی ہوئی تھیں۔ اگرچہ وہ ناک ہی کے راستے سانس لے رہا تھا۔ لیکن حسبِ معمول اُس کا مُنہ اب بھی ذرا سا کھُلا تھا۔ اس کے اُجڈ بشرے سے سوچ بچار کے آثار ہویدا تھے۔

سامنے کے مناظر کا مجموعی تاثر پہلے تو اس قدر شدید تھا کہ وہ سلجھے ہوئے انداز سے کچھ بھی نہیں سوچ سکا۔ اس کی زندگی کا ایک مکمل باب اس کی نظر کے سامنے تھا۔ لیکن سر دست وہ تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ ابھی وہ محض مجموعی تاثر سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔

ہر چیز تعجب انگیز طور پر ویسی ہی تھی۔ جیسی اُس نے چھ سات سال پہلے دیکھی تھی۔ فی الحقیقت وہ حیران ہو رہا تھا کہ وہ ایسی دلفریب جگہ سے اس قدر طویل مدت تک علیحدہ کیونکر رہ سکا۔ وہ اپنے پُر فضا گاؤں کا تصوّر اپنے حافظے سے دُور رکھنے میں کامیاب ہی کیونکر ہوا۔ سطح زمین کے نشیب و فراز، پگڈنڈیوں کے ہر پیچ و خم سے وہ کس قدر مانوس تھا۔ پھر اسے یُوں سمجھائی دینے لگا۔ جیسے وہ کہیں گیا ہی نہیں۔ نہ اس نے کلکتے میں کبھی آوارہ گردی کی، نہ کبھی وہ موٹر ڈرائیور ہی بنا، نہ کبھی غنڈوں کے ٹولے کی رہنمائی کی، نہ کبھی اس نے لڑائیاں لڑیں، نہ کبھی اس پر مقدمہ چلا اور نہ کبھی اس نے ایک برس قید بامشقت ہی جھیلی۔ وہ تو یہیں پر تھا۔ محض چند پیلوؤں کے لالچ میں آ کر سیدھی راہ سے بھٹک گیا تھا۔

سامنے گوردوارہ نظر آ رہا تھا۔ گوردوارے کی عمارت گاؤں سے تقریباً نصف میل دور ہی بنی ہوئی تھی۔ وہیں سطحِ زمین سے ذرا سا اُونچا رہٹ عورتوں کے نہانے

کے پیے چار دیواری۔ بڑ کے گھنے درخت کی چھاؤں۔ وہی انگور کی بیلیں، ہوا میں لہراتا ہوا گوردوارے کا مٹیالے زرد رنگ کا جھنڈا، ادھر گوبر کے ڈھیر ادھر سرکنڈوں کے جھنڈ۔

وہ رہا قبرستان کے قریب چھوٹا سا میدان جہاں لڑکپن میں وہ دیگر لڑکوں کے ساتھ کھدو کھونڈی کھیلا کرتا تھا۔ اسے اچھی طرح یاد ہے کہ کپڑے کی گیند عموماً قریب والی چھوٹی سی نہر میں گر پڑتی تھی اور بھیگ کر اس قدر بھاری ہو جاتی تھی کہ کھونڈی کی ٹھوکر سے دو قدم لڑھک کر بھد سے رُک جاتی۔ گیند خواہ کس قدر کس کر باندھی جاتی لیکن پھسپھسی ہو کر رہ جانا تو ازل ہی سے اس کے نصیب میں لکھا تھا۔ بچاری لڑھکتی بھی تو کہاں تک؟

. . . . اور وہ مدرسہ! توبہ!! خوب مار پڑتی تھی کمبختوں کے وہاں۔ نہ مدرسہ شروع ہونے کا وقت مقرر تھا اور نہ چھٹی کا۔ بس مُنہ اندھیرے اونگھتے ہوئے وہاں پہنچ جاؤ۔ سارا دن مار کھاؤ اور سورج ڈوبے گھر واپس آؤ۔ چھٹیاں تو ہوتی ہی نہیں تھیں یہاں تک کہ اتوار کے روز بھی دو چار گھنٹوں کے لئے جانا پڑتا تھا۔ اور اگر کبھی چھٹیاں ہو بھی جاتیں تو پھر منشی لوگ گھر کے لیے اس قدر زیادہ کام دے دیتے تھے کہ چھٹیوں کا مزا ہی کرکرا ہو جاتا۔ لیکن بھی وہ تو من مانی چھٹیاں منایا کرتا تھا۔ غیر حاضر رہنے کے بعد جب وہ مدرسے میں جاتا تو اسے مُرغا بننا پڑتا اور اسی حالت میں پیٹھ پر دو اینٹیں اٹھا کر اسکول کے گرد چکر لگانے پڑتے۔ یا پھر چوتڑوں پر بید برستے۔ ہائے کیا مصیبت تھی وہ پڑھائی بھی۔ لڑکے ہی مدرسے کا فرش دھوئیں، وہی ٹاٹ بچھائیں، وہی مدرسے کی کیاریوں میں آبپاشی کریں، امتحان دیں اور پھر وہی مار کھائیں. . . . . . . اور وہ منشی دینا ناتھ کس قدر ظالم شخص تھا۔ کیسی بے حسی کے ساتھ لڑکوں کو مار مار کر اُدھ موا کر دیتا تھا۔ اسی کی مار سے ڈر کر اس نے لکھنا پڑھنا ترک کر دیا تھا۔ مدرسہ چھوڑ دینے کے بعد بھی جب کبھی منشی دینا ناتھ سے راستے میں مٹھ بھیڑ ہو جاتی تو وہ اس کی نظر دل سے بچنے کے لئے ایک طرف کو سٹک جاتا۔ لیکن اب کہیں دینا ناتھ اسے دیکھ پاتے تو مارے دہشت کے گھگھی بندھ جائے بڈھے کی۔ تصور میں دینا ناتھ کی گھگی بندھی دیکھ کر اس کے دل کو گونہ تسکین حاصل ہوئی۔

پالا سنگھ نے دل ہی میں خوش ہو کر حسب عادت اپنے اگلے دو دانتوں کی درز میں سے لعابِ ذہن کی پچکاری چھوڑ دی اور اب چونکہ اس کی ایک ٹانگ نسبتاً زیادہ بوجھ پڑنے کے باعث تھک سی گئی تھی۔ اس نے ذرا پہلو بدل کر بوجھ دوسری ٹانگ پر ڈال دیا اور ایک مرتبہ پھر ذہن کو آزاد چھوڑ دیا......

.... وہ کھیت، وہ رہٹ، وہ قبرستان، وہ مرگھٹ، وہ پیر جی کا مزار، وہ جوہڑ، وہ درخت...... غرض وہ چپّے چپّے سے آشنا تھا۔ لڑکوں کی ٹولیوں کے ساتھ وہ قبرستان میں بیر توڑنے کے لئے جایا کرتا تھا۔ پاؤں اور ہاتھوں کی انگلیوں میں کانٹے چبھ جاتے، شرطیں بد بد کر دوڑیں لگا کرتی تھیں۔ اور قبرستان سے ذرا ہٹ کر وہ رہٹ! ——— جہاں ایک مرتبہ خربوزے چرانے پر شیرو نے انھیں خوب مارا تھا۔ وہ انھیں کنوئیں میں گرا دینے کی دھمکی دیتا تھا۔ اور یہ خوف کے مارے روتے اور ہاتھ جوڑتے تھے۔ تعداد میں وہ تین چھوٹے چھوٹے لڑکے ہی تو تھے بچاروں کا بس بھی کیا چلتا۔ ان سب کے جوڑے تو اس نے قابو میں کر رکھے تھے۔ حکم ملا۔ کان پکڑو۔ انھوں نے کان پکڑ لیے۔ حکم ہوا۔ مرغے بنو۔ وہ مرغے بھی بنے۔ پھر حکم صادر ہوا۔ ناک سے زمین پر لکیریں نکالو۔ یہ ٹیڑھی کھیر تھی۔ ہر چند انھوں نے اس ذلت سے بچنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ بھی ایک ہی کائیاں تھا۔ بالآخر انھوں نے روتے روتے ناک سے لکیریں بھی نکالیں۔ تب اس نے ان کے جوڑے چھوڑ دیئے۔ اور کڑک کر کہا۔ آئندہ اگر ادھر کا رخ بھی کیا تو گردن توڑ کر کنوئیں میں پھینک دوں گا۔ یہ جان چھڑا کر بھاگے تو ایسے بگٹٹ بھاگے کہ پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا اور جب بہت دور آ گئے اور سمجھے کہ اب زد سے باہر ہیں تو پھر رک کر زور زور سے آوازیں دینے لگے "اوئے شیرو لنگیا! تیری بھین دی...... تیری ادے بے بے دی...... اسی آؤں گے (ہم آئیں گے) اسی آؤں گے اوئے...... جا کہہ دے اپنی بھین نوں!"

پھر مٹھیاں بھینچ کر اور بازو ہلا ہلا کر انھوں نے کئی شرمناک حرکتیں کیں۔ شیرو کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ لیکن لاچار تھا۔ ایک ٹانگ کمزور تھی۔ دوڑ کر انھیں پکڑ بھی نہیں سکتا تھا۔

شیرو کچھ ایسا جوان تو نہیں تھا، مگر بات یہ تھی کہ وہ بچارے خود ہی کمسن تھے۔ ان دنوں گاؤں میں اچھے اچھے جوان تھے۔ ممکن ہے اب انھوں نے گھر بسا لیے ہوں اور بھلے آدمیوں کی سی زندگی بسر کرنے لگے ہوں۔ بھوجو آ ہا ہا کیا کڑیل جوان، چوڑی سل کی مانند بہ فراخ سینہ پھولے ہوئے نتھنے لٹھ چلانے میں استاد۔ اس کے خوف سے چور گاؤں میں گھسنے کا حوصلہ نہ کرتے تھے۔ بھوتو۔۔۔۔ کی دھاک بھی دور دور تک بیٹھی ہوئی تھی۔ بھوجو کی طرح جسیم نہیں تھا۔ بدن اکہرا اور تازی کُتے کی مانند تنا ہوا۔ جسم پر چٹکی بھرنا ناممکن۔ چاق و چوبند۔ سونچی کے کھیل میں تو بڑے بڑوں کے دم ٹوٹ جاتے تھے اس کے سامنے۔ اور مھیل سنگھ کلائی پکڑنے میں سب کا گرو۔ مگدر بھی خوب ہلاتا تھا۔ کیسی تیز اور متجسس آنکھیں تھیں اس کی۔ مگر کچھ نہیں اُس نے عورتیں بھگانے میں زندگی خراب کر لی۔ شراب اور عورت تو مرد کو یوں کھا جاتے ہیں جیسے چنے کو گھن۔ ایک وہ مسلمان ساہنسی تھا۔ تاڑ کے درخت کی طرح لانبا۔ دوڑ لگانے میں اوّل نمبر جنگلی بلے پکڑنے میں عجیب مہارت حاصل تھی۔ ادھو۔۔۔۔۔۔ ایک مرتبہ خوب تماشہ ہوا ۔۔۔۔۔۔ کہاں گیا وہ بیری کا درخت؟۔۔۔۔ ارے وہ رہا۔ بلّا چڑھ گیا درخت پر۔ اور نیچے کتوں نے درخت کو گھیر لیا۔ بلا سہما ہوا۔ کتے بے چین۔ جھنجھلا جھنجھلا کر بھونکتے تھے۔ بھونکنے کی آوازیں بھی مختلف تھیں۔ ایک تو موٹے بھوٹانی کتے تھے۔ بڑی بھاری آوازیں وقار کے ساتھ کبھی بھوں کر دیتے۔ ڈگ کتے خوب گلا پھاڑ پھاڑ کر بھونکتے تھے۔ سب سے زیادہ بے چین پستہ کتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے جلدی جلدی دُمیں ہلاتے کبھی اُچک کر ادھر آتے کبھی اُدھر۔ بھونکتے تو گھڑی کے الارم کی طرح رُکنے ہی میں نہ آتے تھے۔ بلکہ کبھی کبھار اکتا کر وہ حلق میں سے نئے ہی سُر میں آواز نکالنے لگتے۔ جنہیں باہر نکالے تازی کتے علیحدہ کھڑے تھے وہ بھونکتے نہیں تھے۔ شاید انھیں معلوم تھا۔ کہ بھونکنا ان کا کام نہیں۔ وہ بس عملی کام کے لئے بہ دل و جان آمادہ کھڑے تھے۔ مگر بلّا تھا کہ اوپر سے اُترنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ آخر ساہنسی نے اپنے لٹھ کے کچوکوں سے اسے اس قدر پریشان کیا کہ وہ دفعتہً پلٹ کر ساہنسی پر ٹوٹ پڑا۔ ساہنسی تو پھرتی سے پیچھے کی طرف سرک گیا اور کتوں نے دیکھتے دیکھتے بلّے کو جا دبوچا

گاؤں کے کچے مکانات مٹیالے دھبوں کی مانند دکھائی دے رہے تھے۔ لیکن وہ بھی ہر نظر آنے والے دھبے کو پہچانتا تھا۔ سب مکان آپس میں گڈمڈ ہو رہے تھے اور ان سے ذرا ہٹ کر دو چیزیں ایسی نظر آتی تھیں جیسے ایک بڑی چٹان کے پاس ہی دو چھوٹے چھوٹے سنگ ریزے پڑے ہوں۔ ایک تھی دھرم شالہ اور دوسرا تھا رہٹ۔ یہ رہٹ گاؤں والوں کے لئے بہت مفید تھا۔ آبادی کا زیادہ حصّہ یہیں سے پانی بھرتا تھا۔ پالتو جانور بھی اسی جگہ نہلائے جاتے تھے اور کپڑے بھی یہیں دھوئے جاتے تھے۔ عورتوں کے نہانے کے لئے گوردوارے کی طرح ایک چار دیواری علیحدہ بنی ہوئی تھی۔ گوردوارہ گاؤں سے ذرا دُور تھا۔ اس لیے عورتوں کی سہولت کے لیے ان کے نہانے کا انتظام یہیں پر کر دیا گیا تھا۔

دھرم شالہ کے پاس ایک جوہڑ تھا۔ جوہڑ کے دوسرے کنارے پر ٹنڈے پیر جی کی قبر تھی۔ دھرم شالہ میں زیادہ رونق نہیں ہوتی تھی۔ گاؤں کی آبادی دو حصّوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ایک تو خواص اور دوسرے عوام خواص میں نمبردار، پٹواری، ساہوکار اور ان کے مصاحبین شامل تھے اور باقی لوگوں کو عوام میں شامل کیا جا سکتا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ موٹی اسامیاں اپنے فالتو وقت کا زیادہ حصّہ دھرم شالہ میں کاٹتی تھیں حقّہ پیتے، گپ لڑاتے یا جوسر کھیلتے۔ باقی لوگ فالتو وقت گاؤں کے دوسری جانب دھریک کے درختوں کے ایک جھنڈ تلے گزارتے تھے۔ اس جگہ کو باغیچی کہا جاتا تھا۔ اور قدرتی طور پر یہاں رونق بھی زیادہ ہوتی تھی۔ گرمیوں کے دنوں میں لوگ اپنی اپنی چارپائیاں اُٹھائے باغیچی میں پہنچ جاتے اور حقّے تازہ کر کے بیٹھ جاتے ایسے موقعوں پر بوڑھے جوان سبھی بلا لحاظ عمر وہاں یکجا ہوتے تھے۔ لڑکے عموماً نری کوڑیوں کے کھیل کھیلتے تھے۔ اس کھیل میں ہار جیت ہونے پر ایک دوسرے کے ہاتھوں کی پشت پر چیونٹی مارتے تھے۔ یا پھر دور رُخے کانٹوں میں دھریک کی گول گول مولیوں کو جوڑ کر پنگوڑے بناتے اور ایک لمبا کانٹا زمین میں گاڑ کر اس کی نوک پر اسے گھماتے۔ شام کے وقت عموماً گلی ڈنڈا، کھدو کھونڈی یا اور کئی کھیلوں میں حصّہ لیتے اور راتوں کو آنکھ مچولی! جوان بیٹھے ٹھٹھے کھیلا کرتے۔ ان کا کسی کام میں جی نہیں لگتا تھا۔ ان میں سے

جنھیں کسرت کا خاص شوق تھا۔ وہ اپنے بازوؤں کے پٹھوں کو ٹٹولتے، منڈی ہوئی رانوں پر سے تہمد ہٹا دیتے اور ان پر ہاتھ پھیر پھیر کر ان کی سختی کا جائزہ لیتے۔ اِدھر اُدھر کے طاقتور نوجوانوں کی باتیں شروع کر دیتے۔ "بھئی بھنگا سنگھ بڑا کرارہ نوجوان ہے۔"

"ولائت جیلن بڑا دبنگ ہے۔"

"جوزا سنگھ بوڑھا ہونے کو ہے لیکن اب بھی بڑا اکڑو ہے۔"

"وچیلی نرا آدمی ہے۔"

بسیار خور اشخاص کے واقعات کا ذکر بڑے فخر سے کیا جاتا۔ ڈاکہ زنی کے قصے سنائے جاتے۔ عورتوں کے بھگائے جانے کے افسانے دُہرائے جاتے۔ پھر باتوں باتوں میں آپس میں جھڑپیں بھی ہو جاتیں۔ اکثر بات زیادہ بڑھ جاتی تو نوبت دھینگا مشتی اور ٹنجا ٹنجی تک جا پہنچتی۔ یا کلائی پکڑنے کے مقابلے ہونے لگتے۔

ایسے موقعوں پر بڑے بوڑھے اپنی شطرنج چھوڑ کر، اور ننگ دھڑنگ بچے اپنے کھیلوں کو بھول کر بغلیں کھجاتے لڑنے والوں کے قریب سمٹ آتے۔ بڑا شور و غل مچتا، تماشائی حریفوں کو شہ دے دے کر اُبھارتے، چیختے، پگڑیاں اُچھالتے اور گالیوں کے دریا بہا دیتے اور اگر دھینگا مشتی میں کوئی فریق دوسرے کے نیچے آ جاتا تو پھر تماشائی نیچے والے فریق کو اُٹھ کھڑے ہونے کے سو سو داؤ بتاتے۔ "اوئے ارک (کہنی) تے ہتھ پا..... اوئے ارک تے...... مار بچکا...... شاباجوان دے...... بتے بتے۔"

ایک تو نیچے والے کے یونہی گھٹنے چھل جاتے دوسرے اوپر سے رائے دینے والوں کی آوازیں اسے اور بھی بوکھلا دیتیں۔ اگر کبھی نیچے والا فریق سچ مچ اوپر والے کے چنگل سے نکل کر اُٹھ کھڑا ہوتا اور الٹا حریف ہی کو دے پٹکتا تو بس پھر قیامت ہی آ جاتی۔ بچے ناچتے اور تالیاں بجانے لگتے۔ "اوئے اودھر ہو پھلی کدی موئی سو۔" کسی بوڑھے کے یہ الفاظ سُن کر ننگا لڑکا شرما جاتا۔ دونوں ہاتھ آگے رکھ، رانیں سکیڑ کر آگے کو جھک جاتا۔ اس پر اس کا کوئی شریر ساتھی پیچھے سے پاؤں کی ایک ٹھوکر مار کر بھاگ جاتا۔ اس پر بوڑھے منہ پھاڑ پھاڑ کر ہنستے اور داڑھیاں پھٹکارتے...... لڑکے چلچلاتی دھوپ میں ایک دوسرے کا تعاقب کرتے ہوئے دُور دُور تک

نکل جاتے۔

دھرم شالہ کی پارٹی میں یہ زندہ دلی نہیں تھی۔ ان لوگوں پر متانت سی طاری رہتی۔ ہنسنا کم کم۔ نشست و برخاست میں تکلف اور عوام سے کھل کر بات کرنے میں بھی کچھ رعونت آمیز جھجک۔ البتہ جب کبھی اس طرف سے داروغہ جی کا گزر ہوتا تو ان لوگوں میں ہلچل سی مچ جاتی۔۔۔۔ داروغہ جی گاؤں کی اکلوتی کرسی پر بیٹھے ہیں اور سب لوگ ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ انڈے اکٹھے کئے جا رہے ہیں۔ اگر داروغہ جی سکھ ہیں، تو مرغیاں جھٹکہ کی جاتی ہیں۔ اگر رسولؐ کے نام لیوا ہیں تو انہیں اسلامی طریقہ پر ذبح کیا جاتا ہے۔ غرض مرغی بہر صورت جان سے ہاتھ دھوتی ہے۔ گاؤں کے سبھی لوگ کیا چھوٹے کیا بڑے آ جا رہے ہیں۔ جس شوق سے لوگ داروغہ جی کو دیکھنے کے لیے آتے ہیں اس شوق سے تو مداری کے بندر کو بھی نہیں دیکھتے۔ جتنے روز تک داروغہ جی گاؤں میں قیام کرتے سب لوگ گویا سُولی پر ٹنگے رہتے۔

ایک مرتبہ ایک بڑا نامی ڈاکو گرفتار کر کے ان کے گاؤں میں لایا گیا۔ اور اقبال جرم کروانے کے لئے ڈاکو کو پیٹ کے بل لٹا کر اس پر جوتے برسائے جاتے تھے۔ لوگ تماشہ دیکھنے کے لیے جمع ہو جاتے۔ اس کو پٹتے ہوئے دیکھا کرتے۔ مار کھاتے وقت سکھ ڈاکو کی داڑھی گوبر ملی گرد میں اٹ جاتی۔ اس کے سر کے بال کھُل کر پریشان ہو جاتے پالا سنگھ ان دنوں بہت چھوٹا تھا اور اُسے ڈاکو کا حلیہ بخوبی یاد تو نہ تھا۔ لیکن اتنی بات اچھی طرح یاد تھی کہ ڈاکو بہت بھاری ڈیل ڈول کا شخص تھا۔ گھنٹہ گھنٹہ بھر مار کھانے کے بعد بھی جب وہ کھڑا ہوتا تو خاصا معزز آدمی دکھائی دیتا تھا اور اپنے وقار میں ذرہ برابر فرق نہ آنے دیتا۔ نہ چیختا نہ چِلاتا چپ چاپ مار کھائے جاتا اور ڈھیٹ ایسا کہ کسی صورت بھی جُرم کا اقبال کرنے میں نہ آتا۔

انہیں دنوں ایک بہت دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ دھرم شالہ کے قریب منڈے پیر جی کی قبر تھی، جس پر ہر سال ایک دو روز میلہ لگتا تھا۔ ان دنوں میلہ لگا تو سارا دن خوب چہل پہل رہی۔ ساہوکاروں نے داروغہ جی کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے دنگل کا انتظام کیا۔ شام کے وقت دھرم شالہ کے قریب والے کھیت میں تماشائی

اور پہلوان جمع ہو گئے۔ پہلے تو ادھر ادھر کے چھوکرے پکڑ دھکڑ کرتے رہے۔ پھر دو چار اچھی کشتیاں بھی ہوئیں۔ لیکن ان میں ایک جوان ایسا تھا جس سے مقابلہ کرنے کے لئے کوئی شخص طیار نہیں ہوا۔ ان کے گاؤں میں اچھے اچھے جوان موجود تھے۔ لیکن وہ پہلوان اس قدر قوی ہیکل تھا کہ اس کی طرف آنکھ بھر کر دیکھنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ یہ کدو سا سر، بال مشین سے منڈے ہوئے، سر کے بیچوں بیچ آٹھ دس بالوں کی ننھی سی چٹیا ہوا میں لہراتی ہوئی، کان ٹوٹے ہوئے، گردن پر موٹی، سر بشکل گھومتا تھا یہ بھاری بھرکم رانیں اور ان پر اُبھری اُبھری مچھلیاں ــــ بڑے بوڑھے سر ہلاتے اور کہتے بھئی اکھاڑوں کا اڑا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس کا جوڑ یہاں نہیں مل سکے گا گاؤں والوں کی ہیٹی تھی۔ لیکن وہ بچارے کیا کر سکتے تھے۔

ادھر پہلوان تکبر سے نتھنے پھلائے۔ لنگر ہوا میں گھماتا ہوا اکھاڑے میں مست ہاتھی کی طرح چکر لگا رہا تھا۔ گاہے بگاہے مجمع پر نگاہ ڈالتا اور سانڈ کی طرح ڈکراتا۔

"کیوں، ہے کوئی مائی کا لعل؟"

ادھر وہ ڈاکو برآمدے میں پیٹ کے بل لیٹا جوتے کھا رہا تھا۔ کہیں اس نے پہلوان کی للکار سن لی۔ وہ چلایا "ٹھہرو بھئی ٹھہرو .... مینوں تھانیدار کے پاس لے چلو"

سپاہی سمجھا کر شاید اقبالِ جرم کرنا چاہتا ہے اس نے ہاتھ روک لیا اور اسے داروغہ کے سامنے پیش کر دیا۔ ڈاکو نے بالوں کو سمیٹ کر جوڑا باندھتے ہوئے کہا۔

"میرے بھائی تھانے دارا! ہم نے اکبال نہ کبھی کیا ہے نہ کریں گے اور یہ جوتے بازی بھی ہوتی ہی رہے گی۔ اگر کہو تو اس چھوکرے سے دو دو ہاتھ ہو جائیں۔ ہمارے تھانے دار بھی زندہ دل شخص تھا۔ اس کی بات سن کر ہنسا اور اسے کشتی لڑنے کی اجازت دے دی۔ کہاں تو مار کھا رہا تھا اور کہاں خم ٹھونک کر پہنچا پہلوان کے مقابل۔ کرتا اتار کر پرے پھینک دیا۔ تہمد سمیٹ کر باندھ لیا اور ایک فراٹے کے ساتھ ہاتھ سے ہاتھ چھوا کر دیا گردن پر جھانپٹ۔

مجمع میں سنسنی پیدا ہو گئی۔ لوگ سنبھل کر بیٹھ گئے۔ ادھر دونوں میں لگی جھپا جھپٹی

ہوئے۔

ڈاکو کا جوڑا بھی کھل گیا لیکن تھوڑے سے بال تھے۔ اس نے پرواہ نہیں کی۔ دیکھنے میں تو وہ یونہی گنوار کا لٹھ ہی معلوم ہوتا تھا لیکن کشتی کے اس نے وہ وہ ہاتھ دکھائے کہ حضرت پہلوان ہانپنے لگے۔ اب موقع تاڑ کر جو داؤ مارا ہے ڈاکو نے پہلوان کی ساری لاش اٹھا کر زمین پر پٹخ دی۔ اسے خوب خوب رگیدا اور بالآخر چت کر دیا۔

اس پر جو شور مچا ہے کہ بس چپ ہی بھلی "شاباش، شاباش" کے ڈونگرے برس گئے۔ لوگوں نے ڈاکو کو کندھوں پر اٹھا لیا اور اس کی پگڑی بطور جھنڈے کے ہوا میں لہرا دی۔ ڈھول پیٹ ڈالے۔ دو چار آدمی بھاگے بھاگے گئے اور گھی شکر سے بھری ہوئی ہانڈی لاکر ڈاکو کے ہاتھ میں تھما دی۔ ڈاکو سب کچھ کھڑے کھڑے ہضم کر گیا اور خالی ہانڈی برآمدے کے فرش پر دے ماری۔ مونچھیں پونچھ کر داروغہ جی کی طرف بڑھا اور اپنی گرد آلود ناک کو الٹے ہاتھ سے رگڑتا ہوا بولا۔

"لے بھائی تھانے دار! اب تم خواہ ایک مہینہ اور جوتے برسائے جاؤ ——— آپاں ٹس توں مس نہیں ہوناں"

بالا سنگھ کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

دھرم شالہ سے ہٹ کر اس کی نظر رہٹ پر جا پڑی رہٹ کے قریب کھڑے ہوئے بلند و بالا ٹنڈ منڈ درخت کو دیکھ کر اسے بہت تعجب ہوا۔ پہلے بھی اس کی یہی حالت تھی۔ سال بھر میں ایک سبز پتی تک اس پر دکھائی نہ دیتی تھی۔ اس کی ٹیڑھی میڑھی سوکھی شاخیں دُور دُور تک اِدھر اُدھر پھیلی ہوئی تھیں۔ تنے پر جا بجا انسانی آنکھوں کی سی گانٹھیں دکھائی دیا کرتی تھیں۔ وہ اس درخت سے بھی بخوبی واقف تھا۔

اس کا خیال تھا کہ وہ درخت کبھی کا گر چکا ہو گا۔ لیکن وہ جوں کا توں کھڑا تھا۔ چاندنی راتوں میں جب وہ آنکھ مچولی کھیلا کرتے تھے تو اس درخت کو وائی مانتے جس کسی کی باری ہوتی وہ دونوں ہاتھوں سے آنکھیں ڈھانپ کر درخت کے تنے سے لگ کر کھڑا ہو جاتا۔ باقی ساتھی اس دوران میں بھاگ کر ادھر اُدھر چھپ جاتے

بعض دھرم شالا کی پچھلی جانب، بعض رہٹ کی چرخی کے پیچھے، بعض چار دیواری کے اندر، اور بعض قریب کے کھیتوں میں دبک جاتے۔ اور جب وہ چلاتے آ جاؤ۔ تو پھر درخت کے قریب۔ کھڑا ہوا لڑکا ہاتھ آنکھوں سے ہٹا لیتا۔ ویسے انگلیوں کے بیچ میں سے تاڑتے رہتا کہ کون کہاں چھپا ہے معیوب نہ سمجھا جاتا تھا بشرطیکہ دوسروں کو اس بات کا علم نہ ہونے پائے ورنہ وہ سب اس کے سر ہو جاتے۔ 'چور' کو لڑکوں کی تلاش میں گدھے کی طرح ادھر ادھر جھانکتے دیکھ کر بعض لڑکوں کی ہنسی نکل جاتی اور ان کی کھی کھی کی آواز سے اسے معلوم ہو جاتا کہ وہ کس کس جگہ چھپے کھڑے ہیں۔ ان میں سے بعض تو اس قدر معصوم تھے کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ 'چور' کا دھیان ان کی طرف نہیں ہے۔ جب بھاگ کر داتی کو چھونے لگتے تو وہاں پہنچنے سے پہلے ہی ان کی ہنسی نکل جاتی اور اپنی اس کمزوری کے باعث پکڑے جاتے.....

پالا سنگھ کچھ دیر تک ان خیالات سے محظوظ ہوتا رہا۔ پھر وہ سوچنے لگا ممکن ہے اس سوکھے درخت کی طرح کئی بوڑھے بھی ابھی تک زندہ و سلامت ہوں۔

لمبے لمبے پٹوں والا ایک بوڑھا تو ابھی تک اسے یاد تھا۔ وہ خود ان دنوں بہت چھوٹا تھا۔ اس کی ماں اسے اپنے ہمراہ لے کر اس جگہ نہانے کے لیے آیا کرتی تھی۔ اسے یہ کہہ کر کہ لڑکے چار دیواری کے اندر عورتوں کے ساتھ نہیں نہایا کرتے بلکہ باہر مردوں میں نہاتے ہیں۔ خود چار دیواری کے اندر چلی جاتی۔ وہ نہانے سے کتراتا تھا چنانچہ کپڑے وپڑے اتار کر دھوپ میں کھڑا رہتا۔ اتنے میں وہ بوڑھا بھینس کو پانی پلانے کے لیے وہاں آتا۔ اس کے سر پر چھوٹی سی ڈھیلی ڈھالی پگڑی بندھی ہوتی تھی۔ کانوں کے پیچھے گدی سے نیچے تک لٹکے ہوئے پٹے۔ لبوں پر سے مونچھیں کٹی ہوتی۔ داڑھی بھی قینچی سے کتری ہوئی یا اللہ یا اللہ کا ورد کرتا رہتا تھا۔ اس پر نظر پڑتی تو بڑی شفقت سے بلاتا۔ 'پالی بیٹا ادھر آؤ...... بولو ہمارے بیٹے نہیں تم۔ ادھر آؤ ہمارے پاس......' لیکن وہ شرمایا کرتا۔ اسے بوڑھے کی سوکھی

سوکھی باہوں سے ڈر لگتا تھا۔ اس کی بانہوں کی پھولی پھولی رگیں کینچوؤں کی طرح نظر آتی تھیں۔ پھر بوڑھا اپنے کمزور دانتوں سے گنے کی ایک پوری چھیل کر اس کی طرف بڑھا دیتا۔ جسے وہ معمولی پش و پیچ کے بعد ہاتھ بڑھا کر لے لیتا۔ اس پر بوڑھا ہنسنے لگتا۔ اس کے منہ کے دانت بہت کم تعداد میں رہ گئے تھے۔ اس لیے اس کے منہ میں چوہے کے بل کی تاریکی دکھائی دیتی تھی۔ نہ معلوم اب وہ بوڑھا زندہ ہے یا مر گیا بچارا اب اگر وہ اپنے ننھے بالی کو دیکھے تو یقیناً بہت خوش ہو۔ اور دونوں آپس میں خوب دل کھول کر باتیں کریں۔ . . . .

. . . . جب اس کی ماں گیلی دھوتی بدن سے لپیٹے اندر سے جھانک کر اس کی طرف دیکھتی تو کہتی "کیوں رے ابھی نہایا نہیں" اور وہ بغلیں جھانکنے لگتا۔ اس کی ماں چپت دکھا دکھا کر دھمکاتی اور گھور گھور کر دیکھتی۔ مگر اتنا وہ بھی سمجھتا تھا کہ اس حالت میں وہ باہر آنے والی نہیں۔ آخر تنگ آ کر وہ اسے اندر چلے آنے کے لیے کہتی تو وہ انکار کر دیتا۔ "تم ماروگی" ماں سخت پریشان ہوتی اسے گھر جانے کی بھی جلدی ہوتی تھی۔ پھر وہ اس کے آگے ہاتھ جوڑنے لگتی نہیں، ہرگز نہیں ماروں گی۔ لیکن وہ کنوئیں کی منڈ پر پر ڈھیٹ بن کر بیٹھ جاتا۔ آخر ہزار خوشامدوں اور ایک پیسہ انعام کے وعدے کے بعد وہ اندر جاتا۔ . . . . ماں اس کا منہ چومتی . . . . "چھی چھی لو پھاطمہ بی بی دیکھو تو اس لڑکے کو شرم نہیں آتی۔ اتنا بڑا ہو گیا۔ اکل نام کو نہیں۔ . . . عورتوں میں ننگا کھڑا ہے۔ . . . چھی چھی، سر میں جوئیں۔ . . . . باگڑ و باگڑ د"

بچاری پھاطمہ بی بی نئی نویلی دلہن وہ کیا جواب دے بس ہنسے جاتی۔ لیکن موٹی بھدی ساہوکارن بھاری بھر کم کولھے ہلا کر کہتی "ہے بہن کل کا بچہ ہے تجھے ابھی سے شرم کی پڑی ہے" اچھی طبیعت تھی بچاری ساہوکارن کی۔ گیلی دھوتی نچوڑ کر کندھے پر ڈال لیتی اور اسے بازوؤں میں لے کر کہنے لگتی "کیوں رے تجھے شرم نہیں آتی . . . . جو عورتوں میں ننگ دھڑنگ گھس آیا ہے . . . . ارے تو لڑکا ہے تم کہ لڑکی؟" وہ خود کو اس کے گیلے بدن سے بچانے کے لئے پیچھے پیچھے ہٹتا لیکن وہ

آگے بڑھ بڑھ کر باتیں بنائے جاتی۔ کم عمر لڑکیاں کپڑے ڈنڈوں سے کوٹتے جاتیں اور خوب ہنستیں۔ ماں کہتی "دیکھ سرنی کو کیسی اچھی بیٹا ہے۔ کیسے ستھرے بال ہیں اس کے۔ دیکھ تو تیری طرح بہتی ہے اس کی ناک۔ کیسا گورا چٹا صاف ستھرا چہرہ ہے جیسے مکھن کا پیڑا!"

سرنوں یا سرنی جس کا اصل نام سرن کور تھا۔ اپنی عمر کی نسبت کہیں زیادہ سنجیدہ بن بن بیٹھتی۔ ہر کام بڑے اہتمام سے کرتی۔ خود کو بڑی دانا اور سگھڑ سمجھتی۔ وہ اس کی ماں کی منہ بولی بہن کی بچی تھی۔ جس قدر زیادہ ان دونوں کی ماؤں کی آپس میں بنتی تھی اتنی ہی ان دونوں کے بچوں کی آپس میں ٹھنتی تھی۔ اگر کبھی سرنی اکیلی اس کے ہاتھ آجاتی تو وہ بڑے اجڈپن سے اپنی گرد آلود بانہوں میں اسے جکڑ لیتا "مکھن کا پیڑا۔ مکھن کا پیڑا!" سرنی بڑی کراہت سے پیچھے کی طرف ہٹنے لگتی "ہٹ ہٹ گندہ چوہڑا کہیں کا!" لیکن اس کے دل پر دھتکار کا نفسیاتی ردِعمل کچھ بھی نہ ہوتا وہ سرنی کے سر کے بالوں کو مضبوطی سے پکڑ کر بڑی بے جگری سے اپنی طرف کھینچتا اور اس کے ہونٹ سرنی کے پھیکے پھیکے ٹھنڈے گال سے چھو جاتے اور جب وہ منہ پیچھے ہٹاتا تو اس کی بہتی ہوئی ناک سرنی کے گال پر تھپ جاتی اور ایک لمبی سی تار کھنچتی چلی آتی۔ وہ انتہائی کراہت سے زمین پر تھوکنے لگتی۔ کرتے کے دامن سے گال رگڑ رگڑ کر پونچھتی اور ایک ہاتھ چپت مارنے کے انداز سے اوپر کو اٹھاتے ہوئے کہتی "بدمعاش!"

اور اب؟

بالا سنگھ کی دوسری ٹانگ بھی تھک گئی تھی۔ اس نے سمادھ کی دیوار کے ساتھ پیٹھ جما کر دونوں ٹانگیں اچھی طرح اکڑا کر ڈھیلی چھوڑ دیں۔ تب وہ آگے کو جھک کر ٹانگوں کو سہلانے لگا۔ اس سے اسے کچھ راحت محسوس ہوئی۔ اس نے اپنے بازوؤں کے پٹھوں کو ٹٹولا، چھوٹی چھوٹی داڑھی پر ہاتھ پھیرا، انگلیوں کی ہلکی ٹھیسوں سے مونچھوں کا رخ اوپر کی طرف موڑ دیا۔ گردن کو چھو کر انگلیوں پر پھونک ماری۔ پھر انگلیاں دبا دبا کر ان کے کڑاکے نکالنے لگا۔ . . . . اب تو اس کی ناک نہیں بہتی تھی۔

وہ خود بخود ہنسنے لگا۔ اس نے کرتے کی آستینوں کو درست کیا اور اسے آگے پیچھے سے جھٹکے دے کر اس کے بل درست کیے۔ تہمد ڈھیلا کر کے اس کے دونوں سرے از سر نو چنے اور انھیں مضبوطی سے دونوں طرف اڑس لیا۔ دیر تک ہلا جلا کر تہمد کے گراؤ کو دیکھتا رہا۔ آگے پیچھے، دائیں بائیں سبھی طرف سے اس کا جائزہ لیا۔ کرتے سے صافی اتار کر نئے جوتوں کی گرد جھاڑی ٹخنوں کی میل پونچھی اور پھر منہ کا پسینہ بھی خوب رگڑ رگڑ کر صاف کیا۔ پگڑی کو دائیں بائیں گھما پھرا کر اور سامنے کی نکریں دے کر اسے ٹھیک ٹھاک کیا۔ پگڑی کے نیچے اوپر کے دونوں شملوں کی خبر بھی لی۔

وہ بڑے بھائی کے بچوں کے لیے جڑ دے ریوڑیاں اور سنگترے لیتا آیا تھا۔ ان میں سے کچھ سرالوں کے بھائی بہنوں کو بھی دیئے جا سکتے تھے۔ لیکن افسوس تو اس بات کا تھا کہ وہ سرالوں کے لیے کوئی چیز نہیں لایا تھا۔ یقیناً اس سے یہ بہت سخت غلطی سرزد ہوئی۔ اب تو بڑی ہو گئی ہو گی شریر۔ نہ معلوم اب کیا صورت نکالی ہو گی۔ کہیں شادی نہ ہو گئی ہو جاٹوں میں لڑکیوں کی شادی کے معاملے میں عجلت سے کام تو نہیں لیا جاتا۔ پھر بھی ممکن ہے کہ اس کی منگنی کہیں ہو چکی ہو۔ ماں اپنی چٹھیوں میں اور تو سب باتیں لکھواتی رہی صرف اس بات کا ذکر نہیں کیا بہرحال اسے چاہیے تھا کہ وہ سرنی کے لیے کوئی نہ کوئی چیز تو لے جاتا۔ خیر اب دو چار دن کے بعد جب وہ شہر میں جائے گا تو سرنی کے لیے اس کی پسند کے مطابق کوئی چیز لیتا آئے گا۔

دو تین مرتبہ اس نے بڑے اہتمام سے کھانس کر گلا صاف کیا۔ اور پھر لاٹھی سنبھالی اور ایک چھوٹی سی گٹھڑی بازو سے لٹکا کر وہ شتر مرغ کے سے لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا چل کھڑا ہوا۔ کھیتوں کے بیچوں بیچ سیدھی پگڈنڈی گاؤں کو جاتی تھی لیکن کپڑوں اور جوتوں کے خراب ہو جانے کے ڈر سے اس نے نہر کی پٹڑی پٹڑی چلنا مناسب سمجھا۔

اب دھوپ بالکل ہلکی ہو چکی تھی۔ نہر کے دونوں کناروں پر ببول کے درخت

ایستادہ تھے۔ ان کے زرد زرد بھر بھرے پھول اور کانٹے جھڑ کر زمین پر بکھر گئے تھے۔ وہ کانٹوں اور پھولوں کو جوتوں تلے روندتا ہوا بڑھ رہا تھا۔ وہ ان درختوں سے مانوس تھا۔ شاخوں میں سے باہر کو بہنے والی گوند دیکھ کر اسے یاد آیا کر وہ لوگ بچپن میں گوند نوچ نوچ کر کھایا کرتے تھے۔ گوند ان کے دانتوں اور مسوڑھوں سے چپک جاتی اور وہ اس کو چباتے وقت کتے کے پلّوں کی طرح جبڑے ہلایا کرتے تھے۔ کلکتے کی طرف اسے ببول کا پیڑ دیکھنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ نہ اس نے کبھی ببول کی داتون ہی کا استعمال کیا تھا۔ ایک مرتبہ جب اس کی ماں اس سے ملنے کے لیے کلکتے گئی تھی تو اپنے ہمراہ ببول کی داتونیں لیتی گئی تھی اور اسے ایک مرتبہ پھر پنجاب یاد آگیا تھا۔ لڑکپن میں وہ چھوٹی چھوٹی کلہاڑیاں ہاتھوں میں لیے داتونیں کاٹنے کے لیے دُور دُور تک نکل جاتے تھے۔ ایڑیاں اُٹھا اٹھا کر ببول کی نازک ٹہنیاں کاٹتے اور جب شاخیں نیچے گر جائیں تو چاقو سے ان کے کانٹوں کو صاف کرتے۔ یہ سارا کام بڑے پریم سے کرتے۔ ضرورت سے زیادہ وقت صرف کرتے۔ عمدہ عمدہ داتونوں کے چھوٹے چھوٹے گٹھے بنا کر انھیں باریک چھال سے باندھ لیتے۔

چلتے چلتے اسے اپنے سامنے لسوڑی کا ایک درخت نظر آیا۔ یہاں بھی وہ کئی مرتبہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ آچکا تھا۔ میٹھی میٹھی لسوڑیاں توڑ کر کھاتے۔ جب میلی چادروں کی جھولیاں ان کے گلے میں ڈال کر انھیں دَب (سوکھی گھاس) تلے ڈھیر کر دیتے۔ تھک جانے پر وہ درخت تلے بیٹھ کر سستانے لگتے۔ اِردگرد کے کئی پیڑ اُگے ہوئے تھے وہ ان کے پتوں پر بیٹھے ہوئے سبز رنگ کے ٹڈوں کو پکڑ لیتے اور پھر ان کو آپس میں لڑاتے۔ جب کبھی انھیں نہانا ہوتا تو بھی وہ اسی جگہ آیا کرتے تھے۔

ان دنوں کی یاد تازہ ہو جانے پر اس کے دل میں ایک مرتبہ پھر نہانے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اب پرانے لنگوٹیا یار دوستوں کی دھما چوکڑی کہاں۔ تاہم وہ اکیلا بھی کافی لطف لے سکتا تھا۔

یہ سوچ کر اُس نے لاٹھی درخت کے ساتھ ٹکا کر کھڑی کر دی اور اس کے قریب ہی گٹھڑی بھی دھر دی اور کپڑے اتارنے لگا۔ کبھی شریعت کے مطابق اس نے کچھ تو کبھی پہنی ہی نہیں تھی۔ چنانچہ تہمد کے سوا سب کپڑے اتار دینے کے بعد اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کسی کو نزدیک نہ پا کر اس نے پھرتی سے تہمد اتار پھینکا اور غڑاپ سے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ وہ اک دم تہہ تک بیٹھتا ہی چلا گیا۔

نرم نرم ریت جو تہہ میں بیٹھی ہوئی تھی، اس کے بوجھ سے دب کر ادھر اُدھر پھسلنے لگی۔ اس کی نرمی اور پھسلن سے اسے جسم کے مختلف اعضا میں عجیب گدگدی کا احساس ہوا۔ یہ گدگدی بڑی لذت انگیز تھی۔ اس نے گیلی ریت ہاتھوں میں لے کر سارے بدن پر مل دی۔ پھر خوب مل مل کر نہایا۔ اُس نے اپنے گرم گرم کانوں کو خاص طور پر پانی سے تر کیا۔ پیٹ کو سہلاتا رہا۔ پھر بغلوں کو ملتے وقت اسے ایک پرانی بات یاد آ گئی۔ وہ گیلی بغل میں ہاتھ رکھ کر اوپر سے زور سے بازو دباتے اور پھر موٹر کے ہارن کی سی آواز سن کر خوب چہچہاتے۔ لیکن وہ بچپن تھا۔ اب اُسے ایسا نہ کرنا چاہئے تھا۔ لیکن اُس کا دل اتنا مسرور تھا کہ وہ اپنے آپ کو ایسا کرنے سے باز نہ رکھ سکا۔

چہرہ پانی کے اندر ڈبو کر وہ اندر ہی اندر سانس چھوڑ کر پانی کی سطح پر بلبلے اُبھارنے لگا۔ بار بار وہ دفعتاً چہرہ پانی میں سے باہر نکالتا۔ سانس لے کر پھر مُنہ ڈبو کر سر زور زور سے دائیں بائیں طرف ہلاتا۔ اس کے تکان زدہ جسم کو ٹھنڈے پانی میں بہت راحت محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ سر بھی اندر ڈبو دے لیکن بالوں کے بھیگ جانے کے خوف سے وہ ایسا کرنے سے باز رہا۔ اس کے بال بھی کچھ کم نہ تھے۔ اس کا جوڑا دو ہاتھوں میں بھی بمشکل سما سکتا تھا... وہ

ایک بڑے مگرمچھ کی طرح دونوں ہاتھ ریت پر ٹیکے آہستہ آہستہ کبھی آگے اور کبھی پیچھے کی طرف ہٹ رہا تھا۔ تیرنے کے لیے اس قدر اتھلا پانی بیکار تھا۔ وہ بچپن میں اسی طرح ہاتھ ٹیک کر بیٹھنے ہی کو تیرنا سمجھتے تھے۔

سورج بالکل غروب ہو گیا۔ گاؤں کے مکانوں سے دھواں اُٹھ اُٹھ کر فضا

میں بھیلنے لگا۔

پالا سنگھ نہر سے باہر نکل آیا۔ اس نے ہاتھ پاؤں جھٹک جھٹک کر بدن سکھایا۔ کپڑے پہن کر پگڑی باندھنے لگا۔ ابھی آخری سر اٹھونسا ہی تھا کہ اسے احساس ہوا کہ کوئی شخص اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ نظر اٹھائی۔ دیکھا کہ دو ہٹے کٹے مرد ہاتھوں میں لاٹھیاں لیے کھڑے ہیں اور ان کی نظریں اس پر جمی ہوئی ہیں۔ وہ دونوں پُرمعنی لہجے میں کھانسنے لگے۔ اسے تعجب تو ہوا لیکن اس نے بظاہر کچھ توجہ نہ دیتے ہوئے اپنی لاٹھی کی طرف قدم بڑھایا۔ انھوں نے اس سے بھی پہلے بڑھ کر لاٹھی اپنے قابو میں کر لی۔ اس کی آنکھیں دوبارہ ان کی آنکھوں سے ملیں۔ ان میں سے ایک نے بڑی سنجیدگی سے کہا ''بھائی تمھاری جیب میں جو کچھ بھی ہو نکال کر رکھ دو۔''

''کیا کہا؟'' پالا سنگھ کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

اس آدمی نے کچھ برہم ہو کر پہلو بدلا ''جو پیسہ دھیلا تمھاری جیب میں ہو نکال کر دھر دو۔''

پالا سنگھ نے آتش بار نظروں سے سر سے پاؤں تک ان کا جائزہ لیا۔ اکھڑ مورتیں، مجرمانہ تیور ـــــ پھر اس نے اپنے اگلے دانتوں کی دراڑیں سے لعاب دہن کی پچکاری چھوڑ دی ''کیوں؟''

''اس لیے'' اور اس کے ساتھ ہی پیچھے سے ایک بھاری ہاتھ اس کی کنپٹی پر پڑا۔ اس کی پگڑی پرے جا گری۔ وہ لڑکھڑا گیا۔ پھر اس نے دیکھا، کہ اسی اثنا میں ایک تیسرے بھینگے آدمی نے پیچھے سے اس کے دونوں بازوؤں کو کہنیوں سے جکڑ کر اسے لاچار کر دیا ہے اور سامنے کے دونوں نوجوان لٹھ اٹھائے گویا کوار کرنے پر آمادہ ہیں۔

اس نے جدوجہد نہیں کی۔ سامنے والے دونوں آدمیوں نے اس کی تلاشی لی۔ خوش قسمتی سے اس نے اپنا سارا روپیہ بذریعہ منی آرڈر ماں کو بھیج دیا تھا۔ اس وقت اس کی جیب میں تین روپے سوا سات آنے برآمد ہوئے۔ وہ اس

دوران میں مسکراتا رہا۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ اسے لینے کے دینے پڑے۔

تلاشی لے کر وہ لوگ تو اسے چھوڑ کر پیچھے ہٹ گئے۔ لیکن وہ خود ڈھیٹ پن سے اپنی جگہ پر اینٹھا کھڑا رہا۔ ہاتھ کی ضرب سے اس کی بائیں آنکھ کے گوشے کے نیچے رخسار پر سرخ رنگ کا ابھار پیدا ہو گیا تھا۔ اس کا جوڑا ڈھیلا ہو گیا تھا۔ کچھ بال پریشان ہو گئے تھے۔ اس کی صورت کسی حد تک مضحکہ خیز ہو رہی تھی۔ اس نے چار قدم پرے گری ہوئی پگڑی کی طرف دیکھا اور پھر ذرا تحکمانہ لہجے میں بولا۔

"میری پگڑی اٹھا دو۔"

وہ تینوں یہ بات سن کر ہنس پڑے۔ ان میں سے ایک نے لاٹھی کے سرے سے پگڑی اس کی طرف اچھال دی۔

پالا سنگھ نے پگڑی جھاڑ کر بغل میں دبالی۔ پھر دیکھا کہ قمیض کے دامن پر بھی مٹی لگ گئی ہے۔ اس نے کرتا اتارا اور میلا جتنا پانی میں دھو کر نچوڑا۔

اس اثنا میں وہ لوگ اس کے جسم کی خوبصورت بناوٹ دیکھ دیکھ کر جی ہی جی میں اسے سراہتے رہے دبا ہوا پیٹ، چھاج کی مانند پھیلا ہوا سینہ اور بھوکے بھیڑیے کی طرح نمایاں پسلیاں۔

کرتا پہن کر اس نے ایک مرتبہ پھر بڑے اہتمام سے پگڑی باندھی اور شملے درست کیے۔

وہ تینوں شخص دل ہی دل میں تعجب کر رہے تھے کہ یہ نوجوان جس کے مضبوط جسم میں نسیں اور پٹھے یوں دکھائی دیتے تھے۔ جیسے پتھر میں لوہے کے تار کھینچ دئے گئے ہوں، کیوں اس قدر حلیم ثابت ہوا۔ . . . . . خیر انھوں نے اس کی لاٹھی اس کی جانب پھینکتے ہوئے کہا: "نوجوان! سنبھالو اپنا لٹھ۔"

پالا سنگھ نے لاٹھی ہاتھ میں دبوچتے ہوئے کہا: "لیکن بھئی آپ لوگ کہاں کو چل دئے۔"

تینوں نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ پالا سنگھ تلے تلے قدم بڑھاتا ہوا

ان کے سامنے پہنچا، اپنے لمبے جسم کو سرو کی طرح سیدھا کیا اور ٹانگیں پھیلا کر سپاہی کی طرح ڈٹ کر کھڑا ہوگیا۔ اس وقت اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور چھوٹی چھوٹی تنی ہوئی مونچھیں متحرک تھیں۔ لمحہ بھر اس نے ان کی طرف اس انداز سے دیکھا جیسے وہ اس کی حقیر رعایا ہوں اور پھر بزرگانہ انداز سے بولا:

"بھائیو! جو پیسہ دھیلا تمھاری جیب میں ہو نکال کر میرے حوالے کر دو۔"

بھینگے کے منہ سے بے اختیار نکل گیا "کیوں؟"

اس سوال کے جواب میں پالا سنگھ نے ایک خرانٹ جرائم پیشہ استاد کی طرح اُلٹے ہاتھ کی ضرب اس کی کنپٹی پر رسید کی۔ اس کا سر گھوما تو ایک ہاتھ اس کی گدی پر دیا۔ وہ سرنگوں ہوگیا اور پھر اس کی ایک ہی بے رحم ٹھوکر سے سیدھا نہر کے اندر جا گرا۔ یہ سب کچھ آنکھ جھپکتے میں ہوگیا۔ بھینگے سے فارغ ہو کر وہ اس کے دونوں ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ جو پاگل کتوں کی طرح اس پر جھپٹ پڑے تھے۔ پالا سنگھ سرک لگا کر پہلے تو ان سے پرے ہوگیا۔ وہ آگے بڑھ بڑھ کر لاٹھیاں برساتے گئے اور وہ مسکرا مسکرا کر روکتا چلا گیا اور قدم بقدم پیچھے ہٹتا گیا جب اُس نے جانا کہ حریفوں کی باہوں میں تھکاوٹ کے آثار نظر آنے لگے ہیں تو پھر وہ تیر کی سی تیزی کے ساتھ آگے بڑھا اور اس کے ہاتھ میں لاٹھی یوں گھومنے لگی جیسے تنکا پانی کے بھنور میں گھومتا ہے ــــــ چند لمحوں بعد اس نے لاٹھیاں ان کے ہاتھوں سے رکھوا لیں۔

اب وہ تینوں مجبور اور لاچار اس کے سامنے کھڑے تھے۔ وہ چاہتے تھے۔ وہ اپنے روپے لے کر ان کا پیچھا چھوڑ دے لیکن وہ کہاں ماننے والا تھا۔ لگ بھگ چھبیس روپے ہاتھ لگے۔ جب وہ روپے گننے لگا۔ تو ان لوگوں نے کھل جانا مناسب سمجھا۔ لیکن اس نے کنکھیوں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے غرا کر کہا۔
"اگر تم نے بھاگنے کی کوشش کی تو دو کو تو میں رکھ لوں گا۔ یہ بھاگنے واگنے کا خیال دل سے نکال دو۔"

بیچارے اور زیادہ گھبرائے۔ سمجھے کہ اب ظالم نے کپڑے بھی اتروا لیئے۔

پالا سنگھ نے اپنے کپڑوں کو درست کیا۔ پانی سے نرم صافی سے اپنی چھلی ہوئی کنپٹی صاف کی۔ کوئی خاص زخم نہ آیا تھا۔ پگڑی وگڑی ٹھیک کرنے کے بعد اس نے ان لٹیروں پر نگاہ ڈالی۔

تھوڑی دیر کے تامل کے بعد اس نے زمین پر تھوکا اور ان روپوں میں سے تین روپے سوا سات آنے نکال کر باقی بھینگے کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

یہ دیکھ کر وہ تینوں دم بخود رہ گئے۔

پالا سنگھ نے کہا "بیٹا رتنے! تم میرے لنگوٹیے یار ہو۔ تم سے روپیہ چھیننا ذرا۔ ۔ ۔ بھدی بات ہے۔"

اب تو تینوں کی صورتیں سوالیہ نشان بن کر رہ گئیں۔

پالا سنگھ نے تینوں کی طرف باری باری دیکھا۔ اور پھر اپنی لاٹھی پر جھک کر بولا "میں ستا سنگھ کا بیٹا پالا سنگھ ہوں!"

ان سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ رتنا دیکھ رہا تھا پالا سنگھ کی طرف لیکن پتلیاں ایسے زاویے پر تھیں کہ جیسے وہ ببول کی سب سے اوپر والی کونپل کی طرف دیکھ رہا ہو۔ لمحہ بھر تک تو وہ لوگ بول ہی نہ سکے اور پھر دفعتاً چلا اٹھے۔

"اوئے پالی! تیری ماں کو لے جائیں چور۔ ۔ ۔ ۔ اوئے آ گیا تو۔ ۔ ۔ ۔ اوئے تو ؟ کتے کے پتے۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اس کے بعد بشنا کشنا اور رتنا اس سے بغلگیر ہونے لگے۔ پھر گالیوں کی بوچھار اور دھپ پر دھپ "اوئے کمینے چور! حرامی کے بچے!!"

جب بچپن کے دوستوں کی آپس میں ٹھیک ٹھاک ہو چکی تو وہ اس کے بازوؤں میں بازو ڈالے اپنے رہٹ کی طرف لے چلے۔ مارے جوش اور خوشی کے ان کے منہ سے بات مشکل سے نکلتی تھی۔

"حرامزادو! تم لوگوں نے آتے ہی میری تواضع تو خوب کی۔"

یہ کہہ کر پالا سنگھ نے دانتوں کی دراڑوں میں سے تھوک کی پچکاری چھوڑی۔۔

. . . . . اور جھاگ کے دو تین ننھے ننھے بلبلے اس کی داڑھی پر چمکنے لگے۔
رہٹ کے قریب پہنچ کر ان میں سے دو قریب پڑے ہوئے درخت کے تنے پر بیٹھ گئے۔

بشن سنگھ بلند آواز میں پوچھنے لگا "یار پالی! تو نے ہمیں پہچانا کیسے۔ بھئی ہمیں تو جب تک تو نے خود نہیں بتایا۔ پتہ ہی نہیں چلا کر تو ہے کون؟"

پالا سنگھ نے قہقہہ لگایا "کھو پھر مانتے ہو نا ہمیں۔ . . . . . . دراصل میں نے رتنے کو پہچانا اس کے بھینگے پن سے۔ . . . . ." یہ کہہ کر بالا سنگھ نے اخلاق اور آداب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے رتنے کے دیکھنے کے انداز کی بھونڈی نقل اتاری "جب میں نے اس بجھان چڑو کو اس انداز سے دیکھتے پایا تو سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو یہ رتنا ہی ہے۔ پھر طوطے کی چونچ کی سی چوٹی ہوا میں لہراتی دکھائی دی۔ تو مجھے اس بات کا بالکل ہی یقین ہو گیا . . . . . اس کے بعد میں نے غور کرنے پر سب کو پہچان لیا۔"

اس پر سب لوگ قہقہے لگانے لگے اور رتنے کا مذاق اڑانے لگے۔ شام کی خاموشی میں پالا سنگھ نے ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی وہی گارے اور مٹی کا بنا ہوا طویلہ جس کے دکھن کی طرف اب ایک نیچی چار دیواری بڑھا دی گئی تھی۔ مویشیوں کو چارہ کھلانے کے لیے وہی کھُرلیاں۔ طویلے کے ایک گوشے میں دو بیل اور پچھالیاں ٹکی ہوتی تھیں۔ اس لئے رہٹ چل نہیں رہا تھا۔ دونوں بیل ایک دوسرے کی طرف دیکھ دیکھ کر سینگ ہلا رہے تھے۔ کتنی ہی مرتبہ وہ یہاں آ چکے تھے۔ رہٹ پر چھائے ہوئے دونوں پھلاہ کے درختوں سے وہ بہت مانوس تھا۔ ان کی گھنی ٹھنڈی چھاؤں کے نیچے چارپائی ڈال کر سونے کا کتنا لطف آیا کرتا تھا۔

پالا سنگھ کو خیالات میں مگن دیکھ کر بشن سنگھ نے اس کی پیٹھ پر دھول جماتے ہوئے پوچھا "یار کیا سوچ رہے ہو؟"

"پُرانی باتیں یاد کر رہا ہوں۔ اتنے دنوں پردیس میں رہا۔ اب جو اپنے وطن

یں واپس آیا ہوں تو یوں محسوس کرتا ہوں جیسے یہاں کی ہر چیز سے میرا نامعلوم سا تعلق ہے۔ لگتے ہیں اس قدر طویل عرصے تک رہنے کے باوجود اس جگہ وہ اپنے پن کا احساس نہ ہو سکا۔ ۔ ۔"

کشن سنگھ نے کہا: "یار، کیا خوب جوان ہو۔ ہم نے تم پر حملہ کرنے سے پہلے تاڑا تو اندازہ لگایا کہ صورت سے خرانٹ اور ڈیل ڈول سے طاقت ور جوان معلوم ہوتا ہے۔ اس پر قابو پانا اتنا آسان نہیں ہوگا۔ چنانچہ اسی لئے ہم نے رتنے کو تمہارے پیچھے سے ہو کر حملہ کرنے کے لیے بھیج دیا تھا۔" یہ کہہ کر کشنا ہنسنے لگا اور پھر رتنے کی طرف مخاطب ہو کر بولا: "کہو یار زیادہ چوٹ تو نہیں آئی نا!"

رتنے نے جبڑے سہلاتے ہوئے منہ پھاڑا: "اُف یار! زیادہ کھولوں تو سخت درد محسوس ہوتا ہے۔"

اس پر پالا سنگھ نے فلک شگاف قہقہہ لگایا: "بھئی آخر رتنا میرا پٹھا ہے نا!" یہ کہہ کر وہ بیلن سے اٹھ کر رتنے کی بغل میں جا بیٹھا۔ اس کے رخسار پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا: "دیکھو بیٹا اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ تم نے خود ہی پنگا لیا تھا!"

سب لوگ ہنسنے لگے۔ بنتا کہنے لگا: "یار آج سے پہلے تم ایسے شخص سے ہماری ٹکر نہ ہوئی تھی۔"

"تو کیا یہی تم لوگوں کا پیشہ ہے؟" پالا سنگھ دل ہی دل میں ہم پیشہ پا کر خوش ہو رہا تھا۔

"نہیں پیشہ تو نہیں ۔ ۔ ۔ لیکن تم جانتے ہی ہو یہ جگہ سنسان ہے کوئی شکار آن پھنسے تو ہم اسے چھوڑتے بھی نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ کبھی مٹھی بھی خاصی گرم ہو جاتی ہے۔ ورنہ اتنا فائدہ تو ضرور ہو جاتا ہے کہ ہاتھ صاف رہتا ہے۔"

کشنا بولا: "لیکن بھئی تم ایسے آدمی سے پالا نہیں پڑا تھا۔ ہم یہ بات مانتے ہیں کہ تم واقعی جی بھر کر جوان ہو لیکن معلوم ہوتا ہے کہ تم بھی اسی میدان کے پرانے شہسوار ہو۔ ہم اپنے آپ کو پرانے کھلاڑی سمجھتے تھے۔ مانا کہ ہم طاقت میں تمہاری برابری نہیں کر سکتے۔ لیکن کچھ ایسے ہیٹے بھی تو نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ پھر بھلا تم

نے چٹکی بھر میں ہمیں نیچا کیو نکر دکھایا۔"

پالا سنگھ جواب میں مسکرایا۔"ابھی بچے ہو، عقل کے کچے ہو۔ یہ سینہ کے راز ہیں۔ رفتہ رفتہ تم پر ظاہر کر دیئے جائیں گے۔ . . . . بھئی اب مجھے گاؤں کا کچھ حال بتاؤ۔ پُرانے ساتھیوں میں کون زندہ ہے اور کون مر چکا۔ جوانوں کا کیا حال ہے۔ ہمارے زمانے میں تو اچھے اچھے جوان موجود تھے۔ ان میں سے کون کون قائم ہے۔ لنگوٹ کا سچا بھی ہے کوئی یا سب ـــ"

بشنے نے گلا صاف کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔"پہلے تو پُرانے جوانوں کا حال سُنو کہ مجھیل جو کلائی پکڑنے اور مگدر ہلانے میں استاد تھا۔ اس کا بُرا حال ہو گیا ہے۔ بچارے کو گرمی ہو گئی تھی۔ سارے بدن پر پھوڑے نکل آئے تھے بہت علاج معالجے کے بعد اب چلنے پھرنے کے قابل ہوا ہے۔ نہ کلائی پکڑتا ہے نہ مگدر ہلاتا ہے۔ اب اس کی جگہ جورا سنگھ نے لے لی ہے۔ وہ تو شہروں میں بھی جاتا ہے۔ اس کی لاش مجھیل سے بھی بھاری ہے۔ اس نے اپنا خاص مگدر بنوایا ہے۔ جو پانچ من پکے سے بھی کچھ اوپر وزنی ہے۔ سو ہاگا اٹھانے میں بھی وہ بڑھا ہوا ہے۔ شاید تمھیں یاد ہو سونچی کھیلنے میں فتح سنگھ کا ہمسر کوئی نہیں تھا لیکن اب نواب دین اس سے بھی تیز نکلا ہے۔ نواب ابھی بھرپور جوانی میں داخل نہیں ہوا۔ اس کے کس بل کے کیا کہنے۔ ان دونوں کی جوڑی جس کھیل میں شامل ہو جائے بس مزا آ جاتا ہے۔ بھیج سنگھ نے ڈاکے ڈالنے بھی شروع کر دیئے ہیں۔ نواب نیک اور دین دار نوجوان ہے۔ باہگورو اُسے سب عیبوں سے بچائے رکھے بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ نواب ان دو تین نوجوانوں میں سے ہے جو آئندہ گاؤں کی ناک اونچی رکھیں گے۔ اور بھئی پھوجو لٹھ باز اب تک ویسا ہی طاقتور ہے۔ آج کل لڑکیوں کی خرید و فروخت کا کام کرتا ہے۔ آنکھوں سے نہیں دیکھا کانوں سے سُنا ہے۔ ان کے علاوہ بیجا سنگھ، پیارا سنگھ، گوراں دتہ اور ہیرا اچھے جوان ہیں۔ دیگر تم جانتے ہی ہو جپ جاپ، ہل چلانے، بچے پیدا کرنے اور باہگورو باہگورو جپنے والے تو سینکڑوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ . . . . اور باقی رہا جوان سنگھ

سو تم جانتے ہی ہو سدا کا عیبی۔ ۔ ۔ ۔ آج کل اسے گورو کا درجہ حاصل ہے؛"

یہ کہہ کر بشنا چپ ہو گیا۔ لیکن پالا سنگھ لڑکیوں خصوصاً سرتوں کے بارے میں کچھ سننا چاہتا تھا۔ کشنے نے پگڑی کے اندر ساتھ ڈال کر کھجاتے ہوئے کہا" ہاں بھئی بشنا بھی خاصا جوان سمجھا جاتا ہے۔ ۔ ۔ ۔"

پالا سنگھ سے پوچھے بنا نہ رہا گیا" لڑکیوں کے بارے میں بھی کہو۔ کوئی ہے۔ منہ ماتھے کی۔ ۔ ۔ ۔ یا بس ۔"

"بھئی یہ تو رتنے سے پوچھو۔ یہی گوپیوں کے کنھیا ہیں۔ ۔ ۔ ۔"

رتنے نے آڑی ترچھی نظروں سے کشنے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"سالے! خود بال برہمچاری بنتے ہو۔ دن رات رہٹ کے چکر لگاتے ہو۔ پر خیر! ہمیں بتائے دیتے ہیں۔ اس میں شرمانے کی بات ہی کیا ہے؛" پھر اس نے پالا سنگھ کی طرف دیکھا" سنو باگو سنگھ جی! یوں تو پریما، آشاں، رتنی بیگماں ایک سے ایک بڑھ کر موجود ہیں، لیکن متوالی اور چنچل سرتوں کی بات اب کیا کہیں اور کیوں کر کہیں۔ ۔ ۔"

پالا سنگھ کا دل اچھل کر حلق میں آن رہا۔

"لیکن بے چاری چپ چاپ رہتی ہے۔ یوں ہے تو ہنسوڑ اور چنچل لیکن اس کے ظالم بھائی اور ماں باپ اس پر پابندیاں لگا کر رکھتے ہیں۔ بس اسے ہتھے چڑھانا آسان نہیں؛"

بشنے نے چلا کر کہا" ابے بک بک بند کر۔ بیٹا! کسی دن اس کے بھائیوں کے ہاتھوں بے طرح پٹو گے۔ جب بھی اس کا ذکر آتا ہے بکنے لگتے ہو۔"

پالا سنگھ کے من میں لڈو پھوٹنے لگے۔ ان تینوں نے کھیتوں کو نہر کا پانی لگا رکھا تھا۔ اس لیے ان کا وہاں رکنا ضروری تھا۔ لیکن پالا سنگھ لاٹھی پہ دباؤ ڈال کر تاڑ کے پیڑ کی طرح سیدھا کھڑا ہو گیا۔

اسے دوستوں سے بڑے جھمیلے کے بعد چھٹکارا ملا۔ وہ ایک بار پھر سے بگولے کی سی تیزی سے گاؤں کی جانب چل کھڑا ہوا۔

۲

پالا سنگھ کے گاؤں کا نام تھا ڈنگا۔ پنجابی زبان میں ڈنگا سے مراد ہے ٹیڑھا۔
اس گاؤں کے نام کی وجہ تسمیہ کا کسی کو کوئی علم نہیں۔ بعض کہتے تھے کہ چونکہ یہاں کے لوگ اکثر قانون کی خلاف ورزی کرتے تھے اور حکومت انتہائی کوشش کے باوجود ان میں اصلاح نہیں کر سکی۔ اس گاؤں کے ترچھے بانکے نوجوانوں نے بیدوں اور تیل میں بھیگے ہوئے جوتوں کی ماریں کھائیں۔ کئی کئی برس کی طویل قیدیں بھگتیں، پھانسی کی رسیوں سے لٹکے۔ لیکن پھر بھی ان کے پائے استقلال میں لغزش پیدا نہیں ہوئی۔ اور اب تک اگر کسی نوجوان کے اس قسم کے کارنامے کا ذکر کر کے کوئی اجڈ جاٹ اپنی لمبی داڑھی جھٹکا کر کہتا "شابا اوئے ڈنگا ڈنگا ای رہیا"، یعنی ٹیڑھا ٹیڑھا ہی رہا، سیدھا نہ ہو سکا۔ بعض کہتے تھے کہ ڈنگا نام کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ اسے بسانے والے کا نام ڈنگا سنگھ تھا۔ لیکن اپنے رویے کے لحاظ سے وہ بڑا نیک شخص تھا۔ گورو گھر کا سیوک تھا گوربانی کا پاٹھ بڑے پریم سے کرتا تھا لیکن بہت کم لوگ اس بات پر یقین رکھتے تھے۔ کیونکہ اس طرح ان کے مقصد میں فرق پیدا ہوتا تھا۔ کہتے "ارے بھائی! یہ تو گوردوارے کے بھائیوں (گرنتھیوں یعنی پجاریوں) کی اڑائی ہوئی باتیں ہیں۔ بھلا کہاں ڈنگا سنگھ اور کہاں یہ نیکیاں اور پارسائیاں۔ اجی ڈنگا سنگھ وہ شخص تھا جس نے فرنگی کی حکومت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ پہلے پہل جب فرنگیوں نے دھوکے سے سکھوں کو لڑائی میں ہرا دیا۔ شیر پنجاب مہاراجہ رنجیت سنگھ سے کئے ہوئے وعدوں سے پھر گئے

اور سارے پنجاب پر اپنا قبضہ جما لیا تو سردار ڈنگا سنگھ نے یہ بات تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ پنجاب پر سکھوں کی بجائے پھرنگی کی حکومت قائم ہو گئی ہے۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ یہاں اب بھی سکھ کا قانون چلے گا۔ میں نہیں جانتا پھرنگی کا قانون کیا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے قول کی صداقت ثابت کرنے کے لیے ایک ٹیلے پر ڈیرا جما دیا اور آنے جانے والے مسافروں اور سوداگروں سے اس راستے سے گزرنے والے مال سے لدے ہوئے ہر چھکڑے، اُونٹ، گدھے اور گھوڑے وغیرہ پر اپنا لگایا ہوا محصول وصول کیا۔ . . . لوگوں نے بہت واویلا کیا۔ پھرنگی کے دربار میں دہائی دی۔ تو پھرنگی نے اپنے آدمی ڈنگا سنگھ کا مجاج دُرست کرنے کے لیے بھیجے۔ ڈنگا سنگھ بھی بڑا گرانڈیل انسان تھا اور پھر بچے بادشاہ دسم گورو گوبند سنگھ جی مہاراج نے جو پھرمایا ہے کہ

سوا لاکھ سنگ ایک لڑاؤں ۔۔۔ تبھے گوبند سنگھ نام دھراؤں

ڈنگا سنگھ جی نے اسٹے انہی کے مجاج ٹھکانے لگا دیے اور وہ ایسے بگٹٹ بھاگے کہ پیچھے مُڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ اس پر پھرنگی کو بڑا طیش آیا اُس نے اور زیادہ سپاہی (سپاہی) بھیجے۔ ادھر ڈنگا سنگھ نے بھی کئی نہنگ سکھوں کو جمع کر لیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پھرنگی کے سپاہی مقابلہ کئے بغیر ہی بھاگ کھڑے ہوئے۔ کسی نے پھرنگی سرکار کو سمجھایا کہ یُونہی سوتے شیروں کو جگا کر پھر سے انھیں مت للکارو۔ چنانچہ پھرنگی نے آئندہ کے لیے کان پکڑ لیے اور جو کوئی شکایت کرنے کے لیے جاتا تو اسے یہی مشورہ دیا جاتا کہ یا تو ڈنگا سنگھ کو محصول دے دیا کرو۔ یا پھر اس راستے سے گزرنا ہی ترک کر دو "!

خیر حقیقت جو کچھ بھی ہو۔ اس میں شبہ نہیں تھا کہ یہاں کے لوگوں کے مزاج میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ کیا تعجب یہ داستان صداقت سے یکسر خالی نہ ہو۔ کیونکہ اب بھی انگریزی سرکار نے ڈنگا کے قریب دو مرتبہ ریلوے اسٹیشن قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس بات کا ڈھنڈورہ بھی پیٹا گیا اور یہ بھی کہا گیا کہ ارد گرد کے دیہات کے لوگوں کو بہت سی آسانیاں حاصل ہو جائیں گی لیکن ڈنگا کے جوانوں میں اتنا صبر

کہاں، ایک مرتبہ تو ٹکٹ بابو کی لاش ٹیلیفون کے کھمبے کے ساتھ لٹکتی ہوئی پائی گئی۔ اس کے منہ میں لال جھنڈی ٹھنسی ہوئی تھی اور باچھوں پر خون جم کر رہ گیا تھا۔ چنانچہ اسٹیشن توڑ دیا گیا۔ پھر چند برس بعد دیگر گاؤں کے لوگوں کی عرضداشتیں پہنچیں تو دوبارہ اسٹیشن قائم کیا گیا اب کے وہاں ایک کانسٹیبل اور ایک اسسٹنٹ بھی مقرر کر دیا گیا۔ لیکن دو ہفتے بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ ایک روز دیکھا گیا کہ اسٹیشن پر ان تینوں میں سے ایک شخص بھی موجود نہیں۔ تلاش کرنے پر سپاہی کی لاش اسٹیشن کی دو کمروں پر مشتمل عمارت کی پچھلی طرف دیوار کے سہارے ٹکی ہوئی ملی۔ سپاہی کا ہاتھ اس انداز سے اٹھا کر اسٹول پر رکھ دیا گیا تھا جیسے وہ سامنے کی طرف اشارہ کر رہا ہو۔ اسی رخ پر کچھ دور جانے کے بعد کھیتوں میں اسسٹنٹ کی لاش بٹھا دی گئی تھی۔ وہ بھی ہاتھ سے آگے کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ آگے جا کر جوہڑ میں بڑے بابو کی لاش پانی پی رہی تھی اور زمین پر گورمکھی حروف میں لکھا تھا:

اِتھے ٹیشن نہ بنا پھرنگیا
لنڈن دی کرسی ہل جاؤ گی

یعنی اے فرنگی اس جگہ اسٹیشن نہ بنا کیونکہ اس طرح لنڈن کا سرکاری تخت ہل جائے گا۔

پہلی بار توڑ نگا کے چند نوجوانوں نے اسٹیشن کو محض لوٹنے کے خیال سے بابو کو قتل کیا تھا اور دوسری مرتبہ محض ضد کی وجہ سے۔ اس اجڈپن کی منطق بس یہی تھی کہ جب ایک مرتبہ ڈنگا والوں نے طے کر لیا ہے کہ یہاں اسٹیشن قائم نہیں ہونے دیں گے تو اب خواہ زمین ادھر سے اُدھر ہو جائے۔ اس عہد کو پورا کیا جائے گا۔ اس بے رحمانہ قتل و خون کی بڑی تندہی سے تفتیش کی گئی۔ چند بدنام بدمعاشوں کو بری طرح مارا پیٹا گیا۔ لیکن کافی ثبوت نہ ملنے پر ہائی کورٹ نے ملزموں کی اپیل منظور کر کے انھیں بری کر دیا۔ اس کے بعد وہاں جانے پر کوئی بابو رضامند نہ ہوتا تھا۔ چنانچہ پھر اسٹیشن قائم کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ یہ ڈنگا والوں کی بڑی بھاری فتح سمجھی گئی۔ جرائم پیشہ بوڑھوں کی آنکھوں میں، اس کارنامے کا ذکر چھڑنے پر اب بھی بھیڑیے

کی آنکھوں کی سی تیزی اور چمک پیدا ہو جاتی تھی ـــــ اگرچہ جب بھی انھیں گاڑی پر سوار ہونے کی ضرورت پیش آتی تو پہلے نو دس میل پیدل چلنا پڑتا تھا لیکن اس خوشی میں کہ انھوں نے وہاں اسٹیشن قائم نہیں ہونے دیا تھا وہ بخوشی یہ سب تکالیف جھیل لیتے تھے۔

ڈنگا بہت بڑا گاؤں تھا۔ ہندو مسلمان سکھ سبھی رہتے تھے۔ اگرچہ سکھوں کی آبادی چالیس فی صدی سے بھی کچھ اوپر ہی تھی۔ یہ ایک عجیب بات تھی ان لوگوں کی بابت دوسرے خواہ کچھ بھی خیال کریں لیکن آپس میں بلا لحاظ مذہب و ملت وہ مل جل کر رہتے تھے۔ مذہب کی تخصیص تو ضرور کی جاتی تھی لیکن اس بنا پر کبھی کوئی لڑائی جھگڑا نہیں ہوا۔ سارا گاؤں ایک کنبے کی مانند تھا۔ ان میں چند لوگ ایسے بھی تھے جو اپنے پڑوسیوں کو دھوکا دے سکتے تھے یا مخبری کا کام بھی کر سکتے تھے لیکن ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی اور وہ لوگ بھی باقیوں سے اس قدر خائف تھے کہ گاؤں والوں کی مرضی کے خلاف ذرہ برابر ادھر سے اُدھر نہ ہو سکتے تھے۔ مزے کی بات یہ تھی کہ گاؤں میں ساہوکار بھی موجود تھے۔ بظاہر وہ علیحدہ کھچڑی پکاتے اور اپنے آپ کو عوام سے کچھ بلند ہی سمجھتے تھے لیکن یہاں ان کی دال نہیں گلنے پاتی تھی۔ انھیں معلوم تھا کہ اگر زیادہ چوں چرا کی تو ایک ہی شب کے اندر اندر ان کو ایسے طریقے سے ٹھکانے لگا دیا جائے گا کہ ان کی ہڈی پسلی تک ڈھونڈے سے نہ ملے گی۔ گاؤں والے ان سے قرض بھی لیتے تھے سود تو کنار وہ اصل ہی وصول کر کے جان کی خیر مناتے تھے۔ دراصل ان کا کاروبار اردگرد کے گاؤں والوں کے سر پر چل رہا تھا۔ ورنہ ان کی آمدنی اگر اپنے گاؤں پر ہی موقوف ہوتی تو کبھی کے دیوالہ نکال کر یہاں سے چلے گئے ہوتے۔

پالا سنگھ کے خاندان کو کسی زمانے میں گاؤں بھر میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ روپے پیسے اور بدبے کے لحاظ سے۔ لیکن جب بُرے دن آئے تو سب کچھ ہاتھ سے جاتا رہا۔ خاندان کے بچے کھچے افراد کی مَیں تو دہی تھی یعنی وہی بڑے ٹھسے سے گفتگو کرنا۔ ذرا ذرا سی بات پر سر دھڑ کی بازی لگا دینا۔ اور لوگ ان سے ڈرتے بھی تھے لیکن دراصل مالی طور

پر بالکل کھک ہو چکے تھے۔ اس کا بڑا سبب تو یہی تھا کہ ان کے بڑے بوڑھوں نے اپنے زمانے میں ڈاکہ زنی کا پیشہ اختیار کیا۔ کچھ مختلف لڑائیوں میں مر کھپ گئے۔ کچھ جیلوں میں سڑ رہے تھے۔ لے دے کے پالا سنگھ رہ گیا تھا یا اس کا بڑا بھائی۔ زمین کا زیادہ حصہ مقدمے بازی میں بک بکا چکا تھا اور جو تھوڑی بہت بچی تھی۔ اسے پالا سنگھ کے بڑے بھائی لنا سنگھ نے سنبھال لیا تھا۔ شروع شروع میں اس کے مزاج میں بھی فتور آنے لگا تھا۔ لیکن بعد میں جب اُس کی شادی ہو گئی اور بچے بھی پیدا ہو گئے تو وہ امن امان سے کھیتی باڑی کرنے لگا۔ پالا سنگھ چھوٹی عمر میں کلکتے بھاگ گیا۔ اس کی ماں جو صورت اور جُثے کے لحاظ سے راکھشسنی دکھائی دیتی تھی۔ گلی میں کھڑی ہو کر خوب زور زور سے رویا کرتی۔ لیکن اس کے تن و توش میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ یوں وہ مُنہ بسور کر ہر کسی سے شکایت کرتی کہ جب سے میرا پالی گم ہوا ہے میرے تن کو روگ سا لگ گیا ہے۔ نہ کچھ کھاتی ہوں نہ پیتی ہوں اگر کھاؤں بھی تو تن کو لگتا نہیں . . . . لوگ اس کا ڈیل ڈول اور پھر اس قسم کی باتوں کا موازنہ کر کے اس کی پیٹھ پیچھے ہنستے تھے۔ کیونکہ اس کے روبرو اس کی کسی بات پر شبہ کا اظہار کرنا گویا بیٹھے بٹھائے مصیبت کو دعوت دینا تھا۔ وہ بڑی آتش مزاج اور ہتھ چُھٹ عورت تھی۔ اسے مردوں کے مقابلے میں لٹھ لے کر لڑنے سے بھی گریز نہیں تھا۔ ایک مرتبہ گاؤں ہی کے ایک بدمعاش کی سازش سے چند ڈاکو آئے۔ اگرچہ انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔ لیکن گاؤں کے چند آدمی زخمی ہو جانے کی وجہ سے تھانیدار سپاہیوں سمیت آن پہنچے۔ پالا سنگھ کی ماں سنداں کو بھی گواہی کے سلسلے میں طلب کیا گیا۔ وہ حسبِ معمول اپنے یہ بڑے بڑے ہاتھ گھما گھما کر بلند آواز میں کہنے لگی "جب لنے کا باپو (باپ) زندہ تھا تو کیا مجال جو کوئی چور چکار اس گاؤں میں گھسنے کا نام لے . . . . . " یہ سُن کر حاضرین کے لبوں پر پُر لطف مسکراہٹ پیدا ہوئی کیونکہ دنیا جانتی تھی کہ لنے کا باپو (پالا سنگھ کا باپ) خود ڈاکو تھا جسے آخر کار پھانسی پر لٹکا دیا گیا تھا۔ لیکن سنداں نے سب مسکراہٹوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے سلسلۂ کلام جاری رکھا "باگورو، باگورو . . . . . . اب تو کلجگ آگیا ہے (یعنی پالی کے باپو کے زمانے میں ست جگ تھا) لوگ ڈاکے ڈالنے

کے لیے ہمارے گاؤں ہی پڑھ دوڑتے ہیں۔۔۔ اور جب لینے کا باپو۔۔۔"
حاضرین میں سے کسی نے بہ باطن تمسخرانہ انداز میں کہا "ہاہا۔۔۔ بڑا ہی نیک تھا بچارا لینے کا باپو"
سنداں نے مشکوک نظروں سے اس آدمی کی طرف دیکھا لیکن اسے سنجیدہ پا کر پھر یہ بڑائنہ کھولا "ہاجی اس کی کیا بات تھی۔ وہ گاؤں میں نہ توڈاکو کو گھسنے دیتا تھا۔ اور۔۔۔۔" یہ کہہ کر اس نے ایک ۔۔ لمحہ کے لیے تیز نظروں سے تھانیدار کی طرف دیکھا "اور۔۔۔۔۔نا۔۔۔نا۔۔۔تھانیدار کو۔۔۔"
اس بات پر سب لوگ تھانے دار سمیت قہقہہ لگا کر ہنسے۔
یہ تھا بھی درست۔ لینے کے باپو کے زمانے میں توڈنگا گاؤں چوروں، ڈاکوؤں اور جرائم پیشہ لوگوں کا گڑھ بنا ہوا تھا۔ لیکن کیا مجال جو گاؤں والوں میں سے کسی کی ایک دھیلے تک کی چوری ہو جائے۔ صرف ایک مرتبہ موجو ماچھی نے اس قسم کی حرکت کی تھی۔ لینے کے باپو کو جس وقت اس بات کی خبر ہوئی تو وہ پیپل کے نیچے اپنے مگدر کے پاس بیٹھا غصے کھجا رہا تھا۔ یہ خبر ملتے ہی اس نے تین من کا مگدر اٹھایا اور سیدھا موجو ماچھی کے پاس پہنچا اور پیشتر اس کے کہ اس کے منہ سے کوئی بات نکل سکے یا وہ فرار ہونے ہی کی سوچ سکے۔ اس نے مگدر اس کے سر پر دے مارا اور اس نے وہیں دم توڑ دیا۔ یہ سب کچھ بھرے گاؤں میں ہوا لیکن پھر بھی اس کے خلاف موثر کارروائی نہ ہو سکی چھ سات ماہ کے اندر اندر سارا جھگڑا چکتا ہو گیا۔ اور یہ بات بھی درست تھی کہ ان دنوں پولیس بھی اس گاؤں میں داخل ہونے سے کتراتی تھی۔ ان بدمعاشوں کے پھیلے ہوئے جال میں پولیس کے اچھے اچھے افسر بھی بعض اوقات پھنس جاتے تھے۔
لینے کے باپو نے ایک مرتبہ ہتھکڑیوں کے باوجود دونوں ہاتھوں میں جوتا پکڑ کر تھانے دار کو پیٹ ڈالا۔ اس کی طاقت اور ہمت کو تو دشمن بھی تسلیم کرتے تھے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ڈنگا سنگھ اور چھماں ڈاکو کے بعد

لسنے کے باپو نے ہی اپنے نام کا ڈنکا بجایا۔
باہر والے لوگوں کے دلوں میں تو سنداں کے نام کی بھی دھاک بیٹھی تھی۔
اپنی گلی میں تو وہ کسی اجنبی بدمعاش کو ایک سیکنڈ کے لیے نہ ٹکنے دے۔ سنداں
ڈاکے چوری کو بُرا نہ سمجھتی تھی۔ اگر بُرا سمجھتی تو اس بات کہ ان کے خاندان کے
سوا یا زیادہ ان کے گاؤں والوں کے علاوہ بھلا کوئی ایسی جرأت ہی کیوں کرے
اگر بہت ہوا تو وہ ایک جاٹ کی بدمعاشی بھی نظر انداز کر سکتی تھی۔ ایک مرتبہ
جب گاؤں کا ایک ہندو لڑکا جوان ہو کر بڑھ بڑھ کر لڑائیوں میں حصہ لینے
لگا تھا۔ تو اس نے عجیب انداز میں ناک منہ چڑھا کر کہا" باہگورو، باہگورو،
گھور کلجگ آگیا ہے۔ اب تو بنئے بھی لاٹھیاں گھمانے لگے"۔
لسنے کے باپو کی موت اس وقت ہوئی تھی جبکہ پالی کی عمر دو ڈھائی
برس کی تھی۔ بچارے پالی کو باپ کی صورت دیکھنی بھی نصیب نہ ہوئی۔
اس کی موت کے بعد جب سنداں نے بڑھاپے میں قدم رکھا تو
پہلے کی سی آن بان تو رہی نہیں تھی۔ اس لیے اس کے دل پر مظلومیت کا
جذبہ طاری ہونے لگا۔
لیکن وہ کسی سے دب کر نہیں رہتی تھی۔ اسے واہگورو کال پر کھ پر
بہت زبردست بھروسہ تھا۔ پالی کے باپ کے زمانے میں تو لوگوں پر ان کا
بہت دبدبہ تھا اور پھر جب اس دبدبے میں کچھ کمی نظر آنے لگی تو سنداں
کو یہ احساس ہونے لگا کہ لوگ اس سے بے انصافی کر رہے ہیں اور اس کی
وہ قدر جو ہونی چاہیئے۔ نہیں ہوتی۔ لسنا بڑا ہو چکا تھا اور پھر اسے اتنا لگاؤ بھی
نہیں تھا۔ اس لیے سنداں کی توجہ زیادہ تر پالی کی طرف رہنے لگی۔ وہ ابھی بچہ
ہی تھا کہ وہ مکھن کی گولیاں اس کے حلق میں سے زبردستی نیچے اتارنے لگی۔
اسے پالی کی خوراک کا بہت خیال رہتا تھا۔ وہ ننھے پالی کو یتیم سمجھتی تھی۔
بچارے کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا تھا۔ اس کے سوا کون تھا جو سوم
(معصوم) کی دیکھ بھال کرے۔

چنانچہ مکھن، دہی ملائی، دودھ سے پالی کے پیٹ کا تنور بھرپور کئے رکھتی۔ حالانکہ پالی کی صورت سے مظلومیت کا اظہار ہوتا تو ایک طرف وہ الٹا اپنے باپ کی طرح خونخوار دکھائی دیتا تھا۔ بھیڑیئے کی سی چری ہوئی باچھیں تھیں اس کی۔ اس قدر ضدی اور منہ توڑ کر ذرا ہاتھ پاؤں نکالتے ہی اس نے ماں کی چوٹی پکڑ کر اسے صحن میں گھمانا شروع کر دیا۔ چھوٹی سی عمر میں اس نے گلی اور پھر گاؤں بھر کے لڑکوں کا ناک میں دم کر دیا تھا۔

ہتھ چھٹ ایسا کہ ذرا سی گرمی آئی تو تڑاخ سے تھپڑ مقابل کے منہ پر۔ بسیار خوری کے سبب وہ ناک کی بجائے منہ سے سانس لیتا تھا اور جب اپنے حریف پر جھپٹتا تھا تو ایسی مجنونانہ تندی کے ساتھ کہ جیسے دوسرے کی جان لے کر رہے گا۔ بڑے بوڑھوں کو اس چھوکرے کے آثار کچھ اچھے نظر نہیں آرہے تھے۔

لیکن ایک روز وہ گاؤں سے غائب ہو گیا۔ کئی روز سے وہ چین لال پنساری سے تقاضا کرتا رہا کہ وہ اسے شہر کی سیر کروا لائے۔ چین لال بھی وعدہ کرتا تھا۔ لیکن کئی دنوں تک اسے بھی شہر کی طرف جانے کا اتفاق نہ ہو سکا۔ اس پر غالباً پالی کو اور زیادہ انتظار کرنا مشکل معلوم ہوا۔ وہ خود ہی غائب ہو گیا۔ پھر کیا تھا سنداں نے سارا گاؤں سر پر اٹھا لیا۔ بیچ میدان کھڑے ہو کر بھوری بھینس کی طرح شانتے ہلا ہلا کر اور بھوں بھوں کر کے جو رونے پر آئی تو بس دریا بہا دئے۔ چین لال نے یہ حال دیکھا تو پرمیشور کا ہزار ہزار شکر ادا کیا کہ اگر وہ ایسے نٹ کھٹ چھوکرے کو اپنے ساتھ شہر میں لے جاتا اور کہیں وہ وہاں غائب ہو جاتا تو یقیناً اسے چین کی بنسری بجانی بھول جاتی بلکہ پنجابی محاورے کے مطابق دنیا میں اس کا دانہ پھکا ہی ختم ہو جاتا۔ سنداں کے واویلا کرنے پر چند لوگ شہر کو دوڑائے گئے۔ انھوں نے چپہ چپہ چھان مارا لیکن برخوردار پالی کو ملنا تھا نہ ملا۔

سنداں نے بھی اپنے چہیتے بیٹے کی جُدائی میں اپنا یہ معمول بنالیا کہ صبح کے وقت اُٹھ کر باسی روٹی پر مکھن کا گولا دھرا اور چٹ کر گئے۔ پھر کچھ دیر بسورتے رہے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد پھر تھوڑا بہت رودھو کر پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور سو گئے۔

سنداں کے دل کو کافی چوٹ پہنچی تھی۔ ذہنی کرختگی میں بھی زیادہ نہیں لیکن انیس بیس فرق ضرور دکھائی دینے لگا۔ بڑھاپے کے سبب قویٰ میں بھی اضمحلال پیدا ہو چلا تھا۔ اس لئے زبانی باہگورو باہگورو پر اکتفا کرنے کی بجائے اس نے روزانہ تو نہیں البتہ سنگرات کے سنگرات گوردوارے میں جاکر گوربانی سُننی بھی شروع کر دی۔ گرنتھی جی کے خوبصورت لمبی لمبی مونچھوں میں پوشیدہ مُنہ سے نکلتی ہوئی سچے گورو کی سچی بانی کا اگرچہ وہ ایک لفظ تک نہ سمجھ پاتی تھی۔ لیکن وہ بغور اُس کے منہ کی طرف دیکھتی رہتی تھی اور ہر ممکن طریقے سے اپنے دل کو یقین دلانے کی کوشش کرتی کہ وہ واقعی اچھی باتیں ہی کہتا ہے۔

کئی برس بعد جب اسے کلکتے سے اپنے بیٹے پالا سنگھ کی چٹھی آئی، تو بس وہ باؤلی ہو گئی۔ اس نے کئی آدمیوں سے وہ چٹھی پڑھوائی۔ تاکہ کسی غلطی کا کوئی امکان نہ رہے۔ یہاں تک کہ بالآخر اسے ساری چٹھی زبانی یاد ہو گئی اس نے گاؤں کی ہر عورت کو یہ خبر سُنائی۔ راستہ چلتے وہ کسی عورت کو دیکھ کر رُک جاتی۔

"ناہبھین۔۔ میرے بیٹے پالی کی چٹھی آئی ہے کالے کتے سے!"

وہ عورت رُک جاتی: "بھلا ہوا بہن تو نے پہلے بھی بتایا تھا!"

کئی عورتوں کو وہ یہ خبر دوبارہ سہ بارہ سُنا چکی تھی۔ لیکن وہ ہر مرتبہ یہی سمجھتی کہ وہ پہلی مرتبہ یہ خبر سُنا رہی تھی۔ یہ معلوم کرکے کہ اس نے یہ خبر سُنا دی ہے وہ اپنی گدلی آنکھیں اُٹھا کر مقابل والی عورت کے چہرے پر گاڑ دیتی۔ اس کی آنکھوں کے گوشوں کی جھریاں اور بھی گہری ہو جاتیں اور اس کے چہرے پر درد و کرب کے ہلکے آثار دکھائی دینے لگتے۔ اس پر وہ عورت پُوچھ لیتی۔

"تو بہن وہاں کیا کام کرتا ہے؟"

اس پر سنداں کی خوفناک باچھوں پر پھیلتی ہوئی مسکراہٹ بڑی عجیب سی

دکھائی دیتی۔ تشکر اور یگانگی کے جذبات کے ہجوم میں وہ گدلی آنکھیں پانی کی باریک تہ میں ڈوب کر اور بھی پرے چلی جاتیں۔

”کالے کتے میں ڈریے پر (ڈرائیور) ہے . . . بوٹر چلاتا ہے۔“ سننے والی عورت کو دل میں بڑا تعجب ہوتا کہ پالی اور کام کرے۔

چند ہی دن بعد سنداں نے فیصلہ کیا کہ وہ پالی کو ملنے کے لیے کالے کتے (کلکتے) ضرور جائے گی۔ ہر چند اس کے پاس دام تھے لیکن اس نے بلا ٹکٹ ہی جانا مناسب سمجھا۔ راستے میں ریل سے اتاری بھی گئی۔ لڑائی جھگڑے بھی ہوئے لیکن وہ لڑتی جھگڑتی کلکتے تک پہنچ ہی گئی . . . وہاں پہنچ کر جب اس نے پالی کو دیکھا تو اسے پہچان نہ سکی۔ کہاں وہ چھوٹا سا لڑکا اور کہاں اس کی پگڑی کا اٹھا ہوا شملہ چھت کو چھوتا تھا۔ جب اس نے اسے پہچان لیا تو رونے لگی۔

وہ چند دن بیٹے کے پاس رہی۔ وہ اسے اپنے ہمراہ گاؤں لے جانا چاہتی تھی۔ لیکن پالا سنگھ نے کہا کہ وہ کچھ عرصہ ٹھہر کر آئے گا۔ جب وہ رخصت ہونے لگی تو پالی نے اس کا ٹکٹ خریدنے کے لیے پیسے نکالے جو اس نے اس سے لے کر اپنی گرہ میں باندھ لئے۔ کہنے لگی۔ میں آگے جا کر خود ہی لے لوں گی بیٹا، تو فکر مت کر۔

واپسی پر پھر بلا ٹکٹ ہی آئی اور آتے ہی اس گناہ کی تلافی کے طور پر سنکرات کے دن سوا روپیہ کا کڑاہ پرشاد کروا دیا۔

گاؤں بھر میں گھوم پھر کر اس نے گھر گھر اپنے بیٹے کی بابت کل تفصیلات پہنچائیں اور اپنے مخصوص انداز میں اس نے بیٹے کی شکل وصورت، اور طاقت وجرأت کا بھی ذکر کر دیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ اب وہ عنقریب ہی گاؤں واپس آ جائے گا۔ دراصل لوگوں کو یہ ایک قسم کی دھمکی تھی کہ تم جو آجکل ہمارا ادب یہ تسلیم نہیں کرتے۔ میرا بیٹا آ کر سب باتیں لٹھ کے زور پر منوالے گا۔

گاؤں میں پہنچ کر سنداں نے خطوں کا تانتا باندھ دیا اور ہر خط میں بیٹے کو گاؤں واپس آنے کی تاکید ——— بار بار تاکید کی جاتی تھی۔

لیکن اس کا نورِ نظر اس دوران میں جیل کی ہوا کھانے چلا گیا۔ اس کی چھٹیوں کا جواب بھی نہ آیا تھا۔ آخر جب وہ ایک مرتبہ پھر ”کالے کتے“ جانے کو تیار ہو رہی تھی

تو پالی کے ایک دوست کی چھٹی ملی جس میں لکھا تھا کہ پالا سنگھ فوج میں بھرتی ہو کر برما چلا گیا ہے۔ چھٹی ملنے پر گاؤں پہنچ جائے گا۔ یہ چھٹی غالباً پالی کی ہدایت کے مطابق لکھی گئی تھی۔

اس پر سنداں چپ ہو رہی۔ دن میں دو گھڑی باگورو باگورو کا ورد کر کے دعا مانگتی کہ اس کا بیٹا لڑائی سے صحیح و سلامت واپس پہنچ جائے گا۔ چنانچہ ایک دن واقعی اس کی دعا قبول ہو گئی۔

اتفاق کی بات اس روز بہو نے اٹھتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ جوہڑ سے تین چار تسلے گیلی مٹی کے لے آئی اور اپنے مکان کی کچی دیواروں میں جو رخنے پیدا ہو گئے تھے انھیں گیلی مٹی سے بھر دیا اور پھر اپنی ساس کی مدد سے بھس ملے پتلے گوبر سے سب دیواریں پوت ڈالیں۔ کہیں دوپہر تک یہ کام ختم ہوا تو پھر جلدی سے روٹی کھا کر گھر کے سب برتن مانجھ کر چمکا ڈالے اور پھر انھیں قرینے سے ٹکا دیا۔ اس دوران میں سنداں چرخہ گھماتی رہی۔ جو عورت بھی ملنے کے لیے آتی تو کہتی "بے بے آج تو گھر جگ مگ جگ مگ کر رہا ہے۔ آخر یہ کس بات کی طیاریاں ہیں؟"

اس قسم کی باتیں سن کر بہو کی ناک مارے خوشی کے سرخ ہو جاتی۔ لیکن سنداں بڑی سنجیدگی سے کہتی "اری طیاریاں کس بات کی ہوتیں۔ کئی دن سے لپائی نہیں ہوئی تھی تم جانو بہو ٹھہری جوان —— آج جو کام کرنے پر آئی تو دیکھ لو دوپہر تک سارا گھر اندر باہر سے لیپ ڈالا . . . اب ہمارا کیا ہے ایک سانس آیا دوسرے کی خبر نہیں"

"تم تو سدا سے یہی کہتی آئی ہو۔ آخر تمھیں ہوا کیا۔ دھرم نال جیسی صحت تمھاری ہے گاؤں بھر میں کسی کی نہ ہو گی۔ اپنی عمر تو سوچو کتنی ہے اور پھر بھی کیسا دم خم ہے . . ."

بڑھیا دل میں خوش ہوئی لیکن بظاہر ناک بھوں چڑھا کر بولی "اب کیا ہے ہمارا کھایا پیا تن کو لگتا نہیں جب سے میرا پالی . . ."

شام کے وقت جب سنداں تنور گرم کرنے کے لیے چھت پر سے کپاس کی چھڑیاں لینے گئے گئی ہوئی تھی اور اس کی بہو اپنی چندھی آنکھوں سے صحن میں بیٹھی چرخے کا تکلا سیدھا کر رہی تھی تو ڈیوڑھی میں بھاری بھاری قدموں کے دھمکوں کی آواز سن کر اس نے سر اٹھایا تو دیکھا

کر ڈیوڑھی کے دروازے میں سے ایک بلند و بالا مرد سر جھکا کر گزرا اور صحن میں آن کھڑا ہوا۔

بہو نے اجنبی کو دیکھتے ہی چھوٹا سا گھونگھٹ نکال لیا اور کنکھیوں سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنے لگی کہ آخر یہ کون ہے۔ گاؤں کے مردوں کو تو وہ پہچانتی تھی۔ لیکن اس گھنی بھوؤں، عقاب کی سی تیز آنکھوں والے شخص کو وہ نہ پہچان سکی اس کا شوہر باہر گیا ہوا تھا۔ بچے گلی میں شور شرابا مچا رہے تھے۔ وہ یہ دریافت کرنے ہی کو تھی کہ بھائی تم کون ہو ــــ کہ چھت سے سنداں نے صحن کی طرف جھانک لیا اور اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا اور اس کے حلق میں سے انسان اور حیوان کی ملی جلی سی آواز نکلی "دے پالی"

شکر ہے سنداں نے چھت ہی سے صحن میں چھلانگ نہیں لگا دی بلکہ سیڑھیوں کی طرف لپکی۔ اور یوں آواز آئی جیسے سیڑھیوں سے کسی نے بھاری سل لڑھکا دی ہو۔ نیچے اترتے ہی وہ بگولے کی طرح اڑ کر بیٹے کے گلے کا ہار ہو گئی۔

اس وقت بہو کو یاد آیا کہ اس روز صبح سے شام تک کوا منڈیر پر کائیں کائیں کرتا رہا تھا اور اس کی آنکھ بھی پھڑکتی رہی تھی۔

جب سنداں کے حواس ٹھکانے آئے تو اس نے اپنا مردنما کرخت ہاتھ پھیلا کر بہو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ہیں دے! تو نے پہچانا نہیں۔ یہ ہے تیری بھابی ــــ تاباں"

پالا سنگھ کو بھابی کے پاؤں چھوتے وقت آسمان سے زمین پر اترنا پڑا۔ بھابی نے بھی اس کی پیشانی چومنے کی فکر میں منہ جو بڑھایا تو جلدی میں اس کی لمبی ناک کی نوک ہی اس کی پگڑی کے سرے کو چھو پائی۔ پھر اس نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیر کر دونوں ہاتھوں کی انگلیاں اپنی کنپٹیوں پر جما لیں گویا اس کی سب بلائیں اپنے سر لے لیں۔

پھر جلدی سے دیوار کے ساتھ لگی ہوئی ایک چارپائی گھسیٹ کر صحن کے بیچ

میں ڈال دی گئی۔ مارے خوشی کے سنداں کے پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے تاباں بھی کچھ کم خوش نہ تھی۔ شکل و صورت تو اس کی اچھی ہی تھی۔ لیکن وہ دل کی سادا اور کھوٹ سے یکسر مبرّا تھی۔ اس نے بھی سنداں کی زبانی ان کے آباؤ اجداد کے کارناموں کی مبالغہ آمیز داستانیں سُنی تھیں۔ جنھیں سُن کر وہ پہلے پہل تو واقعی مسرت محسوس کرتی رہی لیکن بعدازاں اس کا جوش و خروش کم ہوگیا تھا۔ اس کا شوہر پکا اُجڈ اور موٹی عقل کا آدمی تھا۔ کسی پر رعب گانٹھنا تو جانتا ہی نہیں۔ لڑ پڑے تو بے مطلب کی بات پر اور اگر خوش ہوئے تو وہ بھی بے معنی بات پر۔ اسے خواب میں بھی خیال نہیں تھا کہ اس کا دیور ایسا کرارہ جوان ہوگا۔ اگرچہ بچپن میں پالی کی آنکھوں میں حیوانی چمک موجود تھی۔ لیکن اس کے باوجود چونکہ اس نے مکمل طور پر ہاتھ پاؤں نہیں نکالے تھے۔ اس لئے گاؤں کی عورتوں نے اس کا ذکر گرمجوشی سے کبھی نہ کیا تھا۔ وہ تو اسے صحن میں کھڑا دیکھ کر سچ مچ ڈر گئی تھی۔ کیسے ترشے ترشائے خدوخال اور کیسی جسم سے آرپار ہوتی ہوئی متجسس آنکھیں تھیں اس کی۔ کیا ہی بلند و بالا قد اور مردانہ تیور تھے۔

تھوڑی دیر میں بچے بھی شور مچاتے ہوئے گھر لوٹ آئے۔ صحن میں ایک اجنبی آدمی کو دیکھ کر وہ چُپ ہو گئے اور جب انھیں دلاسا دیا گیا کہ یہ آدمی ان کا حقیقی چچا۔ ...." کالے کتے والا چاچا ہے.... (کوئی چور، اچکا یا قاتل نہیں) تو وہ شرما شرما کر اس کے قریب آنے لگے۔ پالا سنگھ نے بھی اپنی گٹھڑی کھولی اور اس میں سے مٹھائی نکال نکال کر بچوں میں بانٹنے لگا۔ مٹھائی کھا کر بچوں کو اس کے حقیقی چچا ہونے کا یقین آگیا اور پھر جب اُنھوں نے دیکھا کہ اس کی مضبوط پیٹھ پر چڑھ بیٹھنے پر بھی وہ ان کا ٹینٹوا نہیں دباتا تو پھر وہ بالکل ہی مانوس ہو گئے۔

صبح کی دال بنی پڑی تھی۔ گھر والوں کا پروگرام یہ تھا کہ چولھا گرم نہ کیا جائے صرف تنور پر روٹیاں پکا کر لے آئیں اور دال ہی کھا پی کر سو رہیں۔ لیکن اب چونکہ پالا سنگھ آگیا تھا۔ اس لیے تاباں نے تو سوکھے اُپلے توڑ تاڑ کر چولھے میں ٹھونس کر نیچے سے کپاس کی چند نازک چھڑیاں جلانی شروع کر دیں اور بڑی لڑکی کو بڑیوں کی

ہانڈی اُٹھالانے کے لئے کہا۔

سنداں مارے خوشی کے گھر کے اندر باہر گھوم رہی تھی۔ ڈیوڑھی کے دروازے کے آگے سے گزرنے والے ہر مرد اور عورت کو پالی کے آنے کی خوشخبری سناتی تھی لوگوں کو پالی سے کیا مطلب ہو سکتا تھا۔ سوائے اس کے بچپن کے ساتھیوں کے بڑے بوڑھوں میں سے بعض کو اس کی صورت تک یاد نہیں تھی۔ لیکن چونکہ عورتیں ان معاملات میں ذرا زیادہ گرمجوشی کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ چنانچہ وہ اندر چلی آتیں۔ اسے ایک نظر دیکھ کر واقعی اس کی شخصیت سے متاثر ہوتیں۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد دعائیں دیتی چلی جاتیں۔

پھر اس کی ماں لنا سنگھ کو ڈھونڈنے کے لیے گھر سے باہر چلی گئی۔ پالا سنگھ چُپ چاپ چارپائی پر بیٹھا رہا۔ اسے فضا کی اجنبیت کا احساس ہو رہا تھا۔ ہندوستان کے پرلے سرے پر آباد ایک بہت بڑے شہر میں کئی برس گزارنے کے بعد وہ واپس لوٹا تھا اور گاؤں کی نسبتاً خاموش فضا۔ صحن کے گوشے میں ٹمٹاتا ہوا دیا۔ اور وہ میلے کچیلے بچّے ۔۔۔۔ اسے یُوں احساس ہونے لگا۔ جیسے وہ کسی اجنبی ماحول میں آ گیا ہو۔ اور اسے کچھ کچھ شبہ ہونے لگا کہ وہ سچ مچ اس جگہ رہ بھی سکے گا، یا نہیں۔ دراصل وہ ماں کے اصرار کے باوجود آنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ لیکن دفعتاً پھر اُسے سرنی کی یاد آ گئی۔ رفتہ رفتہ اسے یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ اس کا دل سرنی کی فرقت میں تڑپتا رہتا ہے۔ جیسے وہ اس کی اپنی امانت ہو، دولت ہو، جس کی خبر گیری کرنا جسے دُوسروں کے چنگل سے بچانا اس کا اوّلین فرض ہو۔

وہ اپنے ہاتھ پیچھے کی طرف ٹیکے کھوئی کھوئی نظروں سے بھابی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے بھائی کی شادی بھی اس کی غیر موجودگی میں ہوئی تھی۔ اس کے ذہن میں بھابی کا تصور تھا، وہ قطعاً اس کے برعکس نکلی۔ اس کی بھابی تاباں کا جسم دیہاتی لڑکیوں کی مانند خوب مضبوط تھا لیکن منہ چپٹا تھا۔ قدرے پتوترا۔ ناک گویا سارے چہرے کو پیچھے چھوڑ کر آگے کو بھاگ نکلی تھی۔ آنکھیں چندھی جن کے گوشے سرخ اور پُرنم۔ اگر کوئی چیز خوبصورت تھی تو اس کے بال اور چھاتیاں۔ گھنے اور لمبے بالوں کی لمبی چوٹی اس

سر قدرے بوجھل تھی کہ اس کے سر کی معمولی حرکت سے تو اس میں جنبش ہی پیدا نہ ہوتی تھی۔ اس کی چھاتیاں خوب تنی ہوئی اور ان کی نوکیں آگے کو نکلی ہوئی تھیں۔ دفعتاً بھابی نے چولھے کی آگ کی روشنی میں جھلملاتا ہوا چہرہ اوپر کی طرف اٹھایا اور اس کی جانب چمکتی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی "کیا دیکھ رہے ہو میری طرف؟"

بڑے بوڑے کے دہانے کی طرح پالا سنگھ کا منہ کھل گیا اور اس کے سامنے کے ایک دانت میں جڑی ہوئی سونے کی کیل جگمگا اٹھی۔

"کیوں تمہاری طرف دیکھنا گناہ ہے؟" اس نے بے تکلفی سے کہا۔

"کوئی دیکھنے کی چیز بھی ہو؟" یہ کہہ کر بھابی نے بڑے حلم سے سر نیچے جھکا لیا۔

"ہا ہا۔۔۔۔ بھابی دیکھنے کے لیے آنکھ چاہیے آنکھ۔۔۔۔ کیوں ٹھیک کہتا ہوں نا۔۔۔۔"

تاباں کا جی اس قسم کی چہلوں کے لیے ترس گیا تھا۔ بھابی دیور کے رشتے ہی میں اس قسم کی ہنسی ٹھٹھول کی باتیں کی جا سکتی تھیں اور وہ تو بچپن ہی سے بڑی نٹ کھٹ اور ہنسوڑ لڑکی تھی۔

"تم نے بہت اچھا کیا جو اپنے گھر چلے آئے۔ ہائے تم کس قدر سنگدل ہو۔ تمہارا گھر آنے کو جی تک نہ چاہتا تھا؟"

"کیوں نہیں۔۔۔۔ واہ بھابی یہ بھی خوب کہی۔۔۔۔ پالا سنگھ نے طبعی خوش مزاجی سے کام لیتے ہوئے کہا: "تمہیں دیکھنے کے لیے تو جی ترس گیا تھا میرا۔۔۔۔"

تاباں اصل نکتہ سمجھ کر زور سے ہنس پڑی۔

تم تو بکتے ہو بکتے۔۔۔۔ یاد کرنے کی بات تو کچھ ہمارے دل سے پوچھو۔۔۔۔ تم نے مجھے دیکھا ہی نہیں تھا اور میں ہر روز بے بے کے منہ سے تمہاری ہی کتھا سنا کرتی تھی۔ تم کیا جانو تمہیں دیکھنے کو کس قدر دل ترستا تھا ہمارا۔"

پالا سنگھ نے ڈاڑھی کھجاتے ہوئے کہا۔ "لیکن بھابی مجھے دیکھ کر تو ساری چوکڑی بھول گئی ہو گی ایک دفعہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرے درشن پا کر تو اچھے اچھوں کے ہوش اُڑ جاتے ہیں۔ بھلا تم کس کھیت کی مُولی ہو۔ ۔ ۔ "

اس پر تاباں ہاتھ میں بیلن پکڑ کر اسے دکھا دکھا کر دھمکی کے طور پر اسے ہلانے لگی۔

"نہیں بھابی سچ کہو۔ ۔ ۔ ۔ دھرم سے۔ ۔ ۔ ۔ بس میری قسم تمھیں جو جھوٹ بولو ایک لفظ بھی۔ ۔ ۔ "

اس پر تاباں نے بیلن ایک طرف رکھ دیا۔ "نہیں سچ پُوچھو تو واقعی میں ڈر گئی تھی۔ ۔ ۔ ۔ آخر کس باپ کے بیٹے ہو۔"

"نہیں بھابی سچ سچ بتاؤ، تم کیا سمجھ بیٹھیں۔"

"کہہ تو دیا بس ڈر گئی تھی۔ ۔ ۔ "

"نہیں۔ ۔ ۔ بھئی۔ ۔ ۔ ذرا تفصیل سے۔"

"ہٹاؤ بس۔ ۔ ۔ "

"بھئی یوں نہیں ہم تو لوچھ کر رہیں گے۔"

تاباں نے دوپٹہ کھینچ کر اسے سر پر اوڑھ لیا اور ایک لحہ بھر اس کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ چُندھی آنکھوں میں شرارت کی چمک پیدا ہو گئی۔

بچے بھی ان کی جھڑپ میں دلچسپی لے رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔

"بتا دو نہ ماں۔ ۔ ۔ ۔ جب چاچا اندر آیا تو تم نے کیا سمجھا کر کون آ گیا ہے؟"

"پہلے تو پاؤں کی دھمک کی آواز سے میں یہ سمجھی کہ کوئی ہاتھی ہماری ڈیوڑھی میں گھس آیا ہے اور پھر جب تم صحن میں آن کھڑے ہوئے تو میں جو اُوپر دیکھنے لگی تو بس اُوپر ہی اُوپر دیکھتی ہی چلی گئی اور میں نے دل میں کہا کہ اس آدمی کا منہ بھلا کہاں پر ہو گا۔ ۔ ۔ "

اس بات پر سب بچے خوب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

"۔ ۔ ۔ اور جب منہ دکھائی دیا تو پگڑی کے اُٹھے ہوئے شملے یوں دکھائی

دیتے تھے جیسے بادلوں میں گھل مل گئے ہوں جاکر۔ ۔ ۔"

اس بات پر پھر بچوں کو بڑے زور کی ہنسی چھوٹی اور ایک بچہ چارپائی پر چڑھ کر چچا کی پگڑی کا اٹھا ہوا شملہ اوپر کی طرف کھینچ کر جو سچ مچ بادلوں کے ساتھ ملانے لگا تو پگڑی اتر گئی ۔ ۔ ۔"

"اوئے اوئے سور دے پتر" پالا سنگھ نے گالی دی اور اچک کر شرارتی بچے کو پکڑنا چاہا۔ لیکن وہ چیخ کر ہنستا ہوا چارپائی سے کود پڑا اور تیزی سے بھاگتا ہوا پرے چلا گیا۔

گھر میں یہ نئی رونق اور چہل پہل دیکھ کر تاباں کا دل مارے خوشی کے ناچ اٹھا چہک کر بولی "اب پگڑی اتار ہی ڈالو۔ کب تک مہمان بنے ڈٹے رہو گے"

یہ کہہ کر وہ اٹھی اور اس کے قریب چلی آئی اور اس کے جوڑے کو چھو چھو کر بالوں کو غور سے دیکھتے ہوئے بولی "معلوم ہوتا ہے کہ تم نے کئی دنوں سے بال دھوئے نہیں ۔ ۔ ۔"

"کمال کرتی ہو بھابی کچھ خیال بھی ہے کتنے دنوں سے ریل میں بیٹھا ہوا ہوں اتنے لمبے سفر میں بالوں کا جس قدر بھی برا حال ہو کم ہے"

"کم از کم نہا ہی لو۔ تھکاوٹ دور ہو جائے گی۔ کہو تو پانی بھر دوں کھوہی سے"

"میں تو ابھی ابھی نہا کے چلا آ رہا ہوں"

"کہاں نہائے تھے"

"نہر میں ۔ ۔ ۔"

"کیا بال بھی بھگوڈالے تھے نہر کے پانی میں۔ تبھی تو میں سوچ رہی ہوں کہ آخر بالوں میں یہ ریتا کہاں سے آیا ۔ ۔ ۔"

"نہیں بھئی سر نہیں ڈبویا میں نے ۔ ۔ ۔ بال سکھانے کا وقت ہی کہاں تھا ۔ ۔ ۔ اور پھر نہر کا پانی تو مجھے تم سے بھی زیادہ اچھی طرح دکھ رہا تھا، کہ بال دھونے کے قابل نہیں"

"ہائے رے بڑا آیا مجھ سے بھی زیادہ دیکھنے والا۔ تیری آنکھیں کون بڑا ہیں۔"

"بڑی نہیں لیکن بالکل زیرا بھی تو نہیں نا"

تاباں نے ایک ہاتھ ملائمت سے اس کے ٹینٹوے پر رکھتے ہوئے کہا۔

کیوں رے آتے ہی میرے منہ آنے لگا۔۔۔"

"اوہو ہو ہو۔۔۔ بھئی دیکھنا خفامت ہونا۔۔۔۔ تمہارا منہ وہاں، ہمارا یہاں۔۔۔"

"اچھا اچھا۔۔۔ اب کل صبح ہی تجھے پکڑ کر بال دھوڈالوں گی۔۔۔"

"یہ بات اب تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ عورتوں کو دوسروں کو نہلانے اور ان کا سر منہ دھونے کی اس قدر فکر کیوں ہوتی ہے۔ جب چھوٹا تھا تو ماں نے ناک میں دم کر رکھا تھا اور اب تم پیدا ہوگئی ہو۔"

تاباں نے اپنی سیدھی انگلیوں سے اس کے رخسار پر ٹھوکا دیتے ہوئے کہا۔

"کاکا میں اب پیدا نہیں ہوئی ہوں بلکہ آج سے پچیس چھبیس برس پہلے پیدا ہو گئی تھی سمجھے۔"

"ہاں بس سمجھ گیا۔"

"تو پھر کیا ارادہ ہے۔"

"ہار مان لی ہم نے۔"

"لو۔۔۔ خوب یاد آیا۔ گھر میں باسی لسی بھی پڑی ہے۔"

"اچھی بات۔۔۔ بس ادھر صبح ہوئی اور اُدھر ہم نے اپنا جوڑا تمہارے ہاتھ میں تھمایا۔"

"لسی کو تھوڑا سا گرم کر کے سر میں ڈالیں گے تو پھر دیکھنا میل کیسے نکلتی ہے اور اس کے بعد چندیا پر۔۔۔"

"جوتے۔"

"ہٹ بدتمیز۔۔۔ چندیا پر ٹھنڈا دہی مل دوں گی۔"

"اور اس کے بعد . . ."

"اس کے بعد؟ . . . . اس کے بعد گاڑھا ادھ رڑکا۔"

"آج کل کتنی بھینسیں ہیں . . . ؟"

"دو . . . . . لیکن دودھ ایک ہی دیتی ہے۔"

ادھر یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ ادھر سنداں بھی لستا سنگھ کو کہیں نہ کہیں سے تلاش کر کے آن پہنچی تھی۔ ہی سے اس کی بلند و بالا آواز سنائی دینے لگی۔ لہنا سنگھ لپکا ہوا چلا آ رہا تھا۔ کھدر کا تہبند لہراتا ہوا جب وہ پالا سنگھ کے عین سامنے آن کھڑا ہوا۔ تو خوشی کے مارے اس کے چوڑے نتھنے پھڑک اٹھے۔

آنکھ جھپکنے میں دونوں نے پہلے بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور پھر بغلگیر ہو گئے . . . . . .

خاوند کی آمد پر تاباں بھی سگھڑ بیبیوں کی طرح دوپٹہ کھینچ کر سنبھل کر کھڑی ہو گئی۔ اور سنداں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے دونوں بیٹوں کے ملاپ کا نظارہ انتہائی محویت کے عالم میں دیکھ رہی تھی۔

بالآخر دونوں بھائی علیحدہ علیحدہ ہو کر ایک دوسرے کے آمنے سامنے چارپائی پر بیٹھ گئے۔ لستا سنگھ نے جلدی جلدی داڑھی کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے کہا "بلے بلے . . . . پالی! واقعی تیرا دل بہت سخت ہے ہم تجھے کبھی یاد تک نہ آئے۔ کتنا ترسایا تو نے۔"

پالا سنگھ کے چہرے پر خجالت کی ہلکی سی سرخی دوڑ گئی۔

"کیا کہوں بھائی! بس یہ سمجھ لو کہ میرے پاؤں میں چکر تھا۔ مقدر جدھر مجھے لے جاتا تھا۔ میں چلا جاتا تھا۔"

ایسے اہم موقعے پر بھابی نے چپ رہنا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے ذرا سنبھل کر فلسفیانہ انداز میں کہا "یہ سب ان جل کی بات ہے۔"

سنداں کو ان جل والی بات بہت پسند آئی۔ اس نے بھی مدبرانہ انداز میں سر ہلایا "ہاں — بس ان جل . . . . ان جل۔"

لہنا سنگھ نے پگڑی میں ہاتھ ڈال کر جوڑے کو ذرا ڈھیلا کیا ۔۔۔۔ " وہ جو گورو صاحب نے کہا ہے کہ دانے دانے پر مُہر لگی ہوتی ہے ۔ ۔ ۔ اب دیکھ لو اس کی قسمت یہاں کا اناج کھانا لکھا تھا سو ہزاروں میل طے کر کے آپہنچا ہے "

لہنا سنگھ کو جب کبھی اپنی دانست میں کوئی اہم بات کہنی ہوتی تھی تو وہ اس کی ذمہ داری گورو صاحب پر تھونپ دیتا تھا " وہ جو گورو صاحب نے کہا ہے ۔ ۔ ۔ "

اس کے بعد باتوں کی آندھی چل نکلی ۔ ہر کوئی کچھ نہ کچھ کہنے پر تُلا ہوا تھا ۔
لہنا سنگھ نے دونوں ہاتھوں سے اشارہ کرتے ہوئے کہا ۔

" چھوٹا سا تھا پالا سنگھ جب وہ یہاں سے گیا تھا ۔ سب اُسے پالی پالی کہا کرتے تھے ۔ لو اب دیکھو سکھ نال کتنا اچھا جوان نکلا ہے "

سنداں نے نظر بد سے بچانے کے لیے کہا " جوان کہاں بچارے کی ہڈیاں نکلی ہوئی ہیں ۔ بچپن میں باپو مر گیا ۔ پالی بیٹا پوچھ اپنے بھائی سے کیسے اچھے دن تھے تیرے باپو کے زمانے میں ۔ کیا مجال جو لہنے کو کوئی تو بھی کہہ دے بیٹا تجھے تو باپو کا مُنہ دیکھنا نصیب نہ ہوا ۔ نہ تیری وہ خاطر داری ہوئی ۔ نہ وہ خوراک ملی ۔ چھٹپن ہی میں دیس بدیس کی خاک چھاننی پڑی ۔ اور پھر بازار کی روٹی میں رکھا ہی کیا ہے ۔ مُنہ دیکھو ۔ کیسا سُوکھ گیا ہے بیٹا "

سب نے پالا سنگھ کے جنگلی بلّے کا سا مُنہ دیکھا اور اطمینان کی سانس لی ۔
تاباں بولی " یہ بے فکر مت کرو ۔ گھر میں واہگورو کا دیا سب کچھ ہے کھُلی ہوائیں گھومے گا ۔ کھائے گا ، پیئے گا تو خود بخود ہی مُنہ ٹھیک ہو جائے گا "

لہنا سنگھ کو بیوی کی بات پسند نہ آئی ۔ کھُلی ہوائیں گھومے گا ، کھائے گا ، پیئے گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس طرح مُنہ ٹھیک کرے گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یعنی مطلب یہ کہ کام کچھ نہیں کرے گا ۔ یہ سوچ کر لہنا سنگھ نے بمشکل خشک گلے کو لعاب دہن سے تر کیا ۔ ۔ ۔

. . . . ادھر تاباں بھی اپنی چندھی آنکھوں سے ساری حقیقت بھانپ گئی چوڑیاں کھنکا کر بولی "آخر بڑا بھائی بھی تو پتا سمان ہی ہوتا ہے . . . "

یہ تیر عین نشانے پر بیٹھا۔ لمنا سنگھ کا اُڑتا ہوا رنگ عود کر آیا بلکہ اس نے ہاتھ بڑھا کر پالی کے کندھے پر رکھنے میں چنداں حرج نہ سمجھا "ہاں ہاں کیوں نہیں تو ہمارا وہی ننھا منّا پالی ہی تو ہے جسے ہم گود میں اُٹھائے پھرا کرتے تھے"

یہ کہتے کہتے اس کی آواز سچ مچ بھر آگئی اور وہ ذہن پر زور ڈال کر سوچنے لگا کہ وہ کب پالی کو گود میں اُٹھائے پھرا کرتا تھا۔

سنداں نے دم بدم تر ہوتے ہوئے نتھنوں کو میلے آنچل سے پونچھتے ہوئے کہا "بھائیوں کو تو لوگ اپنے بازو کہا کرتے ہیں اور ان دونوں میں بچپن ہی سے بڑا پیار تھا"

سنداں ایسی حساس نہیں تھی کہ وہ سچ مچ ہی یہ سوچنے بیٹھ جاتی کہ ان دونوں میں پیار کب تھا۔

اس دوران میں پالا سنگھ بڑی مسکین صورت بنائے اپنے بزرگوں کے نیک ارادوں اور پریم بھری باتوں کو سنتا رہا۔ عین ممکن ہے کہ لمحہ بھر کے لیے اس کے دل پر رقت طاری ہو گئی ہو۔ لیکن جب اس کے چہرے ہوئے منہ کے دہانے میں اس کا ایک گوشے والا کتا دانت چمکتا تو اس کی صورت سے ڈر لگنے لگتا۔

لمنا سنگھ کو دنیوی تفکرات، محنت اور مشقت نے وقت سے پہلے کچھ کمزور کر دیا تھا۔ زمین کا زیادہ حصہ چونکہ مقدموں میں بک چکا تھا۔ اس لیے اس کے دل میں بے سہارے پن کا احساس ہمیشہ ہی سے موجود تھا۔ اس نے پالا سنگھ کی طرح طوفانی لہروں میں دلیرانہ چھلانگ نہیں لگا دی تھی۔ شاید وہ چھوٹے بھائی کی طرح تیز طرار اور چالاک بھی نہیں تھا۔ جب ماں کی بات سے اس امر کا احساس ہوا کہ بھائی بازو کا کام دیتا ہے تو اس کے دل کو تسکین محسوس ہوئی۔ اس نے پالا سنگھ کے چوڑے کندھوں، آگے کو نکلی چوڑی اور سپاٹ چھاتی اور خونخوار تیوروں کا جائزہ لیا تو اس کے دل میں اس بات کا یقین پیدا ہونے لگا کہ اب اس کے دکھوں میں

کمی پیدا ہو جائے گی۔ دفعتاً اس نے مسکرا کر پالا سنگھ کی طرف دیکھا۔
"پالی! مجھے تیرے وہ یار بنتا اور کشنا وغیرہ بھی ملے تھے۔"

"اچھا!! پالا سنگھ نے خوش ہو کر کہا۔

"ہاں بھئی! انھوں ہی نے تو بتایا تھا کہ پالی آ گیا ہے۔ پہلے تو میں سمجھا وہ مذاق کرتے ہیں لیکن جب وہ قسمیں کھانے لگے تو میں سب کام چھوڑ چھاڑ کر سیدھا گاؤں کی طرف بھاگا۔ ۔ ۔"

تاباں کو یہ بات سُن کر نہ معلوم اس قدر تعجب کیوں ہوا۔ ۔ "اچھا تو۔ ۔ ۔ ہم سمجھے بیٹھے تھے کہ بے بے تمھیں ڈھونڈنے کے لیے یہاں سے گئی تھی۔"

سنداں یہ الزام نہ سہہ سکی۔ آخر وہ لینے کو ڈھونڈنے کے لئے نہیں تو کیا کبڈی کھیلنے کے لیے گئی تھی۔ اُس نے مُنہ پھاڑ کر کہا:

"ہاو ہائے میں تو لینے ہی کو تلاش کرنے کے لئے نکلی تھی۔"

نہ معلوم یہ بات کہاں سے کہاں جا پہنچتی۔ کیونکہ ان لوگوں کو زیادہ دُور کی نہیں سوجھتی تھی۔ لیکن لینے نے جب یہ بات سمجھائی کہ لوٹتے وقت بے بے راستے ہی میں مل گئی تھی۔ تب کہیں معاملہ رفع دفع ہوا۔

"ہاں، تو میں لینے کو سارے گاؤں میں تلاش کرتی پھرتی جب وہ ملا ہی نہیں تو میں کیا کرتی۔ ۔ ۔"

اس پر لینا سنگھ نے بھی اپنی پوزیشن صاف کرنی ضروری سمجھی "بے بے میں گاؤں میں تھا ہی نہیں ملتا کہاں سے۔"

اسی ٹیں ٹیں میں لینا سنگھ کو اصل بات بھول ہی گئی۔ ہاتھ سے پیشانی دباتے ہوئے بولا "ایک بات یاد آئی تھی۔ بھلا دی مجھے۔"

سنداں نے اسے اپنے آپ پر حملہ سمجھ کر مدافعانہ لہجے میں کہا "میں نے تو کچھ کہا نہیں۔"

دفعتاً لینے کو بات یاد آ گئی "ہاں میں۔ ۔ ۔ وہ بات۔ ۔ ۔ بنتا کہتا تھا کہ ہماری لڑائی ہوئی تھی ــــ ہوئی تھی کیا؟"

"اوہ نہیں نہیں تو۔ ۔ ۔ یونہی ہنسی مذاق۔ ۔ ۔"

سنداں نے ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بڑی خوش مزاجی سے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہے ہے ہے۔ ۔ ۔ ۔ دوست ہیں نا"

اس پر بھنے کو بھی مدبرانہ بات کہنے کا موقعہ مل گیا "ہاہاہا۔ ۔ ۔ دوستی بھی کیا چیز ہے — اور ہاں وہ لوگ تو گاؤں بھر میں تمھاری آمد کی خبر مشہور کرنا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بچپن کے سب ساتھیوں کو جمع کر کے ہمارے ہاں پہنچیں۔ ۔ ۔ لیکن میں نے منع کر دیا"

"ہاؤ ہائے تم نے منع کیوں کیا؟ سنداں کو پالی کے دوست تک بہت عزیز تھے۔

"نہیں نہیں میں نے کوئی ایسی ویسی بات نہیں کی۔ بھنے نے اس بات کا ثبوت دینے کے لیے کہ وہ کبھی کبھی عقل کی بات بھی کہہ لیتا ہے بتانا شروع کیا "میں نے بڑے پریم سے انھیں سمجھا دیا تھا کہ ابھی تو پالی تھکا ہوا ہوگا کیونکہ سینکڑوں کوس کا فاصلہ طے کر کے آرہا ہے۔ اس بیچارے کو ملنا جلنا کیا سوجھے گا آج تو بس کھانا کھا کر سورہے گا۔ ۔ ۔ ۔ کیوں پالی!"

پالی کو اس میں ہنسی کی تو کوئی بات نظر نہ آئی لیکن بھنے بھائی یعنی اپنے بازو کو ہنستے دیکھ کر اس نے بھی اپنے دانتوں کا مظاہرہ کیا۔

اس طرح اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد کھانا تیار ہوتے پر سب نے مل کر کھانا کھایا اور پھر اپنے اپنے بستروں پر جا کر لیٹ رہے۔

لیکن نیند آنے سے پہلے سوائے باتیں کرنے کے اور کیا چارہ تھا۔ اور پالا سنگھ بھی کبھی نہ کبھی بول اُٹھتا تھا۔ لیکن اس وقت دوسروں کے بولنے کا موقعہ تھا: پالا سنگھ کو ہر قسم کے حالات سے باخبر کرنے کے لئے گھر کی مالی حالت سے لے کر آباؤ اجداد کے کارناموں تک ہر قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔ پالا سنگھ کو ان باتوں سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی بلکہ وہ کچھ اُلجھن سی محسوس کرنے لگا تھا خصوصاً ماں اور بھائی کی باتیں تو زیادہ خشک تھیں۔ لے دے کے بھابی تھی جو کوئی نہ

کوئی مزے دار بات بجھ دیتی۔ بالا سنگھ کے دل میں اگر کوئی کُرید تھی تو وہ سرنوں کی بابت۔ لیکن اس کا ذکر ہی نہ چھڑتا تھا۔ دوستوں کی زبانی تو اصل حالات کا پتہ نہیں چل سکتا تھا۔ اس کی ماں کا سرنوں کے ہاں آنا جانا ضرور ہو گا۔ یقیناً اگر ان کا قصہ چھڑے تو کار آمد معلومات حاصل ہو جائیں۔

آخر گفتگو اپنے گھرانے اور رشتہ داروں تک محدود کیونکر رہتی۔ لہنا سنگھ نے باتوں باتوں میں جب اس بات کا ذکر چھیڑا کہ اس جنگ میں لوگ بڑا روپیہ کما رہے ہیں تو اس پر سنداں نے سرنوں کے باپ رنجن سنگھ کا ذکر چھیڑ دیا۔

" اب رنجن سنگھ ہی کو دیکھو۔ بڑا آدمی بنا پھرتا ہے۔ لڑائی سے پہلے کیا تھا۔ یہی کہ دال روٹی اچھی چل رہی تھی۔ زمین سے واجبی کماتے تھے کھاتے تھے اور جب لام لگی (لڑائی شروع ہوئی) تو اس نے کالے بازار میں خوب روپیہ کمایا۔ اب تو گردن تان کر چلتا ہے ... اور تو اور لڑکی کو بھی پڑھنے کے لیے شہر میں اس کی پھوپھی کے پاس چھوڑ دیا۔ اب تو وہ بھی مڈل پاس ہے ......"

بالا سنگھ کا دل دھڑکنے لگا۔ اس کے لیے تو "کالا اکھر" (لفظ) بھینس برابر تھا۔

" باگورو باگورو" لہنا سنگھ نے کہنا شروع کیا " اب تو رنجن سنگھ کی عورت کا مجاج بھی بگڑ گیا ہے کیوں بے بے ......"

" ہاں نہیں تو کیا جھوٹ ....."

تاباں نے مہین آواز میں کہا " پر بے بے عورت کا مجاج اتنا بُرا نہیں ...."

" بُرا ہو بھی تو ہمارا کیا بگاڑ لے گی" سنداں نے ناک منہ چڑھا کر کہا۔

" بالا سنگھ کے دل میں شبہ نے سر اٹھایا کہ کہیں اس کی لڑاکا ماں نے ان لوگوں سے تعلقات قطع نہ کر لئے ہوں۔ اس لئے وہ ذرا اہتمام سے کھانس کر گلے کا بلغم صاف کرتا ہوا بولا " لیکن ماں تم دونوں تو ایک دوسرے کی دھرم کی بہنیں بنی ہوئی تھیں ...."

" ارے بیٹا جب روپیہ آ جائے تو کون کس کا ؟"

" تو کیا اب ان کے ہاں آنا جانا نہیں ہے ؟"

" ہے کیوں نہیں بھائی ...... آنا جانا بھی ہے بہناپا بھی ہے ....." یہ کہہ کر سنداں دل ہی

دل میں غور کرنے لگی کہ آخر اسے اپنی دھرم بہن سے شکایت کیا ہے پھر اسے خیال آیا کہ وہ گہنے پہننے لگی ہے جو اس کے پاس نہیں ہیں نا۔

"لیکن پالی دیکھو تو بوڑھی ہونے کو آئی۔ آخر اس کا سب سے بڑا لڑکا تو ہنا سنگھ کا ہم عمر ہے۔ لیکن بی بی شنو گہنے پہننے لگی ہے۔ یعنی جب سے زیادہ روپے آنے لگے ہیں یوں بھی خوب بن ٹھن کر رہتی ہے جیسے نئی نویلی دلہن ہی ہو......"

اس پر تاباں نے دبی زبان میں کہا "لیکن بے بے اچھے کپڑے پہننا تو کوئی برا نہیں جب واہگورو اکال پرکھ دے تو انسان کیوں نہ پہنے....."

بہو کی اس بات پر سنداں کا پارہ اُوپر چڑھنے لگا۔ لیکن جب پالی نے بھی بھابی کی تائید کی تو اس کا غصہ فوراً اُتر گیا۔ نرم لہجے میں بولی:

"اچھا تو لڑکی پڑھانے کا کیا فائدہ۔ اسے مڈل پاس کیوں کروایا۔ ابھی تو وہ اسے ایں....... ایں......... کیا نام ہے بھلا سا.......... ایں ٹرس بھی پڑھوا دیتے لیکن وہ مردو ایک دم بیل کی طرح بڑھ گئی۔ اسی لئے وہ اسے اسکول سے اٹھوا کر گاؤں میں لے آئے....."

یہ پڑھوانے کی بات پالا سنگھ کو بھی قطعاً پسند نہ آئی۔ وہ پڑھنا لکھنا نکموں کا کام سمجھتا تھا۔ بچپن ہی سے سرتی اس پر کوئی نہ کوئی رعب گانٹھے رکھتی اور نہیں تو اسے "گندا چوہڑا" کہا کرتی۔ اب یہ نئی مشکل آن پڑی۔ کم بخت نہ معلوم کیا کیا پڑھ گئی ہے۔ نہ جانے کیسی ٹرٹر باتیں کرے گی۔

اپنی بات بنتی دیکھ کر سنداں نے پھر کہنا شروع کیا "نہ جانے بھائی ٹھیک ہے یا نہیں۔ میں نے یہ بھی سُنا ہے کہ شہر میں کسی کالج کے لڑکے کے ساتھ پھنس گئی تھی... بھئی واہگورو ہی جانے....."

یہ سنداں کی من گھڑت بات تھی۔

تاباں یہ پہلے بھی کئی مرتبہ اس کے منہ سے سن چکی تھی۔ وہ یہ جانتی تھی کہ اس کی ساس کو محض حسد کے باعث اس قسم کے الزامات گھڑنے میں عار نہ تھا "بے بے یہ تو کسی کی اڑائی ہوئی بات ہے سراسر........ وہ بیچاری تو بالکل معصوم ہے"

"ہو گی" سنداں نے بظاہر انتہائی بے پرواہی سے کہا "ہمیں کیا غرض...... جو سنا سو

کہہ گیا......... لیکن اتنا تو تم بھی مانو گی کہ جب سے شہر سے ہو کر آئی ہے۔ اس کے رنگ ڈھنگ ہی اور ہو گئے ہیں......"

ان دونوں کی باتیں سنتے وقت کبھی تو پالا سنگھ کا خون کھولنے لگتا۔ کبھی سرنوں سے ملنے کا اشتیاق تیز تر ہو جاتا۔

"ہاں......... جب تین چار برس شہر میں گزارے ہیں تو شہریوں کے رنگ ڈھنگ تو آہی جائیں گے۔"

"اور پھر آنکھوں سے کیسی شوخی ٹپکتی ہے۔ کیا لترلتر زبان چلتی ہے......"

"یہ تو نہ کہو بے بے! گاؤں کی لڑکیاں کیا کم ہیں۔ ریشماں، پریماں، رتنی بیگماں کیا کم چنچل ہیں۔"

بھابی کے اس جواب پر پالا سنگھ کو احساس ہوا کہ وہ اس کی رازداں کا کام بھی دے سکتی ہے۔ غالباً اس کا سرنوں سے بہناپا بھی ہے۔ ورنہ وہ اس طرح اس کی طرفداری نہ کرتی۔

سنداں کو کچھ کچھ تاؤ آنے لگا "وہ بھئی تاباں اب تمہارے ساتھ مغز کون کھپائے......"

لہنا سنگھ کے بلند ہوتے ہوئے خراٹوں نے اک دم اس کی آواز کو دبا لیا۔ گرما گرمی میں کسی کو اس بات کی خبر تک نہیں ہوئی کہ لہنا سنگھ کب سویا۔ پالا سنگھ نے دونوں میں صلح کرانے کے خیال سے کہا "چلو جانے دو آپس میں جھگڑے سے کیا حاصل؟......

آخر ہمیں ان سے کیا واسطہ...... میرا مطلب ہے کہ ہمارا تو کچھ نہیں بگاڑتے نا۔"

سنداں نے دوپٹہ اتارا اور مٹھی کے گرد لپیٹ کر گول سا کر لیا اور اپنے سر تلے بطور تکیے کے رکھ لیا اور پھر دفعۃً سر بڑھا کر بڑے پُراسرار انداز میں کہنے لگی "بھئی میری تو وہ بیٹی سمان ہے۔ مجھے اس کا کوئی دکھ تو ہے نہیں۔ میں تو اس کے بھلے کی کہتی ہوں۔ اب دیکھو نا وہ شہر سے بالوں میں کلپ لگانا سیکھ۔" "کلپ کہو کلپ۔ بے بے۔" تاباں نے بات کاٹی۔

سنداں کے نتھنوں میں سے غرّاتے ہوئے کتے کی سی گونج دار آواز نکلی۔ اس نے ایک بار قہرآلود نظروں سے تاباں کی طرف دیکھ کر کہا:

"ہاں...... تو جو بھی ہو...... وِک لپ...... کلپ۔ اچھا تو اب اسی پر لڑکوں نے
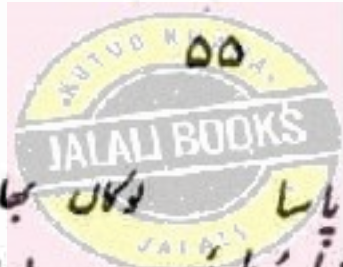
گانا بنالیا ہے۔

نگا رکھدی کلپ والا پاسا لوکاں بھانے گھنٹر گڈھ دی

تم بھی کہو۔ اس پر تاباں ہنس پڑی ہو: ہائے ہائے...... بے بے نہ جانے تجھے کون ایسی باتیں بتادیتا ہے...... یہ تو بہت پرانا گانا ہے جب ہم بچے تھے تو اس وقت بھی لوگوں کو یہ گانا گاتے سُنا کرتے تھے۔ بالا سنگھ بھی بھابی کے سُر میں سُر ملا کر ہنسنے لگا۔ اس پر سنداں کھسیاگئی اور جواب میں ایک لمبی بناوٹی سی جماہی لے کر کروٹ جو بدلی تو کچھ ہی دیر بعد لیٹنے کے خراٹوں سے اس کے خراٹوں کا مقابلہ ہونے لگا..... البتہ بالا سنگھ کچھ دیر آکاش میں بکھرے ہوئے دھلے اجلے تاروں کی جانب دیکھتا رہا۔

۳
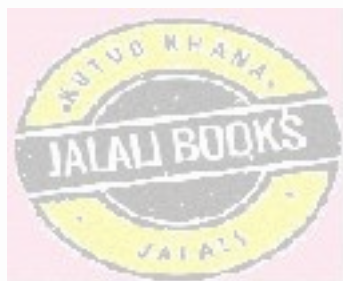
سردار نرنجن سنگھ کے آباؤ اجداد بھی ڈنگا میں رہتے آئے تھے۔ پہلے وہ لوگ بہت دولت مند نہیں تھے۔ پھر بھی اچھے کھاتے پیتے تھے۔ نرنجن سنگھ کے باپ کا دماغ بڑھاپے میں کچھ خراب ہو گیا تھا یا نہ معلوم اس کی عقل پر کیا پتھر پڑ گئے۔ اس پر سٹے میں قسمت آزمانے کا خبط سوار ہو گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سوا مکان کے قریب قریب ساری زمین رہن رکھی تھی۔ یہ بھی اتفاق کی بات تھی کہ وہ ریڑھی (ایک قسم کی گھوڑا گاڑی) سے گر کر مر گیا۔ ورنہ اس کی ہڈی ایسی مضبوط تھی کہ اس کے مرنے کی کوئی اُمید نہیں تھی اور زندہ رہ کر نہ معلوم اور کیا گل کھلاتا۔ صرف وہی ایک شخص تھا جس نے خاندان کی بہتری سے لاپروا ہو کر ان کی بربادی کے سامان پیدا کئے۔ ورنہ اس سے پہلے ان کے آباؤ اجداد اپنے سلجھے ہوئے خیالات پریم بھرے برتاؤ اور رکھ رکھاؤ کے لیے مسلمہ شہرت کے مالک تھے۔

دسویں پاس کرنے کے بعد نرنجن سنگھ فوج میں بھرتی ہو گیا۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں وہ بالکل نو عمر ہی تھا۔ ۱۹۱۶ء میں جبکہ اس کی عمر غالباً اٹھارہ برس کی تھی۔ وہ فوج میں سپاہی بھرتی ہوا اور ترقی کرتا ہوا حوالدار کے عہدے پر جا پہنچا۔ شاید اور زیادہ ترقی کرتا لیکن گاؤں سے پہلے تو باپ کی کارستانیوں کی خبریں آتی رہتی تھیں۔ پھر معلوم ہوا کہ اس کا باپ حادثے میں مر گیا ہے۔ عام حالات میں شاید اُسے کوئی فکر نہ ہوتی اور وہ بدستور ملازمت کرتا رہتا۔ لیکن گھر کے حالات بہت خراب ہو گئے تھے۔ بڑا بھائی کوئی تھا نہیں۔ چھوٹے تھے۔ اگرچہ نوجوان لیکن دُنیا کے نشیب و فراز سے قطعاً بے بہرہ۔ سر پر قرضے کا بوجھ، زمین

رہن ، خاندان کے افراد کے پیٹ پالنے کے ذرائع مخدوش ۔ چنانچہ اسے نوکری ترک کر کے واپس گاؤں میں آنا پڑا ۔ اس کے بعد ناموافق حالات کا مقابلہ جس دلیری اور تدبر کے ساتھ اس نے کیا وہ واقعی قابل ستائش ہے ۔ اس کے چھوٹے بھائی کم و بیش اپنے باپ پر گئے تھے ۔ اگر ساری ذمہ داری ان پر آن پڑتی تو پھر خاندان کی تباہی بھی یقینی تھی ۔

جند کور یعنی نرنجن سنگھ کی بیوی کا بھی اس کی کامیابی میں بہت بڑا ہاتھ تھا عام طور پر ذوق کی پاکیزگی ، اعلیٰ تعلیم ، ترقی یافتہ تہذیب اور تمدن کے گہوارے ہی میں پیدا ہوتی ہے لیکن دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض اوقات بعض لوگوں میں یہ وصف محض خدا داد ہوتا ہوتا ہے ۔ جند کور نہ صرف باذوق عورت تھی بلکہ بہت دُور اندیش ، سنجیدہ ، کفایت شعار ، صابر اور واہگورو اکال پر کھ پر بھروسہ رکھنے والی عورت تھی ۔ خود نرنجن سنگھ کو اس بات کا اعتراف تھا کہ اگر اس کی بیوی اس کی کمر ہمت نہ بندھائے رکھتی تو وہ شاید ہی اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کر سکتا ۔

جب دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہوا تو نرنجن سنگھ نے دُور اندیشی سے کام لے کر ٹوہ لگانی شروع کی کہ ٹھیکے کے کاموں میں خوب ہاتھ رنگے جا سکتے تھے ۔ ٹوہ لگاتے لگاتے اسے اپنے ایک پرانے انگریز افسر کا پتہ چل گیا جو ملازمت کے دنوں میں اس پر بہت مہربان تھا ۔ پتہ معلوم ہوتے ہی اس نے جرأت سے کام لے کر اس سے ملاقات کی صورت نکالی اور اسی افسر کی سفارشی چٹھی کی وجہ سے اس کا کام بن گیا ۔ ٹھیکے کے کاموں میں اسے اتنا روپیہ حاصل ہو گیا کہ سارا قرضہ ادا کر دینے کے بعد بھی اس کے پاس معقول رقم بچ گئی ۔ زمین ایک مرتبہ پھر اپنی ملکیت میں آ گئی اور اس کی آمدنی سے تو رہی سہی کسر بھی پوری ہو گئی ۔

یہ درست ہے کہ میاں بیوی پر اس انقلاب کا ردِ عمل ضرور ہوا ۔ جہاں تک جند کور کا تعلق تھا وہ دل ہی دل میں اس بات پر نازاں تھی ۔ لیکن اس کے اس وقار میں جو پہلے بھی موجود تھا ۔ لوگوں کو غرور کی ہلکی سی جھلک دکھائی دینے لگی تھی ۔ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ واقعی کچھ مغرور ہو گئی تھی یا لوگوں کا وہم ہی تھا ۔ اور تو اور اس نے سنداں کو منہ بولی بہن

بنالیا تھا۔ حالانکہ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ لیکن چند کور کے دل میں یہی خیال تھا کہ سنداں ہے وفا شعار۔ سنداں واقعی اس کی وفادار بن کر رہی۔ لیکن جب ان کے پاس اتنا روپیہ آگیا اور ان کے حالات اس قدر اچھے ہو گئے تو سنداں کی قوت برداشت سے یہ بات باہر ہو گئی۔ غالباً اس حسد کا سبب ان کی اپنی قابلِ رحم حالت تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ سنداں کا خاندان دولت کے لحاظ سے کبھی اونچا نہیں سمجھا گیا تھا۔ اس کا ڈاکو خاوند اگر ایک طرف ہانڈیاں بھر بھر کر روپیہ لاتا تھا تو مٹکے بھر بھر کے خرچ بھی کرتا تھا اور خرچ بھی کہاں ہوتا تھا۔ مقدمہ بازی پر۔ جو تھوڑا بہت روپیہ بچتا۔ شراب اور عورتوں پر خرچ ہو جاتا۔

جہاں تک نرنجن سنگھ کا تعلق تھا۔ اس کی طبیعت میں خاصا فرق پیدا ہو گیا تھا یعنی اب وہ لوگوں سے کہتا کہ اگر میں نہ ہوتا ہمارے خاندان میں کوئی فرد ایسا نہیں تھا کہ گھر کی گرتی دیواروں کی مرمت بھی کروا دیتا۔ بات بات میں کہتا۔ میں کسی کی کیا پرواکرتا ہوں۔ لوگ اسے غرور کی علامت گردانتے تھے لیکن روپے میں بڑی قوت ہے۔ اس کے روزِ روشن کی طرح عیاں تکبر کے باوجود اس کی خوشامد کرتے تھے اور یہ اس کے کیریکٹر کا کمزور پہلو تھا کہ خوشامدانہ لفظوں کی مٹھاس میں وہ اس مکھی کی مانند بے بس ہو جاتا تھا جو اتفاق سے کھانڈ کے شیرے میں جا گرے۔ ان چند کمزور پہلوؤں کے باوجود وہ ایک جہاندیدہ اور دُور اندیش شخص تھا۔ اس نے عملی زندگی سے سبق لئے تھے یوں بھی وہ ایک سرے ہی سے اُجڈ اور اُن گھڑ انسان نہیں تھا۔ اسی لئے اس نے بیوی کا کہنا مان کر اپنی بیٹی سرتوں کو شہر میں پھوپھی کے پاس بھیج دیا تھا تاکہ وہ تھوڑا بہت پڑھ لکھ جائے۔

اس کے بھائی تو بالکل نکمے تھے۔ اس لئے ان میں سے ہر ایک کو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے اس کا منہ دیکھنا پڑتا تھا۔ بعض اوقات وہ جھلا کر ان پر برس پڑتا تھا لیکن خاندان کے سب افراد کو سمیٹے رکھنے میں اس کی ذہنیت بالکل ہندوؤں کی سی تھی۔ اس کے دو لڑکے پُورن سنگھ اور کرتار سنگھ سرتن کور سے بالترتیب دو اور ساڑھے تین برس بڑے تھے۔ سرتوں کی عمر بھی شادی کے قابل ہو چکی تھی۔ لیکن عام

طور پر دیکھا گیا ہے کہ پنجاب کے جاٹوں کی لڑکیاں بائیس بلکہ چوبیس چوبیس برس تک بھی بیاہی جاتی ہیں۔ اس لئے بعض اوقات میاں بیوی کے درمیان اس موضوع پر گفتگو تو چھڑ جاتی لیکن تان اس بات پر ٹوٹتی تھی کہ لڑکی سے پہلے اس کے دونوں بڑے بھائیوں کی شادیاں بھی ہو جانی چاہئیں۔ لڑکوں کی بابت پہلے جو گھرانے ان کی نگاہ میں تھے۔ اب وہ دل سے اتر گئے تھے اور نئے گھرانوں کی تلاش کے لیے آخر کچھ سمے تو درکار تھا ہی۔

متذکرہ بالا دونوں نوجوان، یعنی پورن سنگھ اور کرنار سنگھ عیش و عشرت کی طرف راغب ہو چکے تھے۔ لیکن گانٹھ کے پکے تھے۔ روپے پیسے کے معاملے میں انہیں اُلو نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ اپنی دانست میں وہ بدمعاش بھی بنتے تھے۔ یوں دیکھنے میں تنومند نوجوان تھے۔ گاؤں والوں کے دلوں پر ان کی جسمانی طاقت اور دولت کا ملا جلا رعب بھی تھا۔ لیکن درحقیقت وہ صحیح معنوں میں بدمعاش نہیں تھے۔ پڑوس کے گاؤں کے کھیتوں میں سے گنّے یا بھٹّے یا خربوزے چرا لینا تو بدمعاشی میں شامل نہیں ہو سکتا۔ ایک مرتبہ انہوں نے بڑا میدان مارا تو قریبی گاؤں کے ایک بڑے زمیندار کے دو مرغے چرا کر کھا گئے۔ اس پر مقدمہ بازی بھی ہوئی۔ جس میں وہ دونوں بری ہو گئے تھے اور اصل معاملہ تو یہ تھا کہ ابھی وہ نوعمر بھی تھے۔ اپنے گاؤں کے علاوہ دنیا کا کوئی اور گوشہ دیکھنے کا موقع ہی نہ ملا تھا اور اپنے گاؤں کے اصلی بدمعاشوں سے ٹکر بھی نہ لی تھی۔ اس لئے ابھی تو دور کے ڈھول سہانے والا معاملہ ہی تھا اور پھر اب تو بالا سنگھ جیسا خاندانی لفنگا بھی گاؤں میں آن پہنچا تھا۔

صبح کا وقت تھا۔ جند کور اپنے مکان کے کشادہ صحن میں بنے ہوئے باورچی خانے میں بیٹھی پراٹھے پکا رہی تھی۔

ان کا مکان بھی گاؤں بھر کے بڑے مکانوں میں سے تھا۔ ایک تو ان کا کنبہ ہی بہت بڑا تھا۔ تین کنبوں نے ایک ہی مکان بانٹ لیا تھا۔ یعنی نرنجن سنگھ اور اس کے دونوں چھوٹے بھائیوں کے بال بچے بھی وہیں پر رہتے تھے۔ سارا مکان کچھ اس طریقے سے بانٹا گیا تھا کہ ہر حصّہ علیحدہ مکان دکھائی دیتا تھا۔ البتہ صحن سب کا مشترک

ہی تھا۔ ہر ایک کا باورچی خانہ بھی علیحدہ تھا۔ باورچی خانے سے مراد صحن میں بنے ہوئے تین علیحدہ علیحدہ چبوترے جن پر چھت نہیں تھی۔ ہر چبوترے پر دو دو چولہے اور ایک زمین میں کھدی ہوئی انگیٹھی جس میں دودھ گرم کرنے کے لیے رکھ دیا جاتا تھا چبوترے، چولہے اور ان کے درمیان بنی ہوئی چھوٹی چھوٹی کچی دیواریں ہر وقت گوبر سے لپی پتی بہت خوبصورت دکھائی دیتی تھیں۔ چھت پر چڑھنے کے لیے چوڑے چوڑے تختوں کی دو سیڑھیاں۔ ایک تو زرجن سنگھ کے خاندان کے لیے مخصوص تھی۔ دوسری دونوں چھوٹے بھائیوں کے خاندانوں کے لیے۔

پہلے صحن کے ایک کونے میں چرخ کھڑی والا تنگ دہانے کا کنواں بنا تھا جس میں ایک مرتبہ ایک بچہ گر کر ڈوب مرا تھا۔ اسی لیے روپیہ حاصل ہونے پر زرجن سنگھ نے صحن کے بیچوں بیچ دستی نل لگوا لیا۔ اسی نل کی برکت سے باہر کے لوگ بھی پانی بھرنے کے لیے چلے آتے تھے۔ اس طرح ان کے صحن میں خاصی رونق ہو جایا کرتی تھی۔

پُورن سنگھ اور کرتار سنگھ اپنے اپنے چولہے کے آگے بیویوں کے پاس بیٹھے پراٹھے کھا رہے تھے۔ صبح کا ناشتہ جسے "چھاہ ویلا" کہا جاتا ہے، کرنے کے بعد وہ لوگ کھیتوں میں کام کرنے کے لیے چل دیتے تھے۔

جند کور کے قریب اس کے مرنوں سے چھوٹے بچے یعنی ایک لڑکا اور ایک لڑکی بیٹھے کھانا کھا رہے تھے یعنی وہی چھاہ ویلا۔ دونوں موٹے تازے بچے اپنی بھاری بھرکم ماں کے گرد بیٹھے ہوئے مرغی کے چوزوں کی مانند دکھائی دیتے۔ جند کور کا جسم پہلے تو بہت اچھا تھا۔ لیکن اب آرام طلبی اور دلجمعی کی بدولت وہ خوب موٹی ہو گئی تھی موٹاپے کے باوجود وہ کمزور عورت نہیں تھی۔ اس نے چولہے میں خشک اُپلوں کا ایک بڑا سا ٹکڑا رکھتے ہوئے بچوں سے پوچھا۔

"باپو (باپ) کہاں ہے تمہارا؟"

"بے بے تمہیں معلوم نہیں ——— لاؤ ہی ——— روز تو گوردوارے جاتے ہیں۔"

بچے کی تیز آواز سن کر اس نے پیار سے کنگھی باندھ کر لڑکے کی طرف دیکھ کر

کہا: "دیکھ لو اس لڑکے کو ابھی سے مجھے انگوٹھا دکھانے لگا ہے۔"

جند کور کے سامنے کے اوپر والے دانت قدرے اوپر کو اٹھے ہوئے جو بھدے معلوم نہیں ہوتے تھے محض منہ بند کرنے کے لیے اس کے اوپر والے دانت ہونٹ کو کھینچ کر نچلے ہونٹ سے ملنا پڑتا تھا اور اس کھنچاوٹ کا اثر اس کی خوبصورت باریک ناک پر بھی پڑتا۔ چنانچہ بات چیت کرتے وقت اس کی ناک کی نوک بھی جنبش کرنے لگتی تھی۔ دیکھنے والا ذرا غور کرے تو یہ چیز خاصی مضحکہ خیز دکھائی دیتی تھی۔

بظاہر وہ روٹیاں پکا رہی تھی۔ لیکن اس کے دماغ میں کئی تفکرات سر اٹھائے ہوئے تھے۔ دفعتہً اُسے یاد آیا کہ دودھ دوہنے کے بعد بچھڑا چھوڑ کر وہ اسے پھر سے باندھنا بھول گئی تھی اب بچھڑا گائے کے تھنوں پر منہ مارے جا رہا ہوگا اور وہ گائے اچھل کود مچا رکھی ہوگی۔ بچے روٹی کھا ہی رہے تھے۔ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا "سرتوں! او بیٹا سرتوں!!"

چہیتی بیٹی سرتوں کو بھی وہ بیٹا ہی کہتی تھی۔

ایک بچے نے جواب دیا "ابھی تو وہ سو کر بھی نہیں اٹھی۔"

قریب والے چوکے سے کرتار سنگھ کھانا کھا کر اٹھا اور پاؤں سے جوتوں کو سیدھا کرتے ہوئے بڑبڑایا "لاڈ لو ابھی سو ہی رہی ہے۔ دھوپ تو دیکھو کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔"

اس بات سے گویا جند کور کے دل کو چوٹ سی لگی "ہائے یوں تو نہ کہو بیٹا بچاری بہت کام کرتی ہے۔ میں تو سر شام ہی مارے گرمی کے چھت پر چڑھ جاتی ہوں اور یہ بچاری سرتی گھر کا سارا کام کرتی ہے۔ کھانا پکانا، پھر سب کچھ چھت پر لے جا کر ہمیں کھلانا، جھوٹے برتن نیچے لا کر ایک ایک برتن کو مانجھنا۔ دودھ کو جامن لگانا یہاں تک کہ چوکا بھی رات ہی کو پوت دیتی ہے تاکہ صبح تک سوکھ جائے۔ اس کے علاوہ بیسیوں چھوٹے موٹے کام نبٹانے میں آدھی رات گزر جاتی ہے۔ کئی بار تو میں خود سو جاتی ہوں اور مجھے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ بچاری کب آئی۔ ابھی خیر سے بچوں کو پالو پوسو گے تو پھر تمہیں ان باتوں کا علم ہوگا۔

کرتار سنگھ کی بیوی گوردیپ کور نے چھوٹے بچے کے منہ میں نوالہ ٹھونستے ہوئے خاوند سے مخاطب ہو کر کہا: "اچھا اب جاؤ ناکیوں چھوٹی سی بات کہہ کر مفت میں...... ہاں اور کیا۔"

گوردیپ کور خاصی بدمزاج عورت تھی۔ خصوصاً سرنوں سے تو اسے چڑ سی تھی۔ نہ معلوم اسے اپنے کنوارپن کے دن یاد آتے تھے۔ جب وہ آزاد چڑیا کی طرح گلیوں میں پھدکتی پھرتی تھی۔ پابندی اب بھی اس پر کچھ نہ تھی۔ لیکن انہیں زنجی سنگھ کے ماتحت رہنا پڑتا تھا۔ شاید اس لئے دل کی تلخی اور بھی بڑھ گئی تھی۔ جند کور کو ہمیشہ سے گوردیپ کی یہ تلخ مزاجی پسند نہیں تھی۔ لیکن ہمیشہ کی طرح اس نے درگزر سے کام لیا۔

پورن سنگھ اور کرتار سنگھ کھانا کھا کر کندھوں پر انگوچھے ڈالے اور پھر لہراتے ہوئے تہبندوں کو سنوارتے ہوئے گھر سے باہر نکل گئے۔ جند کور نے کھانا ختم کرتے ہوئے لڑکے سے کہا: "اب بھاگ کر جا اور بچھڑے کو باندھ کر پھر اپنے باپو کو بلا لا۔"

"نہیں میں اتی دور گوردوارے تک جاؤں اب ہے" لڑکے نے کچھ بسور کر اور کچھ آنکھیں دکھا کر کہا۔

"گوردوارے میں اب تک کیا کرتے ہوں گے۔ وہیں پیپل کے نیچے کھڑے گپ ہانک رہے ہوں گے کسی سے، جا میرا بیٹا....... واپس آئے گا تو پیسہ دوں گی۔"

لڑکا پگڑی میں سے باہر کو نکلے ہوئے بالوں کو انگلی سے اندر کی طرف ٹھونستا ہوا بھاگا طویلے کی طرف۔ پیسے کی رشوت کا اس کے دل پر خوشگوار اثر ہوا تھا۔

دو گھڑی بعد جب پورن سنگھ کی بیوی نل کا دستہ ہلا ہلا کر پانی بھرنے میں مصروف تھی۔ بالا سنگھ صحن میں نمودار ہوا۔ بدلا ہوا نقشہ اور اجنبی صورتیں دیکھ کر وہ ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا اور نظروں میں سب چیزوں کا جائزہ لینے لگا۔

اس وقت بالا سنگھ نے اُجلے کپڑے پہن رکھے تھے۔ دُھوبی کا دھلا ہوا کرتا

جو اس کی رانوں کے گھٹنوں تک پہنچتا تھا۔ کرتے کے بٹن چھاتی کے ایک پہلو پر تھے۔ سب بٹن اس نے جان بوجھ کر نہیں لگائے تھے۔ اس لئے گریبان کا ایک سرا نیچے کی طرف الٹ گیا تھا اور چھاتی کے عریاں حصے پر اُگے ہوئے بال دکھائی دے رہے تھے۔ کمر کے گرد سلک کا تہبند۔ جو صبح کی نرم دھوپ میں جھلملاتا ہوا آنکھوں کو بہت بھلا معلوم ہوتا تھا۔ پیروں اور ٹخنوں پر جمی ہوئی گرد اس نے خوب اچھی طرح دھو ڈالی تھی۔ پیچھے کی طرف گھومی ہوئی مونچھیں الگ اپنی بہار دکھا رہی تھیں گلے میں سونے کے کنٹھے کے اوپر سُرخ سُرخ رنگ کا جاپانی ریشم کا رومال لہرا رہا تھا۔ داہنے ہاتھ میں سری حضور صاحب حیدر آباد دکن کا لوہے کا کڑا جس پر اس مقام کے نشان کے طور پر تین چھوٹے چھوٹے گول نشان بنے ہوئے تھے۔ اس بالشت بھر اونچی گردن پر تربوز کا سا سر منہ کا چوڑا دہانہ ذرا سا کھلا ہوا تھا۔ کلف لگی رنگین پگڑی کے اٹھے ہوئے شملے کی وجہ سے اس کا قد اور بھی اونچا دکھائی دے رہا تھا۔ اس بیچ ویچ کے ساتھ اس نے پہلے تو اپنی نہایت چمکدار اور متجسس آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر سیٹی کی سی آواز سے اگلے دانتوں کی دراڑ میں سے لعاب دہن کی پچکاری چھوڑی اور ٹھوڑی پر اُگے ہوئے بالوں پر اٹکے ہوئے چند بلبلوں کو انگوچھے سے پونچھا۔ اپنی لمبی لمبی ٹانگوں کو حرکت دی۔ اور دو چار ڈگ بھر کر جند کور کے قریب جا کھڑا ہوا۔ اس نے نظر اٹھا کر بالا سنگھ کی طرف دیکھا لیکن غالباً پہچانا نہیں۔ بالا سنگھ نے بھاری بھرکم آواز میں کہا۔

"چاچی متھا ٹیکتا ہوں۔"

اس قطعاً بدلی ہوئی صورت کو پہچاننا جند کور کے لیے یقیناً بہت دشوار تھا۔ لیکن اس نے قیاس سے سمجھ لیا کہ ہو نہ ہو یہ بالا سنگھ ہے۔ سندراں بھی ڈھنڈورہ پیٹا کرتی تھی کہ بالا سنگھ آنے والا ہے اور پھر اس کے چاچی کہنے سے اُسے اور یقین آ گیا۔ اس نے قدرے حیرت اور مسرت بھری آواز میں پوچھا "ارے ...... تو بالی تو نہیں اپنا؟" بالا سنگھ کی باچھیں چر گئیں "ہاں چاچی میں بالی ہی ہوں۔"

جند کور پیڑھی میں دھنسی بیٹھی تھی۔ جلدی میں اُٹھ نہ سکی ہنستے ہوئے بولی۔

"ارے سر تو نیچے کر...... اب تو پورا اونٹ ہو گیا ہے۔"

پالا سنگھ نے سر نیچے کر دیا۔ جنداں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"ارے کب آیا تُو؟"

"کل شام۔"

"ہائے ہائے...... کتنے برس ہو گئے تجھے جب تُو...."

یہ کہہ کر اس نے لمحہ بھر کو حساب لگایا۔

"آٹھ نو برس ہو گئے ہیں۔"

پالا سنگھ سر جھکا کر مسکرانے لگا۔

"شکر ہے بھئی تو واپس آ گیا۔ اپنی ماں کی حالت کچھ مت پوچھ۔ بچاری مچھلی کی طرح تڑپا کرتی تھی۔ مجھے تو وہ دن کل کی طرح یاد ہے۔ جب تو پہلے پہل غائب ہوا تھا یہاں سے۔ سنداں تو باؤلی ہو گئی تھی۔ کئی آدمی...... کرتار کا باپو وغیرہ مل جل کر گئے۔ شہر کا چپہ چپہ چھان مارا لیکن نہ معلوم تو کہاں کو چل دیا تھا...... اور تیری ماں ہو بس کیا بتاؤں۔ بچاری پر اتنے دُکھ پڑے اور پھر تیرے جانے سے تو اس کی کمر ہی ٹوٹ گئی...... میں سارا سارا دن بیٹھی اُسے دلاسا دیتی..... لیکن اولاد کی محبت ہو...."

یہ کہتے کہتے جنداں کی آواز بھر آ گئی "ہائے واہگورو اکال پرکھ نے بھی کیا کھیل رچایا ہے ماں باپ کے دل میں اولاد کی اتنی محبت اور اولاد کے دل میں کچھ بھی نہیں...."

یہ کہہ کر جنداں نے پُر نم آنکھیں آنچل سے صاف کیں۔

اس کی باتیں سن کر اس کی دونوں دیورانیاں بھی قریب آ کھڑی ہوئیں۔ جنداں انہیں ہاتھوں سے بھاؤ بتا بتا کر کہنے لگی۔

"اری وہ ہے نا اپنی سنداں...... یہ اسی کا لڑکا ہے بہت چھوٹا سا تھا۔ ہمارے ہاتھوں میں پلا ہے یہیں کھیلا کودا۔ پھر نہ معلوم کسی کے بہکانے سے بھاگ کھڑا ہوا یہاں سے کسی کو کچھ پتہ نہ چلا کہ آخر گیا کہاں...... کئی برس بعد اس نے ماں کو خط لکھا تو پھر

اس بیچاری کا دل دھکانے لگا۔ اس نے تو رو رو کے اپنی آنکھیں خراب کر لیں۔"

پالا سنگھ کو اپنے بھاگ جانے کا قصہ بار بار دہرائے جانے پر کوفت محسوس ہونے لگی تھی۔ لیکن اور سب لوگوں کے لیے تو یہ بڑی اہم بات تھی وہ اس کا ذکر کیے بغیر کیوں کر رہتے۔

پھر سوائے جنداں کے سب لوگ اپنے اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔ بھلا ان نئی عورتوں کو پالا سنگھ سے دلچسپی ہی کیا ہو سکتی تھی۔ انہیں یہ بھی خیال نہیں تھا کہ کبھی اس کا نام ہی سنا ہو۔

جنداں پالا سنگھ سے دنیا بھر کی باتیں کرتی رہی۔ ابھی اسے چند پراٹھے پکانے تھے دھوپ ذرا تیز ہو گئی تھی۔ جنداں کے مشورے سے بس نے صحن سے ایک بڑی سی چارپائی اس انداز سے کھڑی کر دی تاکہ دھوپ ان پر نہ آئے۔

"پالی بیٹا تم پیار میں کیوں نہیں بیٹھ جاتے۔ یہاں تمہیں تکلیف ہو رہی ہو گی لو میں پراٹھا رکابی میں رکھے دیتی ہوں۔ وہاں بیٹھ کے کھاؤ میں ابھی آتی ہوں۔"

پالا سنگھ چولہا دکھلی کو اوندھا کے اس پر بیٹھا تھا۔ بولا "نہیں مجھ پر دھوپ کا اثر نہیں ہوتا۔ میں بس تمہارے قریب ہی بیٹھوں گا۔"

"بیٹا دھوپ ہے نا" جنداں نے پچکار کر کہا۔

"کچھ پروا نہیں۔"

جنداں رکابی میں پراٹھا رکھ کر کٹوری میں دہی ڈالنے لگی۔

"میں روٹی بھی نہیں کھاؤں گا۔"

"کیوں؟"

"کھا کے آیا ہوں۔"

"تو کیا ہوا۔"

"نہیں چاچی پیٹ بھرا ہوا ہے نا۔"

"ارے ہٹ نا۔"

"پھر سہی کسی دن۔"
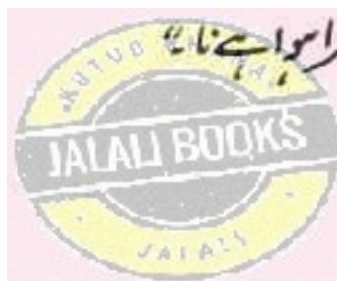
"اچھا بک نہیں ..... واہ ایسا لمبا چوڑا جوان اور ایک پراٹھے سے ڈرتا ہے۔"

بالا سنگھ چپ رہا۔

"جوتا اُتار کر یہیں میرے قریب سائے میں آجا۔"

مزید انکار فضول سمجھ کر بالا سنگھ اٹھا۔ جوتا اتار کر اس نے چوکے میں پاؤں رکھا ہی تھا کہ اس کی نظر اُوپر اٹھ گئی۔ سیڑھیوں پر سے ایک نوجوان لڑکی اتر رہی تھی۔

وہ لڑکی سرتوں ہی تھی۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو دھوپ نکل چکی تھی۔ گہری نیند میں اسے کچھ پتہ ہی نہ چلا۔ عام طور پر ماں کی بہ نسبت ذرا دیر ہی میں اُٹھتی تھی۔ لیکن اس روز تو غضب ہی ہو گیا۔ رات کے کام کی تھکاوٹ اور بھر جوانی کی نیند۔ اس کے گھنے بال بے ترتیب ہو رہے تھے۔ سر ننگا تھا۔ چندریا پیچھے پیچھے سیڑھیوں کے تختوں پر گھسٹتی چلی آ رہی تھی۔

بالا سنگھ نے ابھی تک جنداں سے سرتوں کی بابت کچھ دریافت کرنا مناسب نہ سمجھا لیکن اس کی آنکھیں سب سے زیادہ اسی کی متلاشی تھیں۔ وہ اسے کس طرح پہچان سکتا تھا۔ بچپن کی بہ نسبت زمین و آسمان کا فرق پیدا ہو چکا تھا لیکن سیڑھیوں پر سے اُترنے والی نوجوان لڑکی کو دیکھ کر وہ چونکا ہو گیا۔ آخر ان کے ہاں اور کون لڑکی ہو سکتی تھی۔

جنداں نے بالا سنگھ کو اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پایا تو مسکرا کر بولی۔

"یہ سرتی ہے تمہیں یاد ہو یا نہ ہو تم دونوں ساتھ ساتھ کھیلا کرتے تھے ..... اب دیکھ لو تم بڑے ہو گئے ہو تو یہ بڑی ہو گئی ہے۔"

اتنے میں سرتوں قریب آگئی۔ اب بالا سنگھ کو اس کی صورت اچھی طرح دیکھنے کا موقع ملا۔ دھوپ کی وجہ سے ابھی تک اس کی آنکھیں اچھی طرح نہ کھلی تھیں۔ وہ گورے گورے ہاتھوں سے مل رہی تھی۔ اس کے گھنے، لمبے اور بوجھل بال دونوں کنپٹیوں سے نیچے کی طرف ڈھلکے جا رہے تھے۔ چہرہ بالا سنگھ کے خوابوں سے کم حسین نہیں تھا۔ پاؤں سے سر تک بلند و بالا اس کی شخصیت میں عجیب جاذبیت تھی۔ ڈھیلی ڈھالی شلوار کے پائنچے اس کی ایڑیوں میں گھسٹ رہے تھے باریک قمیض میں اس کی نازک کمر کے مدھم لیکن لرزاں خطوط دکھائی دے رہے تھے۔ اس کی گول چھاتیاں باغیانہ انداز سے پیٹ اور پسلیوں کی

سطح سے کہیں آگے کو بڑھ آئی تھیں۔ تیز دھوپ میں اس کے گلے میں لاپرواہی سے لپٹی ہوئی دھانی رنگ کی چندریا کا جھلملاتا ہوا رنگین عکس اس کی گرم گردن اور شفاف سینہ کے اوپر والے حصے کی جلد سے گھل مل کر عجب دلفریب کیفیت پیدا کر رہا تھا۔

یہ درست ہے کہ جتنے عرصے تک بالا سنگھ پردیس میں رہا۔ اسے اس کا خیال نہیں آیا وہ تقریباً اس کا نام بھی بھول چکا تھا۔ جب اس نے واپس آنے کا ارادہ کیا تو اس کی یاد نہایت سرسری طور پر تازہ ہوئی تھی۔ لیکن جب وہ بابے کی سمادھ کے قریب پہنچا اور اسے اپنے سامنے اپنا گاؤں اور جانی پہچانی جگہیں یاد آئیں تو پھر دیگر چیزوں کے ساتھ ساتھ سرتوں کی خیالی صورت بھی اُبھرنے لگی جو بالآخر اُبھر کر باقی ساری چیزوں پر حاوی ہو گئی۔

عورتوں کے معاملے میں وہ کورا نہیں تھا۔ وہ کئی بازاری عورتوں سے تعلقات قائم کر چکا تھا۔ لڑائی شروع ہو جانے پر اور کچھ عرصے بعد کلکتے میں امریکنوں کی آمد کے باعث وہاں ملی جلی نسل کی لڑکیوں کی بھی بھرمار ہو گئی تھی۔ لیکن جب اس نے سرتوں کو سرتاپا دیکھ لیا تو اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ نیند کی ماتی۔ کچھ نیند کی مدہوشی اور کچھ حسن کے نشے میں لڑکھڑاتی ہوئی موہنی صورت والی سرتوں کی یہ جیتی جاگتی مورت اس کے دل میں اُترتی چلی گئی اور اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ اپنی انگلیوں کی گرفت میں نوالہ لرزتا ہوا محسوس کیا۔ جنداں نے اسے آنکھیں ملتے دیکھ کر کہا "اری اب آنکھیں کھول بھی لے۔"

"بے بے یہ تمہاری کیا عادت ہے" سرتوں کے نازک ہونٹ نہایت حسین انداز میں سکوڑے گئے۔

"کیوں بیٹا کیا ہے۔"

"مجھے جلدی سے جگا دیا کرو نا....."

اس کی شلوار کا رنگین آزار بند لٹک کر جھولنے لگا تھا۔

"آزار بند تو اڑس لے۔ ہائے اتنی بڑی ہو گئی لیکن......"

اس نے آزار بند اوپر اٹھا کر اڑس لیا۔

"مفت میں میرا جی خراب ہوتا ہے۔ دھوپ تو دیکھو....."

"بھئی ہم تو اسی لیے نہیں جگاتے کہ رات کی تھکاوٹ ہو گی۔ آرام کر لینے دو۔"

"پر دھوپ چڑھ آئے تو میرا دل ڈوبنے لگتا ہے۔"

"یہ کیا بحث چھیڑی ہے تو نے...... ذرا دیکھ تو سہی کہ کون آیا ہے۔"

سرتوں نے آنکھوں کے آگے سے ہاتھ اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔

"کون آیا ہے؟"

پھر اس کی نظریں پالا سنگھ کی نظروں سے ملیں تو وہ اسے پہچان نہ سکی اور ذہن پر زور دینے لگی۔

جنداں منہ سے کچھ نہ بولی لیکن اس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتی رہی۔

"کیوں پہچانا نا؟"

سرتوں نے اپنے سامنے ایک لمبا تڑنگا نوجوان بیٹھا پایا۔ اس کے بڑے بڑے جانگلیوں کے سے ہاتھ۔ منہ کا دہانہ بہت پھیلا ہوا۔ اس کی آنکھوں میں وحشیانہ چمک تھی۔ باچھوں سے تندہی اور حیوانیت ٹپکتی تھی۔ ذہن پر زور دینے کے باوجود کچھ یاد نہ آیا وہ قطعاً بھول گئی تھی کہ یہی وہ شخص تھا، جو بچپن میں اس کے خوبصورت اور نرم بالوں کو دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑ کر اسے بڑی بے رحمی سے اپنی طرف کھینچ کر اپنا متعفن منہ اس کے چنبیلی کی کلی جیسے اُجلے ہونٹوں پر جما دیا کرتا تھا۔ غیر شعوری طور پر اسے محض ایک بے پناہ اور منہ توڑ قوت ——— ناقابلِ مدافعت ظالمانہ گرفت کا مبہم احساس سا پیدا ہو کر رہ گیا۔

"یہ پالی ہے۔"

سرتوں کو پالی کا نام بھی اچھی طرح یاد نہیں تھا۔ وہ یہ پوچھنے ہی کو تھی کہ پالی کون! لیکن پھر اسے یاد آیا کہ سنداں کے گم شدہ لڑکے کا نام پالی تھا۔ اُسے خود یہ بات واضح طور پر یاد نہیں تھی کہ وہ پالی کے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔ اور ان دونوں کا آپس میں دوستانہ تھا۔ وہ پالا سنگھ سے چار برس چھوٹی تھی۔ اس لئے اسے تفصیلات یاد نہیں تھیں۔ بار بار اس کی باتیں سن سن کر اسے لوگوں کی زبانی تفصیلات کا پتہ چل گیا تھا اور اس طرح وہ یہ بھی سمجھنے لگی تھی کہ پالی سے واقعی اس کا بہت نزدیکی رشتہ تھا۔ نہ اس کے ذہن میں اس کی صورت کا کوئی تصور تھا۔ نہ اس کی عادات و خصائل کا علم۔ محض دوسروں کی زبانی سنی سنائی

باتوں پر اس کے دل میں بھی کبھی کبھار اس کے لیے اشتیاق پیدا ہو جاتا اور وہ سنداں کے گلے سے لپٹ کر کہتی "چاچی تم یہاں بلا لو نا پالی کو......" اگر وہ مڈل پاس کرنے کے لیے شہر میں نہ جاتی تو شاید اور زیادہ باتیں سن کر اس کے دل میں بھی پالی سے ملنے کا بہت زیادہ اشتیاق پیدا ہو جاتا۔ خیر ماں کی زبانی یہ معلوم کر کے کہ سامنے بیٹھا ہوا دیو پالی ہے۔ اس نے شہری لڑکیوں کے مخصوص انداز میں دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا:

"بھرا (بھائی یا بھیا) ست سری اکال۔"

بھرا (بھیا) کا لفظ سن کر پالا سنگھ چونکا۔

"ست سری اکال" اس نے جواب دیا۔

اس کی آواز اس قدر بھاری گونج دار تھی کہ باوجود مدھم لہجے کے سرتوں کو یوں محسوس ہوا جیسے تہ در تہ بادلوں میں چھپا ہوا کوئی تند خو بادل گڑگڑا یا ہو۔

پالا سنگھ کی آواز میں ایک خاص وحشیانہ پن تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے اس کی بھاری بھرکم آواز حلق سے نکلنے سے پہلے اس کے چوڑے سینہ میں کسی پاگل حیوان کی سی بیتابی کے ساتھ گونجتی رہتی ہے۔

"کب آئے تھے بھیا۔"

"کل شام۔"

"پھر سیدھے یہاں ہمیں ملنے کے لیے کیوں نہ آئے۔"

یہ سن کر پالا سنگھ کا دل ناچ اٹھا۔ باچھیں کھل گئیں۔

"میں...... او...... اوہم...... جرا۔"

"تھکا ہوا تھا......" جنداں آڑے آئی۔

"ہاں...... کچھ...... پہلے میں گھر پر گیا۔ میں نے سوچا ماں بیچاری انتظار کرتی ہو گی اور پھر اس قدر طویل عرصے کے بعد ملے تھے۔ باتیں جو چھڑیں تو ختم ہونے میں ہی نہ آئیں...... رات زیادہ ہو گئی...... بس۔"

پالا سنگھ نے سرتوں کے اس سوال کو بہت اہمیت دے دی۔ فوراً اس کے پاس نہ پہنچنے پر وہ اپنے آپ کو مجرم سمجھنے لگا۔ چنانچہ اپنی صفائی میں اتنا لمبا بیان دے مارا اور
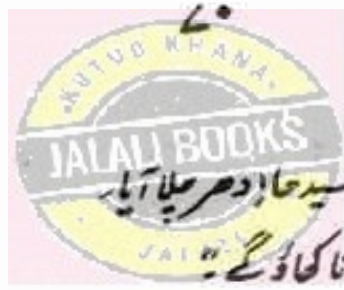
پھر یہ بھی کہہ دیا۔

"بس صبح اُٹھا..... اور سیدھا ادھر چلا آیا۔"

"پالی بیٹا اچار لے لو نا کھاؤ گے۔"

"ہاں اگر۔" اب پالا سنگھ کے حواس قائم نہیں تھے۔

"جا بیٹی بھاگ کے اندر سے اچار لے آ بھیا کے لیے۔"

پھر پالا سنگھ، سرتوں کو جلدی جلدی قدم اٹھاتے ہوئے اندر جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

"چلو..... پالی آؤ ہم بھی لسیار میں چل کر بیٹھیں۔"

جب پالا سنگھ پراٹھے کی رکابی ہاتھ میں تھامے لسیار کی طرف بڑھ رہا تھا تو سرتوں اندر سے اچار لے کر نکلی اسے آتا دیکھ کر وہ ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ اسے پالا سنگھ کی بچپن کی صورت یاد نہیں آ رہی تھی اور اب اسے وہ شخص اجنبی سا دکھائی دے رہا تھا۔ یہ اجنبیت دل کی نہیں محض صورت کی تھی۔ وہ یوں محسوس کر رہی تھی کہ اُسے اس صورت سے مانوس ہونا پڑے گا۔

جب وہ دونوں قریب قریب کھڑے تھے تو باوجودیکہ سرتوں کا جسم بھی قدوقامت کے لحاظ سے کچھ کم نہ تھا۔ لیکن شاید حُسنِ صورت میں تضاد کے باعث جن اور پری کا جوڑا دکھائی دیتے تھے۔ سرتوں نے ذہانت ایک تو اپنی ماں سے وراثت میں پائی تھی دوسرے تھوڑی بہت تعلیم اور شہری لڑکیوں کی صحبت کے سبب اس کا دماغ، سوچنے کا طریقہ اور نشست و برخاست کا انداز دیہات کی لڑکیوں سے مختلف ہو گیا تھا لیکن جہاں تک جسم کی بناوٹ مضبوطی اور طاقت کا تعلق تھا وہ ان سے مختلف قطعاً نہیں تھی۔

پالا سنگھ چارپائی پر بیٹھ گیا۔ پیچھے پیچھے جنداں چلی آ رہی تھی۔ سرتوں نے ہنس کر کہا۔

"بھیا اب تو تم بہت بڑے ہو گئے ہو۔ اچا بلے بلے گاؤں میں کوئی اور شخص بھی بھیا کے برابر اُونچا ہو گا؟"

"واہ پگلی..... اکبرا دن ہے۔ اسی لیے گاؤں بھر میں سب سے اُونچا
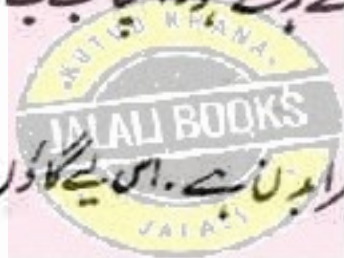
معلوم ہوتا ہے۔ جب موٹا ہو جائے گا تو پھر اس طرح اونٹ کا اونٹ دکھائی نہیں دے گا

سرتوں کھکھلا کر ہنس پڑی۔ جب وہ ہنستی تھی تو اس کے چکنے رخساروں کا گوشت ایک جگہ اُبھر آتا تھا اور وہ سیب کی مانند چمکنے لگتے ہیں۔

"نہیں پھر بھی...... بے بے بھیا موٹا نہیں تو ایسا دُبلا پتلا بھی تو نہیں... ٹھیک ہی تو ہے"

"اپنے باپ پر گیا ہے...... اور ماں بھی کیا کم ہے۔ آخر تو نے یہ کیا بات چھیڑ دی کوئی اور بات کرنا....... واہ مار کے پریشان کر دیا بچارے کو"

سرتوں قدرے جھینپ کر دونوں ہاتھ رانوں میں دباتے ہوئے لاڈ سے ننھی بچیوں کی طرح پیچھے کی طرف جھک کر زبان رخسار کے اندر گھمانے پھرانے لگی۔

"اور کیا بات کروں...."

"تو ننھا نگلی کہیں کی...."

"بھئی ہمیں تو ڈر لگتا ہے"

بالا سنگھ ہنس پڑا۔

"چاچی مجھ سے سبھی ڈرتے ہیں۔ کیا میری شکل ایسی ہی خوفناک ہے"

مانا کہ بالا سنگھ کا چہرا حسین نہیں تھا۔ خدوخال کو حسن سے دور کا واسطہ بھی نہیں تھا۔ لیکن درحقیقت وہ بدصورت بھی نہیں تھا اس کا چہرہ ایسا ہی تھا جیسا کہ عام طور پر اور لوگوں کا ہوتا ہے۔ لیکن وہ خوفناک ضرور تھا۔ جن چیزوں سے دیکھنے والے کو ڈر معلوم ہوتا ہے وہ اس کے جبڑے اور آنکھیں تھیں۔ منہ کا دہانہ صرف زیادہ چرا ہوا تھا بلکہ اس پر وحشی بھیڑیئے کے جبڑے کی سی کیفیت طاری تھی۔ اور گھنی بھنوؤں تلے اس کی چھوٹی لیکن نہایت چمکدار آنکھیں تو مقابل کے کلیجے میں اُتر جاتی تھیں۔ یہی چیزیں تھیں ملنے والوں کے دلوں میں ہیبت پیدا کر دیتی تھیں اور انہیں ان کی دوستی اور نیک نیتی کا بڑی مشکل کے بعد یقین آتا تھا۔

"سچ مچ تو تو نری نگلی ہے" چند کور نے پرانے جھاڑن میں لپیٹتے ہوئے کہنا شروع کیا "تیرا تو بھائی ہے۔ تجھے نگل تو نہیں جائے گا۔ بھلا بھائیوں سے بھی

کوئی ڈرتا ہے۔"

سرون نے محسوس کیا کہ اسے اس قسم کی فضول باتیں نہیں کہنی چاہئیں۔ اگر اسے ڈر لگتا بھی ہو تو اسے کہنے کی بھی کیا ضرورت ہے اور پھر وہ دونوں تو بچپن کے ساتھی ہیں۔ نہ معلوم بیچارا کتنے شوق سے ملنے آیا ہوگا۔ اس سے کوئی اچھی ہنسی مذاق کی باتیں کرنی چاہئیں بیچارا کس قدر پریم سے بات چیت کرتا ہے۔

ادھر بالا سنگھ کے دل میں ایک ہی بات کھٹک رہی تھی۔ جب سے وہ آیا تھا۔ ماں بیٹی نے لفظ 'بھائی'، کی رٹ لگا رکھی تھی۔ یعنی جیسے وہ اس کی نیت پہلے ہی سے بھانپ گئی ہوں اور اسے متنبہ کر رہی ہوں کہ خبردار دل میں کوئی اور آس نہ لگا بیٹھنا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر نظر اٹھا کر سرون کی طرف دیکھا۔ باوجودیکہ وہ جوان ہو گئی تھی لیکن اب تک اس کے چہرے پر لاڈ سے پلے ہوئے بچے کے آثار ہویدا تھے۔ دونوں کی نظریں ملیں تو سرون نے کچھ سر کی جنبش سے اور کچھ ہاتھ کی مدد سے آگے کو گری ہوئی ڈھیلی ڈھالی چوٹی کو زور سے پیچھے کی جانب پھینک دیا۔ اس کی یہ حرکت معشوقانہ ادا کی بجائے یونہی طفلانہ حرکت معلوم ہوتی تھی اور پھر وہ ہنس پڑی۔ یہ ہنسی بھی محبوبانہ نہیں دوستانہ تھی بالا سنگھ کچھ کہے بغیر اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ اس پر اس نے اپنی نازک انگلیوں کی مدد سے داہنی آنکھ پر گرے ہوئے بالوں کی لٹ کو پیچھے کی طرف ہٹا دیا۔ پھر ہنسی اس کے سپید سپید دانت جو منجن کی رگڑ سے سفید نہ کئے گئے تھے۔ بلکہ قدرتی طور پر چمک رہے تھے نمایاں ہو گئے۔ پھر اس نے دفعتاً منہ بند کر لیا۔ کیونکہ بالا سنگھ نہیں ہنس رہا تھا۔ پھر سرون نے پاؤں چارپائی کے اوپر رکھ لیے اور گھٹنے سمیٹ کر دونوں بازو ان کے گرد حمائل کر دیئے اور بلند آواز نکالے ہنس دی۔ ہنستے وقت پھر ایک مرتبہ اس کے چہرے کی ساری سرخی اور چمک اس کی سرگیں آنکھوں کے نیچے رخساروں کے ابھار پر آن جمع ہوئی۔ وہ بھی چپ چاپ بالا سنگھ کو رجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ شاید وہ اس کی نظروں کو نہیں سمجھتی تھی۔ اسے اس کا یوں ٹکٹکی باندھ کر اپنی طرف دیکھنا کچھ عجیب سا معلوم ہو رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں کچھ بے چینی سی محسوس کر رہی تھی۔ یہ بے چینی تکلیف دہ نہیں لیکن ناقابل فہم ضرور تھی...... اسی لیے وہ اس کی جمی ہوئی نظروں

کے روبرو کئی پہلو بدل بدل کر رفیقانہ انداز میں ہنس چکی تھی۔ اس کی مسکراتی ہوئی آنکھیں پالا سنگھ کو یہ نہیں کہنا چاہتی تھیں کہ کبو تمہیں میرے رسیلے ہونٹ پسند آئے کبھو میری مدھ بھری آنکھیں تمہارے من کو بھائی ہیں۔ بلکہ یہ کہ دیکھو میں وہی تو ہوں جو تمہارے ساتھ کھیلا کرتی تھی اور بڑے بوڑھوں کے قول کے مطابق ہم دونوں کا دن رات کا ساتھ تھا...... لیکن پالا سنگھ اب بھی بے معنی اور کھوئی نظروں سے چپ چاپ اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ وہ کھِل کر ہنس پڑی اور ماں کی موجودگی میں خاصی بلند آواز میں بول اٹھی۔

"ہائے، کیا دیکھ رہے ہو میری طرف۔"

اس کی ماں دو مونڈھے دیوار کے ساتھ ٹیکتی ہوئی دفعتہ گھومی اور ماتھے پر بل ڈال کر بولی: "آئے ہائے پاگل کہیں کی .... کیا بک رہی ہے۔"

جنداں سمجھ گئی تھی کہ وہ کیوں گھور کر دیکھ رہا تھا اس کی طرف...... لیکن وہ بھی ان لڑکوں میں سے ایک تھا جن کی بابت وہ غور کر رہی تھی......

نہ معلوم سرنوں اس کی نظروں کا اصل مطلب کیوں نہ پا سکی۔ وہ ننھی بچی بھی نہیں تھی۔ شہر میں بھی رہ آئی تھی۔ ممکن ہے کہ وہ پالا سنگھ کو بھیا ہی سمجھ بیٹھی ہو۔ دوسری بات کا شبہ ہی نہ ہو...... ممکن ہے پالا سنگھ کی صورت اس کے دل میں جذبۂ عشق بیدار ہی نہ کر سکی ہو۔ یا ممکن ہے وہ اس قسم کی باتوں سے یکسر ناواقف ہو۔

سرنوں کی اس بات پہ پالا سنگھ کے حواس دفعتاً ہی بجا ہو گئے۔ عمر کے لحاظ سے نہیں تجربے کے لحاظ سے وہ خرانٹ تھا۔ لیکن صرف چند لمحوں کے لیے وہ از خود رفتہ ہو گیا تھا۔ پھر اس نے اپنے مخصوص انداز میں قہقہہ نما ہنسی ہنس کر کہا۔

"میں تمہیں ڈرانے کی کوشش کر رہا تھا۔"

"دیکھو بھئی ہمیں ڈراؤ مت۔"

"کیوں؟"

"نہیں بھئی۔"

پالا سنگھ نے اپنے مخصوص انداز میں چٹخارہ لے کر کہا: "وجہ بتاؤ۔"

"ہائے تو کیا اب ڈراتے ہی چلے جاؤ گے ساری عمر؟"

"ساری عمر؟"

"ہاں تو.... نہیں کیا؟"

"پہلے کب ڈرایا تھا تمہیں؟"

"جب میں چھوٹی تھی۔"

"تو میں کیا کرتا تھا؟"

"کرنا کیا تھا.... کچھ نہیں لیکن ڈرایا کرتے تھے۔"

"کیسے؟"

"اب مجھے یاد نہیں رہا۔ بس اتنا معلوم ہے کہ مجھ پر رعب جمایا کرتے تھے..... میں ڈر جایا کرتی تھی۔"

"لیکن رعب کیسا؟"

"اب کیا بتاؤں..... میں بہت چھوٹی سی تھی۔"

"پھر کسی نے جھٹلایا ہوگا؟"

"نہیں تو....."

"پھر تمہیں اصل باتیں بھی یاد ہونی چاہئیں۔"

"مجھے بس تمہارا ایک ہی خیال ہے کہ تم سے مجھے ڈر لگتا تھا پتہ نہیں تم کیا کرتے تھے بس یونہی بلے کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا کرتے ہو گے۔"

"جھوٹی۔"

"ہائے بے بے دیکھ لو آتے ہی لڑائی شروع کر دی۔"

جنداں انہیں ملاقات کی پہلی منازل ختم کرتے دیکھ کر دل جمعی کے ساتھ کسی کام کی غرض سے اندر چلی گئی۔ وہیں سے بولی:

"جب سے تو بیٹھی ہے عقل کی ایک بات نہیں کی۔ پالی بھی حیران ہوتا ہوگا کہ آخر شہر سے کیا پڑھ کر آئی ہے۔ پڑھی لکھی لڑکیاں تیری طرح ہوتی ہوں گی۔ بس کلپ لگانا ہی جانتی ہے اور کوئی بات تجھے کبھی نہیں سوجھتی۔"

یہ کہتی ہوئی جنداں باہر آگئی۔ وہ دونوں چارپائی پر بیٹھے تھے۔ وہ خود سوت کی اٹی

ے کراں کے قریب پیڑھی پر بیٹھ گئی اور سوت اٹیرنے پہ اٹیرتی ہوئی کہنے لگی:

"دیکھا پاگی کوئی فرق آیا ہے اس لڑکی میں"

"فرق تو ہے چاچی"

"یہی ناکہ بڑھ کر بھینس برابر ہو گئی ہے"

بالاسنگھ منہ پھیلا کر ہنسا۔

"دیکھو بے بے سو مرتبہ کہہ چکی ہوں۔ مجھے بھینس مت کہا کرو" .

جنداں دلفریب انداز میں مسکرادی پیار سے بولی۔

"اٹھ میری رانی —— دیکھ کیا حالت ہے تیرے بالوں کی۔ منہ ہاتھ دھو کر بال سمیٹ لے۔ قمیض کے بٹن بند کر سب کے سب۔ بھیا کو اپنی کتابیں دکھا اور جو پھول وول کاڑھے ہیں وہ بھی دکھا...... اور پھر تجھے کوئیں (رہٹ) پر بھائیوں کا چاہ ویلا لے کر بھی جانا ہے۔ منہ اندھیرے ہی چلے گئے تھے۔ بچاروں کو بھوک لگ رہی ہو گی۔

سرنوں نے بمشکل اٹھتے ہوئے کہا "گگو (چھوٹا بھائی) کو بھیج دو نا۔ میں آج کے روز پاگی بھیا سے باتیں بھی نہ کروں توبہ"

"باتیں کرنے سے منع کب کیا میں نے لیکن ذرا اپنی صورت تو دیکھ آئینے میں"

"لیکن میں کھیتوں پر نہیں جاؤں گی"

"گگو بھی نہیں ہے وہ بابو کو بلانے گیا۔ ہائے کیا کروں ہائے تنگ آگئی ہوں اولاد کے ہاتھوں"

سرنوں منہ ہاتھ دھونے کے لیے نل کی طرف چلی گئی اور وہیں سے چلا کر بولی۔

"توبے بے تم سارا الزام مجھی پر تھوپ دیتی ہو۔ اس قدر کام کرتی ہوں پھر بھی تم خفا کی خفا...... اب کہہ دیا ذرا آج گگو کو بھیج دو تو اس میں کیا برائی ہے"

جنداں نے بلا خفگی کا اظہار کئے اٹیرنا تیزی سے گھماتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا "اب وہ آجائے تو اُسے ہی بھیج دوں۔ بیچارے کو نا۔ نہ معلوم کہیں کھیل کود میں لگ جائے

تو دوپہر ہی کو واپس آئے۔ دِنی بھی تھی تم آئے تو پتہ معلوم کہاں کو کھسک گئی.....
پالی دنی کا تو تمہیں علم ہی کہاں ہو گا؟"

"دنی کون ہے؟"

"سب سے چھوٹی لڑکی؟"

"جب تم یہاں تھے تو گوگو کی عمر اس وقت تین برس کے لگ بھگ ہو گی۔ تمہیں تو وہ بھی یاد نہیں ہو گا؟"

"نہیں تو" پالا سنگھ نے کچھ شرم سی محسوس کی۔ لیکن جنداں نے اس کی طرف دیکھا نہیں۔
"گوگو کے بعد ایک اور لڑکا ہوا تھا۔ لیکن سات آٹھ ماہ کا ہو کر گزر گیا۔ پھر واہگورو تمہارا بھلا کرے۔ یہ دنی پیدا ہوئی۔ اب یہ تین لڑکے ہیں اور دو لڑکیاں۔ واہگورو اکال پرکھ انہی کی زندگی سلامت رکھے۔ تم ملے ہو سروں کے دونوں بھائیوں کو؟"

"نہیں میں کل شام ہی تو آیا — اور پھر صبح سیدھا ادھر چلا آیا۔"
سروں منہ دھو کر واپس آئی اور اسے پونچھنے کے لیے کپڑا ڈھونڈنے لگی۔ اس کے منہ سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں وہ چہرہ آگے کی طرف بڑھائے ایک دھاریدار انگوچھے سے منہ پونچھتی ہوئی اندر چلی گئی۔ گوبر سے لپے ہوئے فرش پر اس کے گیلے نقوش باقی رہ گئے۔

جنداں نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ "ہاں آج کل کھیتوں کا سارا کام وہی کرتے ہیں۔ انکے باپو ادھر اُدھر کے کام کرتے ہیں۔ شہر جانا ہو تو وہ بھی خود ہی جاتے ہیں۔ تمہیں شاید معلوم ہو۔ جب لام لگی تو ان کے باپو نے ایک گربچ امبسر سے...... مل کر ٹھیکے کا کام لے لیا۔ واقعی بڑی ہمت کی تھی تو ہماری ساری زمین ہمارے قبضے میں آگئی۔"

"اچھا..... مجھے کئی باتوں کا علم نہیں ہے۔ جب ماں کلکتے گئی تھی اس نے تھوڑا بہت حال بتایا تھا۔"

جنداں کو پالا سنگھ کے لہجے سے یوں احساس ہوا جیسے اسے ان کے دکھ سکھ سے خاص ہمدردی ہو۔ چنانچہ اس نے اور زیادہ رازدارانہ لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "سروں کے دادا کا تمہیں کچھ پتہ نہیں ——— ہاں بیٹا تم بچے تھے جب یہاں سے چلے گئے۔

توسرنوں کے دادا نے نشے میں بڑا روپیہ گنوایا۔ نہ معلوم یہ بری عادت اسے کہاں سے پڑ گئی اور پھر بال بچے دار آدمیوں کا تم جانتے ہی ہو۔ اس طرح گزارا ہونا بہت مشکل ہے۔ سنداں کو توسب باتوں کا پتہ ہے۔ آخر ہم بھی مجبور تھے۔ ان دنوں تمہارے چاچا فوج میں نوکر تھے۔ ساری زمین رہن رکھ کر دادا واہگورو کو پیارے ہوئے اور پھر رہ گئے ہم ——
سرنوں کے باپو کو نوکری بھی چھوڑنی۔۔۔۔!

"بے بے کنگھی کہاں ہے میری؟" اندر سے سرنوں کے چیخنے کی آواز سنائی دی۔

"بیٹا وہ پتھر کے کونڈے تلے پڑی ہو گی۔"

"یہ بھی کوئی جگہ ہے کنگھی رکھنے کے لیے۔۔۔۔۔۔" شکایت آمیز بڑبڑاہٹ سنائی دی۔

جنداں نے مسکرا کر بالا سنگھ کی طرف دیکھا وہ سرد سبھاؤ کی عورت تھی اسے غصہ کم ہی آتا تھا۔ پرسکون آواز میں بولی "دیکھ تو ہماری لڑکی کے رنگ ڈھنگ۔ اس کا رعب بھی ہم پر لڑکوں سے کچھ کم تو نہیں ہے۔ بھئی ہم تو لڑکیوں اور لڑکوں کو ایک برابر سمجھتے ہیں۔ آخر لڑکیاں بھی تو اکال پرکھ کی دین ہے۔ وہ۔۔۔۔۔۔ رسم گورو صاحب نے کڑی ماروں کی بڑی نندا (برائی) کی ہے۔۔۔۔۔"

بالا سنگھ جنداں کا یہ ترقی پسند نظریہ اچھی طرح نہ سمجھ سکا۔ جنداں نے جو بات چھیڑ دی تھی۔ وہ اسے بھول گئی اور شاید وہ اسی سوچ میں کچھ کھو سی گئی۔

کچھ دیر تک خاموشی طاری رہی۔ پھر جنداں نے دوپٹے کے ڈھلکتے ہوئے آنچل کو کھینچ کر سر ڈھانپ کر بالا بالا سنگھ کی طرف دیکھتے پوچھا۔

"اچھا بالی! اب تو تم یہیں رہو گے نا؟"

"ہاں چاچی۔"

"یہی اپنا زمین کا کام کرو گے؟"

"ہاں چاچی۔"

"ہاں تم دونوں بھائیوں کے لیے کافی ہو گی یہ زمین۔"

"بہت زیادہ نہیں۔ چاچی تمہیں معلوم ہی ہے اب تو ہمارے پاس بھی زیادہ زمین نہیں ہے لیکن میرا خیال ہے کہ کچھ زمین خرید لوں اور"۔

جنداں کے کان کھڑے ہو گئے۔ لیکن وہ اتنی جلدی بھروں میں آنے والی نہیں تھی۔

حقیقت یہ تھی کہ پالا سنگھ کے پاس زمین خریدنے کے لیے روپیہ بھی نہیں تھا۔ اور اگر روپیہ ہوتا بھی تو جم کر کام کرنے سے معذور تھا۔ باپ ہی کی طرح متلون مزاج تھا۔ نہ کوئی ٹھکانے کا کام کیا اور جو روپیہ کمایا بھی ساتھ کے ساتھ چٹ کر ڈالا۔ اور زمین خریدنے کا ارادہ سن کر جنداں نے حقیقتِ حال ٹٹولنے کے لیے کچھ کہنا چاہا کہ اُوپر سے سرنوں آ گئی اور تڑاپ سے چارپائی پر بیٹھ گئی۔

"ہاں بھیا اب ہو جائیں ہماری تمہاری باتیں"۔

پالا سنگھ نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ منہ دھونے کے بعد اس کی دمک اور بھی بڑھ گئی تھی۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ چہرہ جس پر نیند کا خمار باقی تھا ایک علیحدہ حُسن رکھتا تھا اور یہ چہرہ جو آلائش سے پاک ہو چکا تھا۔ اپنی چمک اور دمک کے باعث ایک اور ہی کشش کا مالک تھا۔ لیکن اب پالا سنگھ نے اپنے آپ کو ان خیالات میں محو نہیں ہونے دیا۔ وہ دل تو پہلی نظر ہی میں دے چکا تھا۔ لیکن اس نے اپنے آپ پر کچھ پابندیاں عائد کرنی ضروری سمجھیں۔ بولا۔

"ہاں سرنوں تمہیں تو بالکل ہی کچھ یاد نہیں لیکن مجھے پُرانی باتوں میں سے کچھ یاد ہیں"۔

"کیا؟" سرنوں نے خوش ہو کر پوچھا۔

"اب ساری کتھا تو کیا سناؤں بس اتنا بتائے دیتا ہوں کہ تم ان دنوں خوب صاف ستھری رہتی تھیں اور میں ننا تا تک نہیں تھا........ کیوں چاچی ٹھیک کہتا ہوں نا"۔

جنداں مسکرا دی۔ لیکن وہ اس بات کو اہمیت دے کر سردست سرنوں کی نظروں سے پالی کو گرانا نہیں چاہتی تھی "بچپن تھا نا"۔

سروں بہت خوش ہوئی "اچھا تو پھر؟"

"پھر؟" پالا سنگھ نے شرارت آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"پھر میں تمہارے بالوں کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر تمہیں خوب جھنجھوڑا کرتا تھا۔"

سروں کی معصوم آنکھوں میں خوف کا ہلکا سا سایہ دکھائی دیا اور اس نے اپنے خوبصورت بالوں کی طرف دیکھتے ہوئے انہیں چھوا۔

"اور اسی لئے تمہارے بال اتنے لمبے ہوگئے ہیں۔"

سروں ہنس پڑی۔ اور اس کے بالوں کے بہت بڑے جوڑے کی طرف اشارہ کرتی ہوئی بولی "اور تمہارے بال اس قدر لمبے کس طرح ہوگئے۔"

یہ کہہ کر خوب کھلکھلا کر ہنسی۔ اتنے میں گگو آن پہنچا۔ پالا سنگھ نے بزرگانہ انداز میں اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔

گگو نے بتایا کہ اسے باپو کا پتہ نہیں چلا۔ جب ماں نے اسے کھیتوں پر بھیجنا چاہا تو وہ مچل گیا۔ پھر ایک آنے کی رشوت ملنے پر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد سروں پھر پالا سنگھ کی طرف مخاطب ہوئی۔

"اچھا بھیّا اور بات سناؤ۔"

"بھئی اتنی مزے دار بات سنائی تمہیں...... اب تم اپنی کہو۔"

"اپنی کہوں؟" یہ کہہ کر سروں نے ایک انگلی دانتوں میں دبا لی اور پتلیاں گھما گھما کر سوچنے لگی۔

جنداں بولی "بیٹی! پالی کو بتاؤ نا تم نے کیا پڑھا۔ کیا لکھا۔ کیا کیا کام کیا۔"

"لیکن وہ کوئی مزے دار بات تو نہیں۔" اور پھر وہ کود کر اندر چلی گئی اور اپنی کتابیں اٹھا لائی۔

"جب میں شہر میں تھی...... تو تمہیں معلوم نہیں شاید میں وہاں بہت کچھ پڑھتی رہی۔ ضرب تقسیم کے سوال حل کیے۔ گورمکھی — اوڑا۔ ایڑا۔ ایڑی۔

کیا تم گورمکھی پڑھنا جانتے ہو؟"

پالا سنگھ نے پہلے اپنے چوڑے شانوں کو حرکت دی اور پھر غرّا کر بولا "نہیں، میں کچھ نہیں پڑھ سکتا بس تین حرف جانتا ہوں۔ اُوڑا۔ اَیڑا اور ایڑی"

"بس؟"

بس ...... اور ہاں اپنا نام بھی لکھ لیتا ہوں۔ میں نے ایک جنٹرمین بابو سے کہا کہ وہ کاگت پر میرا نام لکھ دے۔ پھر میں اس کی نقل کرتا رہا"

"لکھو تو بھلا"

"استانی آئی وہاں سے" جنداں نے کہا۔

پالا سنگھ نے نام لکھا۔ حروف ٹیڑھے میڑھے ضرور تھے لیکن اس کے باوجود نام پڑھا جاسکتا تھا۔

نام لکھ کر پالا سنگھ نے داد طلب نظروں سے سرتوں کی طرف دیکھا اس معاملے میں برتری کے احساس سے سرتوں کو پالی پر پیار سا آگیا۔ وہ سنجیدگی سے بولی۔ "میں تمہیں اپنا قاعدہ دوں گی۔ تم اور زیادہ پڑھ لینا......"

اتنے میں سنداں وہاں آنکلی۔ اسے دیکھ کر ٹھٹک کر کھڑی ہوگئی "ارے پالی تو یہاں بیٹھا ہے۔ مجھے کچھ کہہ کے بھی نہیں آیا۔ صبح سے تیرے دوست ہیرے پھیرے کر رہے ہیں...."

جنداں نے سنداں کو دیکھا تو پکار کر کہا "اے میں کہوں بہن ودھائی ہو اپنا پالی واپس آگیا ہے"

اس پر سنداں بہت خوش ہوئی اور اس نے جواب میں ضرورت سے زیادہ منہ پھاڑ کر کہا "بہن! تمہیں بھی ودھائی ہو .... دیکھ لو اس نے دن بھی نہیں چڑھنے دیا اور ادھر چلا آیا۔ دیکھو تو بچپن کے ساتھیوں کو کیسے گھل مل کر باتیں کر رہے ہیں"

"ہاں بہن ــــ ان کا آپس میں بڑا پریم تھا" حالانکہ جنداں گھڑی بھر کو ان دونوں سے بے خبر نہ رہی تھی تاکہ کہیں زیادہ گھل مل کر باتیں نہ کرنے لگیں۔

سنداں نے پھر کہا: "ہاں تو بیٹا انہوں نے تجھے کیمپ میں بلایا ہے۔ اب تو کب جائے گا ان کے پاس۔ ارے بہن کیا کہوں۔ ایک آتا ہے۔ دروازے میں سے جھانک کر پوچھتا ہے۔ ہاں سُنا ہے پالی آگیا ہے۔ دوسرا آتا ہے۔ ماں سُنا ہے پالی واپس آگیا ہے، اس طرح صبح سے تانتا بندھ گیا ہے۔ کئی بیچارے جنہوں نے عرصے سے ہمارے دروازے کے اندر قدم نہیں رکھا تھا۔ وہ بھی اس کے صدقے آئے......"

یہ کہہ کر سنداں کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد کہنے لگی "اچھا بیٹا روٹی کھا کر دوپہر کو وہاں ضرور جائیو اور یہاں سے اُٹھ کر سیدھا گھر آکر روٹی کھا لیجیو....."

جنداں چُپ نہ رہ سکی "ہے بہن کیا مار کے ناک میں دم کر دیا ہے تُو نے یہیں روٹی کھائے گا۔ ہماری پرائی روٹی تو نہیں نا...."

"واہگورو کا نام لو پرائی کون کہتا ہے اپنا گھر ہے" سنداں نے پھول کر کُپا ہوتے ہوئے جواب دیا "لیکن اس کی بھابی کو بھی تو بڑا چاؤ ہے۔ گڑ کے میٹھے چاول بنائے بیٹھی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ تو چل دی اور جنداں نے جذبات میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔ "کتنا چاؤ ہے ماں کو بھی۔ اولاد کے بغیر تو ماں اندھی سمجھو۔"

سرنوں اندر سے اپنے ہاتھ کے کاڑھے ہوئے تکیوں کے غلاف، میز پوش اور جھالریں اُٹھا لائی۔ ان کاموں میں سرنوں کو دسترس حاصل نہیں تھی۔ اس لئے کام بھی بالکل معمولی تھا۔ لیکن پالا سنگھ بہت پسند آیا اور وہ سرنوں کی قابلیت سے مرعوب بھی ہو گیا۔

پھر سرنوں نے اس سے کلکتے کے حالات پوچھنے شروع کیے۔

"کیا وہ بہت بڑا شہر ہے؟"

"ہو..... بہت بڑ...."

"کیا امرتسر سے بھی بڑا....؟"
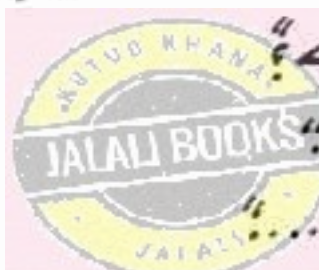
اب بالا سنگھ کی باری تھی مرعوب کرنے کی۔ اُس نے فاتحانہ مسکراہٹ لبوں پر پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "امرتسر جیسے سو شہر اس میں سما جائیں۔"

سرنوں کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"اتنا بڑا!"

"ہاؤں......" بالا سنگھ نے سر ہلاتے ہوئے باقاعدہ رُعب ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

پھر وہ تینوں بہت دیر تک اِدھر اُدھر کی گپ اُڑاتے رہے۔ سرنوں کی شیریں آواز اس کے کانوں میں شہد ٹپکاتی رہی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ بس وہ اسی طرح بیٹھے باتیں کرتے رہیں۔ لیکن پھر سرنوں کا باپو رنجن سنگھ آگیا۔ اس نے بڑی مشکل سے بالا سنگھ کو پہچانا۔ اس نے بھی اس کے واپس چلے آنے پر خوشنودی کا اظہار کیا۔ لیکن اس کی حرکات میں وہ گرمجوشی نہیں تھی۔ وہ دل کا برا نہیں تھا لیکن پہلے کی نسبت متکبر تو ہو ہی گیا تھا۔

سرنوں اٹھ کر آٹا گوندھنے لگی۔ جنداں خاوند سے باتیں کرنے لگی......

اب بالا سنگھ نے ٹل جانا ہی مناسب سمجھا۔

چنانچہ وہ چارپائی سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اپنے تہبند کے بل دُرست کرنے لگا۔

"کیوں بیٹا بالی؟" جند کور نے اپنی میٹھی آواز میں پوچھا۔

"اب جاتا ہوں۔"

"روٹی کھا کے جانا۔"

"نہیں چاچی پھر سہی۔"

پگڑی درست کر کے شوہر اور بیوی دونوں کی طرف مخاطب ہو کر "ست سری اکال" کہی اور پھر ایک امنڈتی ہوئی سی نگاہ سرنوں پر ڈالی۔

سرنوں چپ چاپ لیکن بیباکانہ ہنس دی۔ اس نے والدین سے چوری ہنسنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ بالا سنگھ اسی بات پر غور کرتا ہوا گھر سے باہر نکل آیا۔ چونکہ

دھوپ تیز ہو چکی تھی۔ مرد کاموں پہ گئے ہوئے تھے۔ عورتیں گندھے ہوئے آٹے کے تسلے اُٹھائے تنوروں کی طرف لپکی چلی جا رہی تھیں یا واپس آ رہی تھیں۔ میلے کچیلے بچے آوارہ کتوں کے گلوں میں رسیاں ڈالے انہیں اِدھر سے اُدھر گھسیٹے پھرتے تھے۔ گوبر آلود گرد میں گلی کی نکڑ پر کھڑے ہوئے پیپل کے پتے تیزی سے گھومتے چکر کھاتے چلے جا رہے تھے۔ وہ ٹھٹک کر تھوڑی دیر تک بھس ملے گارے کے بنے ہوئے بے حس مکانات کو چلچلاتی دھوپ میں کھوئی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا۔

۴
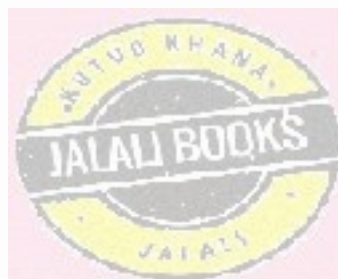
وہ جگہ جسے ڈنگا کے لوگ باغیچی کے نام سے پکارتے تھے۔ زمین کے ایک ایسے قطعہ پر مشتمل تھی۔ جہاں پر دھریک کے پچیس تیس درختوں کا جھنڈ تھا۔ ان درختوں کی پتیاں کڑوی لیکن چھاؤں بہت ٹھنڈی اور پُرسکون ہوتی ہے۔ یہ باغیچی گاؤں سے تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔ اسے گاؤں کا کلب گھر سمجھنا چاہیئے۔ گرمی کے دنوں میں دوپہر کے وقت لوگ کھانا دانا کھا کر اپنی اپنی چارپائیاں اُٹھائے آرام اور تفریح کی غرض سے یہاں آن پہنچتے۔ یہاں سب کے سب مرد بلا تخصیص عمر آ سکتے تھے۔ لیکن عورتیں نہیں دکھائی دیتی تھیں۔ عورتوں کے لیے یہ جگہ موزوں بھی نہیں تھی۔ اس جگہ مرد اپنے دل کے بخار بلا جھجک نکالتے۔ مردانہ باتیں، مردانہ گالیاں، مردانہ کھیل اور مردانہ تفریحیں ہوتی تھیں۔ دوپہر کی ان محفلوں میں بیسے جوان بوڑھے اس طرح گھل مل جاتے تھے کہ کسی کو اپنی عمر اور اس کے تقاضے یاد ہی نہ رہتے تھے۔ بالکل از کار رفتہ بوڑھے، جن کے منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت بھی اگر اور کچھ نہیں تو اپنی اپنی کھاٹوں پر لیٹے لیٹے دوسرے کی چٹخارے دار باتوں سے لطف اندوز ہوتے۔ شطرنج اور چوسر بہت ہی مقبول کھیل تھے ان لوگوں کے۔ عام کیفیت تو یہ ہوتی ہے کہ بعض لوگ دن کے تھکے ماندے ہوتے بلکہ زیادہ تر وہ لوگ ہوتے تھے جنہیں تاروں کی چھاؤں ہی میں ہل اٹھا کر راہ لینی پڑتی تھی۔ وہ آدھ گھنٹہ کے لیے تو ضرور سو جاتے۔ بعض

لوگ شطرنج اور بعض لوگ چوسر کھیلتے۔ شطرنج میں مقابل تو دو ہی شخص ہوتے
تھے لیکن ان کے ساتھ اور لوگ بھی مل جاتے تھے۔ کچھ ایک کھلاڑی کے جانبدار اور
کچھ دوسرے کے صلاح کار۔ اس قسم کے کھیل میں دونوں پارٹیاں بڑے جوش و
خروش کا مظاہرہ کرتیں اور جب وہ ایک دوسرے کے مہرے "مارتے" تو پچ پچ
ایک مہرا اٹھا کر دوسرے مہرے کے سر پر پوری طاقت سے پٹخ دیتے۔ ان کے
مہرے بھی بھدے اور موٹے ہوتے تھے۔ عموماً جب وہ شہر سے شطرنج خریدتے
تو سب سے پہلی خوبی مہروں کی یہ سمجھتے تھے کہ وہ مارپیٹ میں ٹوٹ نہ سکیں۔ مارپیٹ
چھوڑ اگر اس پر آدمی پاؤں رکھ کر کھڑا ہو جائے تو بھی نہ ٹوٹیں۔ بچے زمین پر
کوئلے یا انگلی سے لکیریں کھینچ کر باراں کٹال کھیلتے۔ زرد زرد کوڑیوں سے جنہیں
وہ "ڈڈو کوڈیاں" کہتے تھے۔ بڑی تیزی اور تندہی کے ساتھ چٹکی بجا بجا کر کھیلتے
تھے۔ اس میں سو یا پچاس گنتی پوری کرنی ہوتی تھی۔ جس لڑکے کی مقررہ گنتی
پوری ہو جاتی۔ وہ دوسرے کی گنتی کے حساب سے اُلٹے ہاتھ پر دو انگلیوں کی
پوری قوت سے چنٹیاں لگاتا تھا۔ انہیں چنٹیوں کے باعث کوڑیوں کے کھیل
میں گرما گرمی پیدا ہو جاتی تھی۔

عام طور پر لوگ اپنی دُھن میں مست رہتے تھے۔ اصل شور اس وقت بلند
ہوتا تھا۔ جب دو جوانوں میں کسی بات پر مقابلہ شروع ہو کر ٹھا ٹھنی ہونے لگتی
یا کوئی اغوا کا قصہ چھیڑ دیتا یا دور و نزدیک ایک جرم کی بہت زبردست واردات
ہو جاتی یا جب ان کے گاؤں میں کسی پر کوئی سنسنی خیز مقدمہ چلنے لگتا۔ اپنے گاؤں
کا معاملہ ہو تو پھر سب تفریح چھوڑ کر کسی بیکار مسئلے پر بھی گھنٹوں ایک دوسرے
کا سر کھپاتے۔

اس باغیچی کا مالک جوالا سنگھ تھا۔ صرف جوالا سنگھ ہی ایک ایسا شخص تھا جس نے
اپنا مکان گاؤں سے باہر بنوایا تھا۔ اس میں بھید یہ تھا کہ اس کے مشاغل ہی اس
قسم کے تھے کہ گاؤں کے اندر رہ کر دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ پولیس کی نظروں میں
جوالا سنگھ کے باپ سنتا سنگھ کے بعد یہی اس گاؤں کا سب سے زیادہ خطرناک

شخص تھا۔ لیکن جوالا سنگھ سنتا سنگھ کی نسبت بہت زیادہ مکار آدمی تھا گاؤں والے تو خیر اس کی بابت بہت کچھ جانتے ہی تھے اور ان کے دلوں میں اس کے لیے بہت احترام تھا۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ جوالا سنگھ کے کئی راز ایسے تھے جن پر ابھی تک پردہ پڑا ہوا تھا۔ اس میں اور سنتا سنگھ میں یہی فرق تھا۔ سنتا سنگھ جو کچھ کرتا تھا بیچ کھیت کے۔ لیکن جوالا سنگھ کے ڈھنگ نرالے تھے۔ بظاہر وہ اپنے آپ کو شریف بھی نہیں کہتا تھا۔ لیکن اپنے بھید بھی عیاں نہیں ہونے دیتا تھا اور اگر کسی کو علم ہو جائے تو اسے اس بات کی پروا بھی نہیں تھی۔

اس کا مکان پُراسرار تھا۔ بیوی بچے تھے نہیں۔ اپنی زمین تھی گائے بھینس بھی پالتا تھا۔ رشتے داروں میں ایک اس کی رشتے سے بہن تھی چنتو۔ جو اس کے ساتھ رہتی تھی۔ لوگوں کا خیال تھا۔ اس نے بہن ہی کو گھر میں بسا لیا ہے۔ علانیہ یہ بات کسی کو کہنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ گاؤں سے پرے مرا ہوا نوزائیدہ بچہ پایا گیا۔ ان دنوں چنتو بیماری کے بہانے کئی روز تک بستر پر پڑی رہی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ بچہ اس نے جنا ہے۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے تھے کہ چنتو خود ڈاکے ڈالنے کے لیے جاتی ہے۔ اس کے تہبند یا شلوار کے نیفے میں ہر وقت غیر علاقے کا بنا ہوا ایک پستول ٹھسا رہتا ہے۔ اس عورت کی بابت اتنی افواہیں اُڑی ہوئی تھیں کہ گاؤں کی عورتوں میں اس کا اٹھنا بیٹھنا مشکل ہو گیا۔

لوگ اپنی نوجوان کنواری لڑکیوں کو خصوصاً اس سے دور رہنے کی ہدایت کیا کرتے۔ اس کی عمر بیالیس تینتالیس برس کے قریب ہو چکی تھی۔ اب بھی وہ سپاہیانہ انداز میں سینہ تان کر چلتی تھی۔ بڑی عمر کے لوگ بتاتے ہیں کہ شباب میں واقعی حسین لڑکی سمجھی جاتی تھی۔ لیکن اب حسن کے آثار تقریباً مفقود ہو چکے تھے بلکہ اب اس کے چہرے سے مردانہ پن ٹپکتا تھا۔ باچھوں، ہونٹوں اور آنکھوں سے خشونت ٹپکتی تھی۔ وہ کسی سے بات بھی کرتی تو مردانہ انداز میں یعنی خوب پاؤں پھیلا کر اور اینٹھ کر کھڑی ہو جاتی۔ خوب زوردار قہقہے بلند کرتی ہوئی مقابل کے بازو یا کندھے پر مردانہ انداز میں دھپ لگاتی۔ عورتوں میں بیٹھتی تو بازو پڑا کر کہتی آؤ کلائی پکڑو میری۔ عورتیں اس کی ان حرکتوں کو

بڑی نفرت سے دیکھتی تھیں۔ اب تو خیر اس کی عمر اسی گاؤں میں گزر چکی تھی۔ گاؤں والوں نے اسے تقریباً قبول کر لیا تھا۔ البتہ ایک مرتبہ اس نے پالی کی ماں سنداں کو کلائی پکڑنے کا چیلنج دے دیا۔ جسے سنداں نے فوراً قبول کر لیا اور اسے ہرا بھی دیا۔ سنداں ہاتھ پاؤں کی بہت مضبوط تھی۔ اس کے چہرے کے نقوش بھی بھدّے تھے۔ اور صورت سے ایک خاص قسم کی سختی بھی ٹپکتی تھی۔ لیکن جنتو کے برعکس اس میں نسائیت بدرجہ اتم موجود تھی۔

جوالا سنگھ کی عمر بھی پچاس کے لگ بھگ تھی۔ بہن کی طرح اُس نے بھی شادی نہیں کی۔ کسی زمانے میں تو اس کی جسمانی طاقت کا ٹھکانہ نہ تھا۔ لیکن یہ پالا سنگھ کے بچپن سے بھی پہلے کی بات تھی۔ دراصل وہ پالی کے باپ کا ہم عصر رہا۔ سنتا سنگھ کی دھوم دھام میں وہ پس منظر ہی میں رہا۔ خود سنتا سنگھ کے ساتھ مل کر بھی اُس نے بڑے بڑے معرکے مارے تھے۔ اس کا مکان جرائم پیشہ آدمیوں کا گڑھ تھا۔ عجیب عجیب صورتیں دکھائی دیتی تھیں۔ یہاں بھنگ کے نشے میں غٹ، لڑکھڑاتے چور اور ڈاکو جن کی پگڑیاں سر سے اتر کر ٹانگوں میں اُلجھی ہوتی تھیں۔ جوالا سنگھ اب بھی بہت مضبوط شخص تھا۔ صرف اگر اسے نشے کی لت نہ ہوتی تو اس کا جسم بڑی عمر تک اس کا ساتھ دے سکتا تھا۔ اس کا جسم بھی اتنا ہی بھدا اور کالا تھا جس قدر کہ اس کا دل کھوٹا تھا۔ گرمیوں میں وہ کُرتا اتار کر اپنی کھاٹ پر بیٹھ جاتا اور دیکھنے والوں کو دُور سے وہ ہو بہو ریچھ دکھائی دیتا۔ سر پر بال تو خیر تھے ہی پھر داڑھی کے بال قینچی سے کترنے کے سبب بہت گھنے، موٹے اور پھیل گئے تھے اور اس کے رخساروں کے اوپر والے حصے تک چڑھ آئے تھے۔ پھر اس کے بدن پر یعنی چھاتی، کندھوں، پیٹھ، بازوؤں اور کلائیوں پر سیاہ رنگ کے چھتے دار بال بے تحاشہ اُگے ہوئے تھے۔ اسی لیے گرمیوں میں اسے بڑی پریشانی کا سامنا ہوتا تھا۔ خصوصاً پیٹھ کی کھجلی اُسے بہت پریشان کرتی۔

اِدھر اُدھر کے بچے اُس کے گھنے بالوں اور پسینے کی لجلجاہٹ سے گھبرا کر اس کی پیٹھ کھجانے سے انکار کر دیتے تھے چنانچہ اُس نے ایک لمبی سی داتون کے

ساتھ کنگھا باندھ رکھا تھا۔ سونے سے پہلے وہ آنکھیں بند کر کے بیٹھ کھجایا کرتا۔ اس سے اسے بہت راحت کا احساس ہوتا تھا۔

وہ باغیچی کا مالک تھا۔ لیکن اب لوگ اس حقیقت کو قطعاً بھول ہی گئے تھے۔ چنانچہ کئی مرتبہ ایسا ہوتا تھا کہ اسے چھاؤں میں چارپائی بچھانے کے لیے جگہ تک نہ ملتی۔ اس بات پر گھنی بھنوؤں تلے چمکتی ہوئی آنکھوں سے سب کا جائزہ لیتا جو اپنی چارپائی پر بڑے آرام سے لیٹا ہوتا پھر زیر لب مسکرا کر کہتا: "حرامزادے کیسے بیٹھے ہیں۔ ٹانگ پر ٹانگ رکھے جیسے ان کے باپ ہی کی باغیچی ہو۔"

اس پر اسی کا کوئی ہم عمر نتھنے پھلا کر غراتا: "جا اوئے جا ماں یاوا، آیا باغیچی کا مالک وہاں سے۔"

پالا سنگھ کا گاؤں میں آنا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ لوگ اس کے باپ کو جانتے اور مانتے تھے۔ اس کا بھائی بچارا پھر بھنگا ہی نکلا۔ لیکن جب بشنے گنئے اور رتنے نے پھر اپنے دوست کے ہاتھ کی صفائی دیکھی تو انہیں معلوم ہو گیا کہ اب ڈونگا کی روایات ایک مرتبہ پھر تازہ ہو جائیں گی۔ پالا سنگھ، جوالا سنگھ اور سنتا سنگھ دو متضاد شخصیتوں کا بہت سلجھا ہوا مرکب تھا۔ یعنی جسمانی طاقت اور ہتھکنڈوں میں اُستادی کا درجہ رکھنے کے باوجود اس کے اندازِ تکلم اور نشست و برخاست میں نہ تو باپ کی سی دھوم دھام اور نہ جوالا سنگھ کی سی مکاری تھی۔

حقیقت یہ تھی کہ اگر اسے کلکتے میں انہیں کے علاقے کے بدمعاش قسم کے موٹر ڈرائیوروں سے واسطہ نہ پڑتا جو اپنے فن میں طاق اور پرانے پاپی تھے۔ تو یقیناً وہ اس معاملے میں ان گھڑ ہی رہتا۔ ہو سکتا ہے کہ جوالا سنگھ ایسا خرانٹ بعض معاملات میں اس سے بازی لے جائے کیونکہ ان دونوں کی عمر میں بھی تو بہت بڑا تفاوت تھا اور پھر ہر مقام کے چند مخصوص مسائل اور رموز بھی ہوتے ہیں۔

دوپہر کے وقت باغیچی میں لوگ حسبِ معمول بیٹھے اپنے مشاغل میں منہمک تھے۔ کسی نے پالا سنگھ کا ذکر چھیڑ دیا۔ تھوڑی دیر تک تو یہ حال رہا کہ کچھ لوگ بلند آواز میں باتیں کرتے رہے اور کچھ اپنی اپنی گم صم سنتے ہی رہے۔

"ارے بھائی! سنا ہے پالا سنگھ گاؤں واپس آ گیا ہے۔"

"کون پالا سنگھ؟"

"لہنے کا بھائی......"

"لہنا؟...... ارے اس لہنے کا بھائی کونسا ہے؟"

"تمہیں یاد نہیں کیا۔ بھئی سنتا سنگھ کے دو لڑکے تھے۔ ایک تو یہ اپنا لہنا اور دوسرا پالی۔"

"اور...... وہ کہاں سے آن ٹپکا یار...... اس کی ماں تو روتی پھرتی تھی ہم سمجھے کہ بس گیا۔"

"ہاں وہی وہی بھاگ گیا تھا نا۔"

"اب تک کہاں تھا؟"

"کلکتے میں۔"

"اب تو بڑا ہو گیا ہو گا۔"

"ہاں سنا ہے بہت کرارہ جوان ہے۔"

یہ کرارہ جوان کے الفاظ سن کر حاضرین میں سے بیشتر کے کان کھڑے ہو گئے۔

"بھئی کون ہے کرارہ جوان...."

"پالا سنگھ، سنتا سنگھ کا بیٹا۔"

"تم نے اُسے دیکھا ہے؟"

"نہیں دیکھا نہیں........ صبح سے نہ معلوم کہاں غائب ہے گھر پر گئے تو ملا نہیں۔"

اتنے میں لشن سنگھ اور کشن سنگھ بھی آن پہنچے۔ ادھر اُدھر دیکھا "کیوں بھائی تیجا سنہا پالی نہیں آیا یہاں؟"

اب شطرنج کے چند کھلاڑیوں نے جھلا کر سر اُٹھایا "کیا ٹائیں ٹائیں لگا رکھی ہے۔ کون ہے یہ پالی، پالا سنگھ۔"

پھر سب لوگ کھیل وہیں بند کر کے بشنے کی زبانی پالا سنگھ کے حالات سننے لگے۔

" بھئی بڑا تگڑا جوان ہے آہاہاہا "

یہ سب کی دلچسپی کی بات تھی۔ ایک بزرگ نے اپنے گاؤں کے جوان لڑکے کا یہ حال سُنا تو فخر سے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: " اچھا..... واہ وا..... واہ وا..... .. تو اُسے یہاں لاؤ نا باغیچی میں "

" ہم دو دفعہ اس کے گھر جا چکے ہیں۔ اس کی ماں کو کہہ آئے تھے کہ باغیچی میں بھیج دیجیو۔ بولی ابھی تو اس نے روٹی بھی نہیں کھائی۔ ڈھونڈ کر لاتی ہوں۔ روٹی کھاتے ہی وہاں چلا آئے گا۔ کیوں تایا تمہیں یاد ہے بالی..... "

" اچھی طرح تو نہیں لیکن چھوٹا سا ہوتا تھا۔ کچھ کچھ یاد آتا ہے۔ اچھا تو اپنے باپ پر گیا ہے "

کشنا بولا " ارے تایا! وہ تو باپ سے بھی چار جوتے آگے ہے "

یہ سُن کر تایا ہر پرشاد (جسے ہر کوئی تایا کہتا تھا) کی تاگے سے بندھی ہوئی عینک گر پڑی۔

اب سب لوگ ہمہ تن گوش تھے۔ بشنے نے پھر کہنا شروع کیا۔

" کل شام جب وہ آیا تو ہماری آپس میں لڑائی ہو گئی "

" ارے لڑائی ہو گئی؟ وہ کیوں؟ "

" ہوا یہ کہ وہ نہر میں نہا رہا تھا۔ ہم نزدیک والے کنوئیں سے کھیتوں میں چکر لگا رہے تھے۔ ہم نے سمجھا کہ کوئی اجنبی ہے.... "

" تم نے پہچانا بھی نہ اسے.... ہو ہو "

" پہچانتے کیا مادر چود بالکل بدل گیا ہے پہلے سے۔ کہاں وہ چھوٹا سا بالی اور کہاں یہ شیر سینہ کے درخت کے مانند اونچا اور پلا ہوا بکرا..... ہم نے دیکھا تو سوچا کہ کوئی نیا آدمی ہے اس سے روپے جھاڑ لیں "

" ہاہا "

" جب وہ نہر میں سے ننگ دھڑنگ باہر نکلا تو ایک بار تو اس کا ڈیل ڈول دیکھ کر ہماری روح بھی بج ہو گئی۔ لیکن پھر یہ سوچ کر ہم تین ہیں اسے.... "

"تین کون؟"

"وہ رتنا ــــ بھینگا رتنا بھی تو تھا ہمارے ساتھ۔ کشنا اور میں تو اس کے سامنے کھڑے تھے۔ رتنا پیچھے کی طرف سے آیا۔ پہلے تو دھوکے سے ہم اس سے روپیہ چھین لیا۔ لیکن پھر اس نے ہم تینوں کو سامنے کھڑا کر کے آنکھ جھپکتے میں ہرا دیا..."

اکھڑ جوانوں کو بھلا یقین کیسے آئے: "ہوہوہو...... بھلا یہ کیسے ممکن ہے۔"

"ممکن تو نہیں...... لیکن ہم خود حیران رہ گئے۔ ایسا صاف ہاتھ ہم نے کسی کا نہیں دیکھا۔ اور بھوجو! تم جو مونچھیں تانے پھرتے ہو۔ اگر اس کے مقابل کھڑے ہو جاؤ تو پیشتر اس کے کہ تم ایک انگلی بھی اٹھا سکو۔ وہ تمہیں زمین پر لٹا دے۔"

بھوجو نے شانوں کو حرکت دے کر ایک 'ہونہہ' سے نفرت کا اظہار کیا۔

تایا ہر پرشاد نے ساری گفتگو کا لب لباب نکالتے ہوئے کہا: "تو یوں کہو نا کہ باپ پڑ گیا ہے۔"

کشنے نے کہا: "اوئے تایا۔ وہ تو باپ کا بھی باپ ہے۔ کیا سمجھے۔"

یہاں سے بات شروع ہوئی تو پھر جسمانی طاقت اور قد و قامت کے قصے چھڑ گئے۔ اس کے بعد وہ بسیار خوری کی باتوں پر اتر آئے۔

"ہو میری آنکھوں دیکھی بات ہے...... میں نے ایک آدمی کو پچیس سیر دودھ کا کڑاہا چڑھاتے دیکھا۔"

تایا ہر پرشاد جو جوانی کی باتوں میں دلچسپی رکھنے کے علاوہ سمجھ دار بھی تھے۔ سنجیدگی سے بولے: "بھئی اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ اب اسی جگہ بیٹھے ہوئے آدمیوں میں سے کئی ایسے نکل آئیں گے جو روٹی کھانے سے پہلے حلوے کا بھرا ہوا تھال بلا ڈکار لیے کھا جائیں گے۔ حالانکہ اگر تم اس بات کا کسی شہری کے آگے ذکر کرو تو وہ اس بات کو سچ ہی نہیں مانے گا۔ خیر ایک بات بتا دوں کہ یہ ضروری نہیں کہ زیادہ کھانے والا آدمی طاقت ور بھی ہو۔ کیونکہ بے تحاشا کھانے سے طاقت کا

کوئی سمبندھ نہیں ہے......؟

اس بات پر بڑے بوڑھوں نے خصوصاً بڑے زور سے سر ہلا کر حامی بھری.... نوجوانوں نے اس بات کا یقین کیا یا نہ کیا لیکن وہ مرعوب ضرور ہو گئے۔ تایا ہر پرشاد نے اپنی مدلل گفتگو سے خود ہی بہت خوش ہو کر مزید رعب گانٹھنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا...... کہ گاؤں کی طرف دیکھ کر چُپ ہو گئے......

چند اور لوگوں نے اس طرف دیکھا۔

ایک اجنبی ہاتھ کے پنجے میں چارپائی اٹھائے باغیچی کی طرف بڑھ رہا تھا وہ سب اس کے قد و قامت اور ڈیل ڈول کا نظروں ہی نظروں میں جائزہ لیتے رہے۔ ان میں ہر ایک کو یہ تسلیم کرتے ہوئے دیر نہ لگی کہ واقعی آنے والا جوان شکل و صورت کے لحاظ سے نہ ہی جسمانی نقطہ نظر سے ہزاروں میں سے ایک ہے — اور وہ پالا سنگھ کے سوا کون ہو سکتا ہے۔

لشن سنگھ اور کشن سنگھ اسے دیکھتے ہی دوڑ پڑے "ابے یار صبح سے تمہارے گھر کے چکر لگا رہے ہیں کہاں چلے گئے تھے۔ یہاں بھی تمہارا ہی ذکر ہو رہا تھا"

پالا سنگھ مسکراتا ہوا آگے بڑھا۔ دو چار آدمیوں نے اپنی چارپائیاں کھسکا کر اس کے لیے جگہ بنا دی۔ اس نے آتے ہی دونوں ہاتھ جوڑ کر سب کی طرف دیکھا۔

"واہگورو جی کا خالصہ، سری واہگورو جی کی فتح"

سب نے بڑے پریم سے جواب دیا۔ اس کے بچپن کے ساتھیوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ اس سے گلے ملنے کے لیے آگے بڑھے۔ لشنے نے ذرا ہاتھ بڑھا کر کہا۔

"بھئی باری باری۔ ٹھہرو میں اسے بتاتا بھی جاؤں کہ کون کون ہے؟"

یہ کہہ کر اس نے ایک جوان کا بازو پکڑ کر آگے کھینچا۔

"یہ ہے نواب دلاور خان...... سوچنے میں کچھ سنگھ سے بھی بڑھ گیا ہے گلے ملو دونوں"

"یہ اپنا یار بھوجا.... لٹھ باز ہے۔"

"یہ تیجا سنگھ ہے۔"
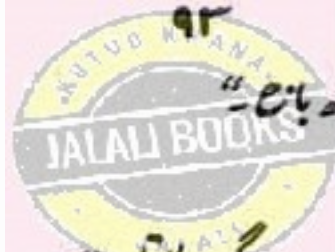
"یہ جورا سنگھ ہے..... بگڑ بلاتا ہے...... اس کی لاش دیکھو کتنی بھاری ہے۔"

پھر اس نے گوراندتے کے مشین سے منڈے ہوئے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ اِدھر آ او ئے دتے...... یہ کشتی لڑتا ہے...... دھڑسی (گاؤں) کے لمبڑدار کے لڑکے بھلور سنگھ کو پٹخ مارا تھا اس نے..... اس سے بھی گلے لگو اور اسے شابا بھی دو۔"

"اور یہ ہیرا..... بس پیچ پیچ ہیرا...... سرپیچی (شرافت) میں پہلا نمبر (دنمبر) بناب کا اور دوسرا اس کا...."

"پر سرپیچوں سے جی بھر گیا ہو تو وہ رہا چاچا جوالا سنگھ دیکھ لو بھالو کا بھالو... تمہارے باپ کا ساتھی...."

"یہ دیال چند (دیوان چند) .... کبڈی کھیلتا ہے۔ خوب کھیلتا ہے۔ پالے سے آگے بڑھتے ہی اس تیجی (تیزی) سے گھومتا ہے کہ آنکھ نہیں ٹھہرتی سُسرے پر۔"

اس طرح بشنے نے پہلے نوجوانوں سے اس کا تعارف کروایا۔ پالا سنگھ سب سے ہنس ہنس کر گلے ملتا رہا اور پھر بشنے نے بزرگوں کے نام گنوانے شروع کئے تایا بر پرشاد اور جوالا سنگھ سے لے کر گھچڑوں تیلی تک۔

"...... اور بھئی یہ رہا اپنا گھچڑوں تیلی۔ تمہیں یاد ہے اس کی صورت اب پہچان لو ہے نا وہی کا وہی گھچڑوں کا گھچڑوں ...."

گھچڑوں تیلی اس گاؤں کا سب سے کمزور شخص لیکن باہر والوں میں بہتوں سے طاقت ور تھا۔ کپڑے تیل سے چکٹ۔ گال اندر کو دھنسے ہوئے۔ سوکھا سا منہ۔ مسکین صورت۔ لیکن جب کبھی اپنے برابر والے سے کبڈی یا کشتی میں جوڑ ہو جائے تو اچھا دکھاتا تھا۔ تاہم اس کا اصلی نام بھلا کر "گھچڑوں" رکھ دیا گیا تھا۔

ہر پرشاد ادھیڑ عمر ہی سہی لیکن نوجوانوں سے خاص لگاؤ رکھتا تھا۔ ان کی طرفداری اور ناز برداری میں کبھی کوئی کسر نہیں چھوڑتا تھا۔ یہاں تک کہ گاؤں کا ایک نوجوان اس کی نوجوان لڑکی کو کسی غلط فہمی کی بنا پر چھیڑ بیٹھا۔ لوگوں نے دیکھ لیا اور جوتوں سے اس کی مرمت پر آمادہ ہو گئے۔ لیکن ہر پرشاد نے یہ کہہ کر معاملہ رفع دفع کر دیا کہ یہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے۔ چلو اب کے غلطی ہو گئی۔ آئندہ نہیں کرے گا۔

چنانچہ نوجوانوں کے قدر دان درجہ اوّل کی حیثیت سے اس نے نو وارد بالا سنگھ کا دل رام کرنے کے لیے قدم آگے بڑھایا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کی طرف مہربان نظروں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"بیٹا! تمہیں دیکھ ہم سب کو بہت خوشی ہوئی ہے۔ تمہاری ماں مجھ سے تمہیں چٹھیاں لکھوایا کرتی تھی۔ پھر جب ہمیں معلوم ہوا کہ تم برما چلے گئے ہو۔ لڑائی پر تو تم مایوس ہو گئے۔ تمہاری چٹھی بھی نہ آئی تو تمہاری ماں کے دل میں کئی کئی طرح کے وہم پیدا ہونے لگے اور اس حالت میں بھی کلکتے جانے کو تیار تھی۔ لیکن میں نے منع کر دیا۔ بہن! ایسے موقعہ پر کلکتے جانے سے کچھ فائدہ نہیں کیوں ـــ کہ کلکتے میں تو بالا سنگھ ہے بھی نہیں۔ کلکتے میں ہم کئی برس رہے ہیں۔ پگلی تو کہاں جائے گی۔ بولی برما چلی جاؤں گی۔ اری! تجھے برما کون جانے دے گا۔ برما میں تو لڑائی ہو رہی ہے۔ بھلا سرکار برما جانے بھی دے گی اور بھئی بڑی مشکل سے کہیں اسے منایا میں نے......"

ہر پرشاد نے خواہ مخواہ اتنی ہوا باندھ دی۔ حالانکہ اسے خود یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ بالا سنگھ ہے کون۔ کبھی ڈیڑھ دو برس پہلے سنداں نے ایک آدھ چٹھی لکھوائی تھی اس سے۔ پھر کہا۔

"تو بہت چھوٹا تھا جب یہاں سے گیا تھا اگر تمہارے چھٹپن کی تصویر ساتھ رکھی جائے تو تم خود بھی نہ پہچان سکو کہ یہ ایک ہی آدمی کی تصویریں ہیں۔ سو بیٹا ابھی ابھی جب بشنے نے بتایا کہ تم واپس آ گئے ہو اور خوب تگڑے جوان ہو گئے ہو

تو میں حیران رہ گیا ....“

”اور تایا کی ناک سے عینک گر پڑی“ بشنے نے لقمہ دیا۔

”چُپ اوئے سور دے پُتر“ ہر پرشاد، بشنے کی طرف دیکھ کر غرایا۔

اس پر ہر پرشاد کے ہم عمر کرم دین نے جھلا کر کہا ”ابے تو بات ختم کرنا! لونڈے کے پیچھے ہاتھ دھو کر ہی پڑ گیا ہے۔ ہاں نہیں تو لیکر (لکچر) پلائے جا رہا ہے“

”تو تیرے پیٹ میں دنیشھن کیوں ہوتی ہے“ ہر پرشاد نے گھوم کر کرم دین کی طرف دیکھا۔

”پکڑو بے لونڈو اس اُلّو کے چرخے کو ...... کیوں بے ہمارا دل نہیں چاہتا اس سے باتیں کرنے کو ...... اس میں تو سب کا ساجھا ہونا چاہیئے“ یہ کہہ کر وہ مسکراتے ہوئے حقہ گڑگڑانے لگا۔

ہر پرشاد نے مصنوعی غصّے سے عینک اتار دی۔ اتار کر پھر لگالی اور باضابطہ پسپا ہو کر اپنی چارپائی پر آگیا۔

پالا سنگھ بھی اپنی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ سب طرف سے اشتیاق بھری نظریں اس پر پڑ رہی تھیں۔ سب لوگ ہر پرشاد کے خاموش ہو جانے کے منتظر تھے۔ اب میدان خالی پایا تو سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

کرم دین نے یکایک حقّے کی نَے منہ سے پرے ہٹا کر پوچھا ”لیکن بھئی کلکتہ کہاں ہے ....؟“

یہ سوال کسی کے ذہن ہی میں نہ آیا تھا۔ حالانکہ ان میں سے کسی کو بھی ٹھیک طور پر معلوم نہیں تھا کہ کلکتہ کہاں ہے۔ بعضوں کو کرم دین کی عقل پر رشک آنے لگا۔ کیا پتے کی بات پوچھی ہے کم بخت نے۔

اس سوال کا جواب خود پالا سنگھ کے لیے بھی کچھ کم مشکل نہیں تھا۔ اس دوران میں ہر پرشاد خفا ہونے کے بعد خود بخود من بھی چکا تھا۔ بڑی سنجیدگی سے بولا۔

”شہر کلکتہ ہندوستان میں ہے اور یہاں سے پانچ ہزار میل دور ہے۔ اور گاڑی

دن رات چلتی رہتی ہے تب کہیں جا کر وہاں پہنچتی ہے ۔۔۔۔۔"

بظاہر اس جواب سے سب مطمئن ہو گئے ۔ پالا سنگھ میں بھی اس کی تردید کرنے کی اہلیت نہیں تھی اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ سب کو یقین آ گیا کہ کلکتہ ہندوستان میں ہے اور شکر کا مقام ہے کہ کسی نے یہ نہیں پوچھا، کہ ہندوستان کہاں ہے ؟

جوالا سنگھ نے جب ہر پرشاد کو پالا سنگھ پر بزرگانہ انداز میں شفقت جھاڑتے ہوئے دیکھا تھا تو اس کے دل میں بھی کھلبلی سی مچ گئی تھی ۔ لیکن ہر پرشاد کا عبرت انگیز حشر دیکھ کر اس وقت تو خاموش رہا ۔ لیکن جب جوش و خروش ٹھنڈا ہو چکا تو وہ اٹھ کر پالا سنگھ کے قریب جانے کے لیے پر تولنے لگا۔

کرم دین نے پھر سلسلۂ کلام شروع کر دیا۔

"پالی ! بھئی کلکتے میں اور پنجابی بھی ہوں گے "

"اوہ ! کلکتے میں کئی کسم کے آدمی رہتے ہیں ۔ بس یہ سمجھو کہ دنیا بھر کے آدمی اگریج ، انجریجی ، امریکی ، چینی ، جاپانی ، پارسی ، سندھی ، گجراتی ، مدراسی ، سب لوگ "

"وہ کیا کرتے ہیں وہاں اتنے آدمی ؟" کسی نے پوچھا۔

"کاروبار کرتے ہیں ۔ سہر بھی تو بڑا ہے ۔ تم نے امرت سر دیکھا بس یہ سمجھ لو کہ پچاس امرتسر آ سکتے ہیں ایک کلکتے میں ۔۔۔۔"

"تمہاری ماں کلکتے کو کالا کتا کہتی ہے ۔ ہاہا"

سب لوگ ہنسنے لگے۔

"کیا وہاں کالے کتے بہت ہوتے ہیں " ایک لڑکے نے دریافت کیا۔

پالا سنگھ نے وقار کے ساتھ ہنس کر کہا "ارے نہیں بھئی ! یہ تو ماں کی بیا کو بھی ہے جو اسے کالا کتا کہتی پھرتی ہے "

کرم دین نے ماتھے پر جہاندیدہ شخص کی مانند بل ڈال کر پوچھا " وہاں کاروبار تو کھوب ہوتا ہوگا "

"ہاں ۔۔۔۔ پر موٹر ڈریوی کا سارا کام سکھوں کے ہاتھ میں ہے "

"اچھا!" کرم دین کچھ مسرت اور کچھ تعجب سے بولا۔

"وہاں ہمارے علاقے کے بیسیوں سکھ گئے ہوئے ہیں۔ موٹر ڈریوری کا سارا کام انہی کے ہاتھ میں ہے۔"

"بیسیوں کیوں ہزاروں کہو بلکہ لاکھوں کہو۔"

"ہاں" پالا سنگھ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو وہ سارا دن موٹریں چلاتے پھرتے ہیں" کشن نے سوال کیا۔

"بڑے بڑے امیر آدمی بھی ہیں.... جو سکھ بہت پہلے کے گئے ہوئے ہیں ان کے پاس تو بہت روپیہ جمع ہو گیا ہے۔"

"اچھا" نواب کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"اور خوب تکڑے ہیں وہ لوگ کھاتے پیتے ہیں عیش کرتے ہیں...."

"وہاں کا پانی کیسا ہے" یہ سوال کرم دین کے سوا اور کون کر سکتا تھا۔

"پانی اتنا اچھا نہیں ہے...... برا بھی نہیں۔ کھوراک ٹھیک ہو تو آدمی بنا رہتا ہے.... وہاں بنگالی لوگ رہتے ہیں۔ ان کا دماگ اچھا ہوتا ہے تکڑے نہیں ہوتے۔"

ہر پرشاد سوالات پوچھ کر اپنی کمتری ثابت نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن وہ سب حالات بڑے غور سے سُن رہا تھا۔

نواب نے سوال کیا "تو وہاں سبھی لوگ بچارے کمزور ہوتے ہوں گے۔"

"نہیں" پالا سنگھ نے سر ہلا کر جواب دیا۔ امریکی سپاہی بہت تکڑے ہوتے ہیں۔ یہ لال سُرخ رنگ۔ خوب لمبے اور موٹے تازے ہوتے ہیں۔"

چھجو چونکہ شہروں میں عموماً گھومتا رہتا تھا۔ کہنے لگا "مریکی گریج ہی تو ہوتے ہیں نا۔"

"نہیں گریج نہیں ہوتے...... مریکی مریکا کے رہنے والے ہوتے ہیں۔ گریج سپاہیوں کو ٹامی کہتے ہیں۔ وہ اتنے لمبے چوڑے نہیں ہوتے۔ جب پہلے پہل سپاہی کلکتے میں آئے تو لوگوں کو بہت تنگ کرتے تھے۔ ڈریوروں کے

پلیسے مار لیتے تھے.....“

یہ بات سن کر جو لوگ اونگھ چلے تھے۔ پھر ایک مرتبہ چوکنا ہو گئے۔ ” اچھا تو بڑے تکڑے ہوتے ہیں وہ ؟“

بالا سنگھ نے سب کو اپنی طرف متوجہ پا کر کہنا شروع کیا ” تین چار مریکی موٹر میں بیٹھ جاتے تھے اور چھاؤنی میں پہنچ کر بگیر کرایا دئیے اتر جاتے تھے جو کچھ کہو تو کھوب مارتے تھے ڈریور کو .....“

اب سب کی رگوں میں خون کھولنے لگا۔ پنجابی اس طرح چپ چاپ مار کھا لیتے تھے ؟ ان میں سے ہر کوئی ہمہ تن سوال بنا ہوا تھا۔

”جب ہم نے دیکھا کہ یہ اس طرح باز نہیں آتے تو ہم نے ایک نئی ترکیب سوچی۔ ہم ایک دو سپاہیوں کو موٹر میں بٹھا کر شہر سے بہت دور لے جاتے کسی اجاڑ جگہ پر پہنچ کر ہم کرپانوں سے انہیں مار ڈالتے ....“

” شاباش“ بھوجو نے ہاتھ پھینک کر کہا ” اچھا پھر “

” ہم نے کئی مریکی مار ڈالے۔ ان کی جیب میں جتنا روپیہ ہوتا نکال لیتے اور پھر ہم نے ان کے ٹرک بھی چھاؤنی سے چرانے شروع کر دیئے۔ ٹرک کی باڈی کچھ جلاتے کچھ برباد کر ڈالتے اور ان کے انجن اپنی لاریوں میں پھٹ کر دیتے تھے۔ اب کبھی وہاں جاؤ تو دیکھو کہ بل کل چر کھڑا لاریاں بھی ایسا سرپٹ بھاگتی ہیں کہ حیرانی ہوتی ہے۔ ان سب میں مریکی انجن فٹ کئے ہوئے ہیں “

جورا سنگھ نے بہت خوش ہو کر پوچھا ” تو کتنے مریکی مارے تم نے ...“

” مجھے معلوم نہیں ...... تین چار تو میں نے اپنے ہاتھ سے مارے تھے۔ پھر ان کی فوج میں کھلبلی مچ گئی کہ سپاہی اور افسر کہاں غائب ہو رہے ہیں۔ جب بڑے افسر کو سب باتوں کا پتہ چلا تو آخر نکالا کہ کوئی مریکی سپاہی یا افسر ڈریوروں کا کرایہ نہ مارے ..... اس کے بعد مریکی سپاہیوں کے کان کھل گئے اور وہ موٹر میں بیٹھنے سے پہلے ہی کرایہ دے دیتے تھے ..“

یہ کہہ کر بالا سنگھ نے بڑے تفاخر اور مخصوص انداز میں اصیل مرغ کی طرح

سر بلند کر کے حاضرین کا جائزہ لیا اور بیان اس فقرے پر ختم کیا۔ اور پھر وہ ہمیں مشٹر سنگھ کہہ کر بلاتے تھے۔"

مجو جا سنگھ اپنی ران پر دھپ لگا کر جو ہنسا تو سب کی ہنسی دب کر رہ گئی۔

"مشٹر..... ہاہا..... مشٹر سنگھ..... وہ کہا ہے نا "مولا بخش ہے بگڑیاں تگڑیاں دا"۔"

سب لوگوں کو اس طرح خوش ہوتے دیکھ کر پالا سنگھ کے دل کو بھی کچھ کم مسرت حاصل نہیں ہوئی۔ سب لوگوں کے دلوں پر اس کا رعب طاری تھا۔ آخر وہ دُنیا دیکھے ہوئے تھا اور پھر ایسے ایسے لوگوں سے مل چکا تھا۔ جن کا ان لوگوں نے پہلے کبھی نام تک نہیں سُنا تھا۔

جب تک لوگ ہنستے رہے۔ پالا سنگھ چُپ رہا۔ اس دوران میں اس نے صرف دو مرتبہ تھوک کی پچکاری پھینکنے پر اکتفا کیا۔ وہ چُپ ہو گئے تو اس نے پھر کہنا شروع کیا۔

"ہاں ایک بات ہے کہ کھبشی (حبشی) بھی بڑے تگڑے ہوتے ہیں۔"

"یہ کھبشی کون ہوتے ہیں؟"

ہر پرشاد نے موقع دیکھ کر رُعب جمایا "کھبشی نہیں حبشی وہ افریقہ میں رہتے ہیں۔"

حاضرین کو کھبشی اور حبشی میں کچھ ایسا فرق محسوس نہ ہوا۔ اور ہر پرشاد کی معلومات پر بھی انہیں کچھ ایسا اعتماد نہیں رہا تھا۔ یہی دو چار کتابیں ہی تو پڑھا تھا۔ منشی بنا پھرتا ہے۔ لوگوں نے دلوں میں سوچا۔ چنانچہ کرم دین نے ہر پرشاد کو مارنے کے انداز سے حقے کی نے اٹھاتے ہوئے کہا "اوئے رہنے دے اپنی ایل میت (علمیت) ہم بڈھا پالی سے پوچھ رہے ہیں۔"

ہر پرشاد کا دل اس بات پر بہت دُکھا کہ اس کی بجائے اب کرم دین پالی کا سگا بنتا جا رہا ہے۔ لیکن اس نے تحمل کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

"ہاں بیٹا، پالی تم ہی بتاؤ۔"

خود سر پاآی نے ہر پرشاد کی اصلاح کو نظر انداز کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔
"ہاں تو ایک کھبشی میرا دوست بن گیا تھا۔ وہ لوگ بہت کالے ہوتے ہیں۔ کالے ڈھوت....."

"اچھا" نواب نے تعجب کا اظہار کیا۔

"وہ بہت لمبے چوڑے ہوتے ہیں۔ ہاتھ پاؤں بھی کھوب بڑے بڑے سر تربوزح کے برابر۔ ناک چوڑی۔ نتھنے پھیلے ہوئے....."

"تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ وہ کہاں کے رہنے والے ہوتے ہیں۔ ایک لڑکے نے یاد دلایا۔

"ہاں جو میرا دوست تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ بھی مری کا رہنے والا ہے۔ جس طرح یہاں گریجی ہمیں کالا آدمی کہتے ہیں۔ اسی طرح مری کا میں گورے مریکی کالے مریکی کو یو کالا آدمی کہتے ہیں....."

حاضرین یو کا لفظ سن کر اور مرعوب ہو گئے۔

رکشنا بولا "نواب یہ بھی گریجی بولنے لگا ہے۔ پہلے تو شرف بی آپا سی ہی گریجی میں گٹ پٹ گٹ پٹ کیا کرتا تھا"

"کون؟" پاآی نے پوچھا۔

"تم نہیں جانتے اسے۔ وہ ٹیکو شاہ (گاؤں) کے لمبردار کا لڑکا ہے۔ آج کل پھوزح میں لفٹین بن گیا ہے"

"ہوں، تو....."

"چھوڑ یار اب لفٹین کا کہہ (قصہ) لے بیٹھے۔ ہاں تو وہ تم کھبشی کی بات کر رہے تھے" نواب جھلا کر بولا۔

"ہاں تو وہ میرا پکا یار بن گیا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ پہلے مریکی کرایا نہیں دیتے تھے تو پھر جب ہم نے انہیں قتل کرنا شروع کیا، تو سیدھے ہو گئے۔ اس نے کہا۔ یہ لوگ جو اپنے رنگ کی وجہ سے ہم کو بیا کو بہ کہتے اور نفرت کرتے ہیں ان کا یہی علاج ہے۔ ایک دن آئے گا جب ہم کالوں کا راج ہوگا"

"ہو ہو...... ہو ___ ہو ہو...... ہو" ہماری باغیچی لوگوں کی ہنسی سے گونج اٹھی۔

پالا سنگھ نے غیر شعوری طور پر اپنی مونچھوں کو چھوا "جب وہ لوگ لڑتے ہیں تو ہماری طرح ایک دوسرے کے ساتھ پٹنے کی کوشش نہیں کرتے بس دور ہی دور سے گھونسے مارتے ہیں اور اسے وہ با..... باک سنگ.... کہتے ہیں"

"باق ___ سنگھ" دو تین کے منہ سے نکلا۔

"سنگھ نہیں سنگ........ ہو ہو بھئی باک سنگ کسی سکھ کا نام تو نہیں، یہ گھونسوں سے لڑنے کو کہتے ہیں وہ لوگ......"

"اوہ بڑا ترجائے" یہ کہہ کر کرم دین ہمہ حقے کے اور قریب کھسک آیا۔ "میں سمجھا کوئی منتر شنگھ مل گیا ہوگا۔ اس نے من بھر کا گھونسہ دیا ہوگا کسی مرکی کے منہ پہ تو انہوں نے اس کا نام باق سنگھ رکھ دیا......"

اس پر سب ہنسے تو کرم دین بھی منہ کھول کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے فخریہ انداز میں "ہو ہو" کرنے لگا۔ جیسے اس نے بڑی پتے کی بات کہہ دی ہو۔

"نہیں یہ بات نہیں" پالا سنگھ نے دل ہی دل میں ان کی کم علمی پر افسوس اور اپنی قدر دانی کئے جانے پر خوش ہوتے ہوئے کہا "تو میں کہہ رہا تھا کہ وہ لوگ آپس میں ہماری طرح گتھم گتھا نہیں ہوتے بلکہ گھونسوں سے لڑتے ہیں اور اس قدر پھرتی سے ایک دوسرے کو مارتے ہیں کہ تم لوگ کچھ انداجا ہی نہیں لگا سکتے"

"اچھا!!"

"اصل بات یہ ہے کہ ان لوگوں کے بدن میں پھرتی بہت ہوتی ہے۔ جتنی دیر میں ہم لٹھ اٹھائیں۔ اتنے میں وہ دو چار گھونسے اس قدر زور کے جڑ دیتے ہیں کہ دوسرے کی ہوش ماری جاتی ہے۔"

"ہوش ماری جاتی ہے؟"

"ہاں بھوش (بے ہوش) ہو جاتا ہے۔"

"اوہ نہیں ـــ" بھوجو نے بے چینی سے اپنے بھاری بھرکم کندھوں کو حرکت دی۔

لیکن کشن نے تائید کی: "نہیں یہ بات ٹھیک ہے۔ ہمیں کل ہی اس بات کا پتہ چل گیا تھا۔۔۔۔ اُستاد بتہیں اور کچھ گُر بھی آتے ہیں۔"

بالا سنگھ ان معاملات میں سمجھا ہوا شخص تھا۔ وہ یونہی سب کو چونکانا نہیں کرنا چاہتا تھا: "نہیں میں نے تو یونہی تھوڑے بہت ہاتھ اسی سے سیکھے تھے۔"

"تو کیا تم نے بھی باق سنگھ سے سیکھا تھا؟"

"ہاں کچھ کچھ۔۔۔۔۔ پہلے میرے کھشی یار نے مجھے بتایا کہ پھلاں جگہ مُکا مارا کرتے ہیں۔ اس بخت ہم نے تھیلے پہن رکھے تھے۔۔۔"

"تھیلے کیسے؟"

"جب سکھاتے ہیں تو ہاتھوں پر تھیلے پہن لیتے ہیں تاکہ چوٹ نہ آئے۔ انہیں گر بھی میں کچھ کہتے ہیں۔ مجھے جاد نہیں۔ تو میں نے جب اس کو نشانے پر گھونسہ مارا تو چت گرا اور اسے دن میں تارے دکھائی دینے لگے۔ اگر میرے ہاتھ پر تھیلا نہ ہوتا تو اس کی کھکھو اڑا اڑا دی ہوتی ایک سرے ہی سے۔۔۔"

"وہ سب باک سنگ سیکھے ہوتے ہیں؟"

"لیکن میرا دوست تو استاد تھا۔ وہ کہتا تھا کہ بھوج میں بھرتی ہونے سے پہلے اُس نے ایک ٹولہ بنا رکھا تھا اور کھوب لوٹ مار کیا کرتا تھا۔۔۔"

"کبھی تم نے اپنے یار کی کسی اور سے بھی لڑائی دیکھی؟"

"ہاں ایک روز ایک ہوٹل میں وہ ایک اور کھشی سے لڑ پڑا۔ دوسرا بھی بہت تکڑا تھا۔ جب لڑتے تھے تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دو پہاڑ ٹکرا رہے ہوں۔ ہوٹل کی بہت سی کرسیاں اور میزیں ٹوٹ گئیں۔ سارا سامان اُلٹ پلٹ گیا۔ سب لوگ بھاگ کھڑے ہوئے۔۔۔"

"تو تم نے اپنے دوست کی مدد نہیں کی؟"

"نہیں اس وقت ہم دونوں دوست نہیں بنے تھے۔"

"تو پھر ان میں سے کون جیتا۔"

"ابھی وہ دونوں لڑ ہی رہے تھے۔ جس کو مکا پڑتا وہ لڑکھڑا کر گر پڑتا پھر اک دم اُٹھ کر کھڑا ہو جاتا۔ ان دونوں کے منہ اور ناک سے کھون بہہ رہا تھا۔ انہوں نے لڑنا بند نہیں کیا تھا کہ پلس آ گئی اور بڑی مشکل سے انہیں چھڑا کر علیحدہ کیا اور اپنے ساتھ لے گئی۔"

نواب نے کہا: "مالوم ہوتا ہے بڑے گن سیکھ کر آئے ہو۔"

پالی نے انکسار سے جواب دیا: "نہیں یار یونہی...."

"بڑا گھٹا ہوا آدمی ہے یہ یونہی نہ سمجھ بیٹھنا اسے۔" بشنے نے کہا۔

"کیوں بک رہا ہے مفت میں۔" پالی نے دل میں خوش ہو کر اسے ڈانٹ دیا۔

اب کشنا آگے بڑھا۔ "پھرتی تو اس کے بدن میں بھی بہت ہے سیٹ سیٹ لاٹھی جو گھمائی تو دھرم نال (قسم سے) ہمیں کچھ پتہ ہی نہ چلا اور بیچارے رتنے کی وہ گت بنائی ہے اس نے۔ کہاں یار.... رتنا نہیں آیا کیا.... جہاں جہاں چوٹ لگی تہاں تہاں ٹکور کر رہا ہوگا۔"

حاضرین میں بیشتر تو پالا سنگھ کے قائل ہو چکے تھے اس کا جسم، اس کے تیور غرض ہر چیز اس حقیقت کی گواہی دیتی تھی۔ ڈنڈ پیل نوجوان بھی اس کے جسم کی دل ہی دل میں تعریف کر رہے تھے۔ وہ بعض باتوں کو سراسر گپ سمجھ رہے تھے اور بلا دو دو ہاتھ کیے وہ کہاں ماننے والے تھے۔ بعضوں کو تو ایسی کھجلی چھوٹی، کہ ابھی للکارا جائے پالی کو۔ لیکن بیچارا آج ہی کئی برس کے بعد واپس اپنے گاؤں میں آیا تھا۔ اس لئے انہوں نے مُنہ سے دلی جذبات کا اظہار نہ ہونے دیا اور یار زندہ صحبت باقی کے خیال سے مطمئن ہو گئے۔

اس گرما گرم گفتگو کے دوران میں جوالا سنگھ کے دل کی دل ہی میں رہی۔ وہ چھوٹی چھوٹی سُرخ آنکھوں سے پالا سنگھ کے جسد اور جسم کا جائزہ لیتا رہا۔ وہ بھی خرانٹ کھلاڑی تھا۔ اسے پالی کی رگوں میں وہی خون اور سختی دکھائی دی جو اس کے باپ کی رگوں میں تھی۔ لیکن اتنا اس نے بھی سمجھ لیا کہ باپ کی طرح اوچھی

اسامی نہیں ہے یہ۔ اُس نے بظاہر سُست نگاہوں سے بخوبی اس بات کا اندازہ لگا لیا کہ یہ لڑکا کسی وقت نام پیدا کرے گا اور سارے علاقے بلکہ پنجاب بھر میں تہلکہ مچا کر اپنے نام کا ڈنکا بجا دے گا۔

اس لئے اس نے ضروری سمجھا کہ کسی نہ کسی طرح سے بالی کا دل اپنی مٹھی میں کر لیا جائے یا کم از کم اس کے ساتھ بہت قریبی تعلقات پیدا کر لئے جائیں۔ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس کے قریب پہنچ کر وہ کس انداز سے گفتگو کرے کہ چند ے سکوت کے بعد کرم دین پھر بول اُٹھا "واہ پرکھ دار بالی۔ کیا مجے کی باتیں سنائی ہیں تُو نے۔ تو ہم بڈھے ہونے کو آئے۔ نہ کبھی ہندوستان جا کر کلکتہ دیکھنے نہ ایسی مجے دار باتیں دیکھنے سننے میں آئیں......"

ہر پرشاد نے ہارے ہوئے میدان پر از سرِ نو قابو پانے کے لیے کرم دین کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔

"اور استاد یہ بھی تو کہو کہ بالا سنگھ نے خود کیا ہاتھ پاؤں نکالے ہیں۔"

نہ معلوم آج کرم دین کے دماغ میں نئی نئی باتیں کہاں سے چلی آ رہی تھیں۔

"لو اور سنو تائے کی بات سُنو۔ بھلا یہ بھی کہنے کی بات ہے شیر سب کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے اور یوں بھی شیر کا بچہ شیر ہوتا ہے ارے تایا! اُس کے باپ کو بھول گئے؟"

یہ کہہ کر کرم دین تو اطمینان سے حقہ گڑگڑانے لگا اور تایا ہر پرشاد کھسیا گیا لیکن بڑا تحمل تھا اس کے اندر بھی۔ سب کچھ شیر مادر سمجھ کر پی گیا۔ بزرگانہ لہجے میں بولا "بھئی ہم تو ایشور سے یہی پرارتھنا کرتے ہیں کہ ہے پربھو! ان کی جوانی بنائے رکھ۔ دُنیا میں خوب پھلیں پھولیں۔"

اب کرم دین کو بھی ہاں میں ہاں ملائے بغیر چارہ نہ رہا۔ ایسے نیک مقصد کے لیے وہ اپنے خدا سے دُعا کیوں نہ مانگے۔ چنانچہ اس نے دُعا مانگنے کے انداز سے ہاتھ اُٹھا دیئے "ہاں بھئی یہی دعا کرنی چاہیئے۔ ہمارا کیا ہے۔ ٹانگیں قبر میں لٹکائے بیٹھے ہیں کہ بھلا تیرا بھی بھلا۔"

ایک مرتبہ پھر سنجیدہ فضا پیدا ہو گئی اور بزرگانہ جذبات کا مظاہرہ بھی ہونے لگا تو بھلا جوالا سنگھ جو اتنی دیر سے من مارے بیٹھا تھا۔ یہ سنہرا موقعہ ہاتھ سے کیوں جانے دیتا۔ وہ داتوں سے بندھے ہوئے گٹھے سے اپنی پیٹھ کھجاتے ہوئے آگے بڑھنے لگا اور بیشتر اس کے اس کے منہ سے کوئی آواز نکلے اس کے بے تحاشہ گوشت سے پرچہرے کے کئی عضلات میں حرکت پیدا ہو جانے کے باعث کوئی جگہ اُبھری تو کوئی پچکی "ہو بالی!"

بالی نے یہ بھاری آواز سُنی تو اسے محسوس ہوا جیسے کوئی شخص بہت بڑے مٹکے کے اندر منہ ڈالے بول رہا ہو۔ اُس نے گھوم کر جوالا سنگھ کی طرف دیکھا تو اپنے سامنے لمبا چوڑا۔ ڈھیلے ڈھالے گوشت گھنے بالوں والا شخص کھڑا پایا۔ اس کی آنکھوں کے نیچے تھیلے آئے تھے جو علامت تھی زیادہ عیاشی اور شراب نوشی کی۔ بالا سنگھ نے اسے سر سے پاؤں تک چپ چاپ دیکھا۔

جوالا سنگھ ہنسنے لگا۔ اس کے آڑے ترچھے بھدے دانت منہ کالے مسوڑھوں کے نمایاں ہو گئے۔ اس کا چہرہ آگے کو جھک گیا اور اس کے کانوں میں پڑے ہوئے مندرے لرزنے لگے۔ اس نے اپنی پھیلی پھیلی کثیف آنکھیں بالی کی شفاف آنکھوں میں گاڑ دیں۔

"مجھے پہچانا نہیں؟"

بھلا وہ بیچارا کس کس کو پہچانتا۔ لیکن جوالا سنگھ جواب کا منتظر تھا۔ اس کے بالوں سے اٹے ہوئے نتھنوں اور تاریک غار کی مانند کھلے منہ میں سے دم بدم گرم ہوا خارج ہو کر بالی کی گردن کو چھو رہی تھی۔ اپنے سوال کا جواب خاموش نفی میں پا کر جوالا سنگھ نے نچلا جبڑا آگے کو بڑھا دیا۔ پھر بادل کی گڑگڑاہٹ کی طرح ہنسی کی آواز اس کے حلق سے نکلتی ہوئی یوں معلوم ہونے لگی جیسے یہ اس کی صندوق کی سی چھاتی سے پرے اس کے بھاری بھرکم پیٹ کی تاریک ترین گہرائیوں میں سے نکل رہی ہو۔

بالی اس کے آگے کو بڑھے ہوئے چوڑے جبڑے اور مضبوط ٹھوڑی دیکھ کر

بخوبی اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ ایک مضبوط ارادے کا سنگ دل شخص تھا۔ ہنستے وقت اس کے نچلے ہونٹ سے بھی قدرے آگے کو بڑھی ہوئی زبان سے اس کا اجڈپن صاف عیاں تھا۔ جوالا سنگھ نے ہنستے ہنستے اپنا بدن سیدھا کر لیا اور پھر اپنا بازو بڑھا کر پالی کو اس کی قینچی سے کتری ہوئی گھنی ڈاڑھی میں سے پسینے کی تیز بُو آئی۔ پھر وہ گھوم کر پالی کے مقابل آ گیا اور بازو پھیلا کر اپنے ہاتھ پالی کے دونوں کندھوں پر دھر دیئے اور خود سپاہیانہ انداز سے سیدھا کھڑا ہو گیا۔

"میں جوالا سنگھ ہوں۔"

پالی کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ جوالا سنگھ کون ہے۔

"میں جوالا سنگھ ___ تمہارے باپو سنتا سنگھ کا جگری دوست ....."

یہ کہہ کر جوالا سنگھ پُراسرار انداز میں اپنا چہرہ، اس کے چہرے کے بہت قریب لے آیا۔ یہاں تک کہ پالی کو اس کی گدلی آنکھوں کے گوشوں میں پڑے ہوئے سُرخ سُرخ ڈورے دکھائی دینے لگے..... "ہم دونوں کا بڑے بڑے مارکوں میں ساتھ رہا۔"

اتنی سی تمہید کے بعد اُس نے ترکی مُرغ کی طرح گردن اُوپر اُٹھا کر حاضرین کا جائزہ لیا۔ تایا ہر پرشاد اور کرم دین کی طرف ان کی حمائت حاصل کرنے کے لیے پُر معنی نظروں سے دیکھا۔ دو تین مرتبہ مُنہ سے چٹخارے کی سی آواز نکالی جیسے وہ کوئی بڑی اہم بات کہنے کو ہو۔

"پالی تو اپنا بیٹا ہے۔"

اس کی اس قدر غیر اہم بات کا حاضرین پر کوئی ردِّ عمل نہ ہوا۔ وہ لوگ اپنے اپنے مشاغل یا دھیان میں مگن رہے۔ اس پر جوالا سنگھ یونہی اِدھر اُدھر سر گھما کر خود بخود ہی 'ہو ہو ہو' کر کے ہنستا ہوا پیچھے کی جانب ہٹنے لگا اور چند قدم پرے جا کر بلند آواز میں بولا۔

"بیٹا پالی تو نے اپنے گاؤں کے کسی آدمی کو بھی نہ پہچانا۔ جب لٹنے کٹنے سے پہلے تیری لڑائی ہوئی تو پھر کیا انہوں نے تجھے پہچان لیا تو نے....."

اس دوران میں پالی عجیب ذہنی کش مکش میں مبتلا رہا تھا۔ وہ کچھ فیصلہ ہی نہ کر سکا کہ کیا کہے۔ لیکن جوالا سنگھ کے اس سوال پر اس کی باچھیں چر گئیں۔ اور دانت نکل آئے۔

"میں بہت چھوٹا تھا جب یہاں سے گیا تھا۔ اس لئے مجھے اس عمر کی صورتیں تو یاد تھیں۔ لیکن اب ان کو پہچاننا واقعی مشکل تھا۔ لیکن جب میں نے رتنے کو دیکھا تو مجھے اس کے بھینگے پن کی وجہ سے اسے پہچاننے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی..."

کرم دین نے منہ سے نے ہٹا کر رتنے کی بھینگی آنکھوں کی نقل کرتے ہوئے کہا "اور جب اس نے یوں ٹیڑھی نظروں سے دیکھا ہوگا تو تم نے خود بخود پہچان لیا ہوگا..."

اس پر لڑکے کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

تایا ہر پرشاد نے پہلے پنیانی اور پھر سارے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑے مدبرانہ انداز میں کہا "ہاں بھئی بچپن میں انسان کی صورت کچھ اور ہوتی ہے اور جب جوان ہو جائے تو پھر بالکل ہی بدل جاتی ہے۔ کیوں جوالے! تو ہی بتا۔ اگر تجھے سب کی زبانی معلوم نہ ہو جاتا کہ یہ سنتا سنگھ کا بیٹا پالی ہے تو کیا تو اسے پہچان لیتا؟"

جوالا سنگھ کو نہ معلوم اس میں اپنی تضحیک کا کیا پہلو دکھائی دیا۔ لیکن وہ اسے پی گیا "ہو..... تو ٹھیک کہتا ہے تایا..."

ہر پرشاد کو اس کے تایا کہنے پر غصہ آیا "ابے تو میرا ہانی (ہم عمر) ہے تو مجھے تایا کیوں کہتا ہے......"

"تایا ہی کہوں گا اب تو" جوالا سنگھ کو گویا بڑے مذاق کی بات سوجھ گئی۔

"اگر ضرور کہنا ہی ہو تو باپ کہہ لیا کر....." ہر پرشاد نے جل کر جواب دیا۔

"اوئے اوئے..... ہوش کر..... ہوش کر..... لالہ ابھی مور بنا دوں گا"

اب جوالا گرم ہوا اور ہر پرشاد تیر نشانے پر لگنے کے باعث مسکرانے لگا۔
دفعتاً کرم دین نے سر ہلا کر کہا "لیکن بھئی دور سے باآئی عین مین پرتھی پال سنگھ کی طرح دکھائی دیتا ہے۔"
"ہاں بات تو ٹھیک کہتے ہو۔" ہر پرشاد نے حامی بھری۔ "لیکن پرتھی پال سنگھ میں ایک تو شہری پن پیدا ہو گیا۔ کچھ شہریوں کی سی نزاکت بھی آگئی .... رنگ بہت گورا ہے۔ چہرہ تو بہت ہی خوبصورت ہے واہ وا ..."
جوالا سنگھ ایک قدم آگے بڑھ کر بولا "چہرہ خوبصورت ہونے سے بھی کیا ہوتا ہے۔ جسم میں وہ تاکت نہیں ہے اس کے دل میں ہمت بھی وہ نہیں۔ اور پھر سنا ہے بہت بدماش ہو گیا ہے۔"
"ارے ہوگا" کرم دین نے دوٹوک فیصلہ کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔
"ہمیں اس سے کیا متبل (مطلب)۔ وہ ٹھہرا دوسرے گاؤں کا لڑکا۔ اور باآئی ہمارا اپنا بیٹا۔ وہ کھبصورت ہے تو ہوا کرے ہمیں کیا۔ باآئی سے ٹکر تو ہو نہیں سکتا ....."
باآئی پہلے بھی ایک مرتبہ پرتھی پال سنگھ کا نام سن چکا تھا۔ اس نے پوچھا۔
"کیا وہ آج کل یہیں رہتا ہے ... میرا مطلب ہے اپنے گاؤں میں۔"
"نہیں وہ تو پلٹین ہے پھوج میں چھٹی پر آتا ہے .... گاؤں قریب ہی تو ہے۔ اِدھر بھی آنکلتا ہے۔ پھوج میں جانے سے پہلے سہر میں پڑھتا تھا۔ پڑھنے میں جی نہیں لگا تو بھاگ کر پھوج میں بھرتی ہو گیا ....."
"ہاں بھئی کچھ اور بھی سنا تم نے؟" ہر پرشاد کی آواز گونجی۔
"کیا بات" دو تین کے منہ سے نکلا۔
"سنا ہے اس کو نوکری سے برخاست کر دیا گیا ہے۔"
"کیوں"
"بھئی ٹھیک پتہ نہیں۔"
"پھر بھی"

"کچھ بدمعاشی کی ہو گی....."

"بدمعاشی کیسی؟"

"سنی سنائی بات ہی تو ہے"

"کہتے ہیں اُس نے اپنے صاحب کی میم کو چھیڑ دیا تھا۔ اس پر اسے نکال دیا"

"واہگی"

"جبھی الیشور جانے"

"اس کا مطلب ہے اب گھر کو چلا آئے گا وہ"

"ہاں پھر اور کیا کرے گا"

اس موضوع پر کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں۔ آخرکار دھوپ مدھم ہونے پر لوگ کم ہونے شروع ہو گئے۔ بعض کھیتوں کو چل دیئے اور بعض گھروں کو۔

پالا سنگھ سالہا سال تک بہت بڑے شہر میں رہتا رہا تھا۔ اب گاؤں کی مختصر سی زندگی اسے کچھ عجیب سی معلوم ہو رہی تھی۔ تاحدِ نگاہ کھیتوں کے سلسلے۔ ادھر تُن کا درخت۔ اس کے نیچے بیلوں کے لیے گارے کی بنی ہوئی کھرلیاں، کانٹے دار خشک جھاڑوں کے باڑے، قلابازیں بھرتے ہوئے بچھڑے۔ سیدھے سادے رنگوں کے کپڑے پہنے ہوئے عورتیں۔ سب چیزوں سے وہ ازسرِ نو مانوس ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ دن بھر کی باتوں کے بعد اس کا دل آپ ہی آپ اُچاٹ ہو رہا تھا

اس نے سوچا کہ وہ ذرا سرنوں کو مل آئے۔

اس کے دوست بھی یکے بعد دیگرے رخصت ہو گئے۔ دوپہر کے بعد کچھ وقفہ لوگ پھر اپنے اپنے کاموں میں گزارتے تھے۔ البتہ شام کے وقت دوبارہ رونق ہو جاتی۔ کبھی کوئی کھیل کھیلا یا کلائی پکڑنے، مگدر ہلانے اور مونگلیاں گھمانے کا مقابلہ ہونے لگتا۔

اس نے کچھ سوچ کر چارپائی کو زمین سے اُٹھا کر آڑا کیا ہی تھا کہ اتنے میں جوالا سنگھ کی بہن آن پہنچی۔

اس نے آتے ہی مردانہ آن بان سے جوالا سنگھ کی طرف دیکھا اور جوالا سنگھ
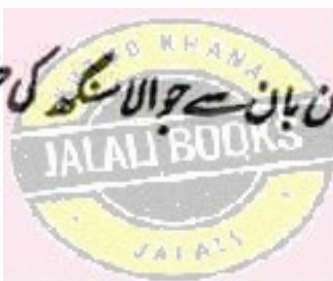
سے مخاطب ہو کر پوچھا "یہ کون ہے ؟"
جوالا سنگھ اٹھ کر بہن کے قریب چلا آیا اور کہنے لگا ۔
"پہچانو تو جانو ۔"
چنتو نے اپنی تیز آنکھوں سے بالا سنگھ کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا ۔
"جوان تو بہت اچھا ہے ۔ مجھے پسند ہے ۔ لیکن میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا ۔"
بالا مسکرا کر چپ چاپ نوارد عورت کی طرف دیکھنے لگا ۔ وہ اس کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا ۔ عورت صورت سے ذہین دکھائی دیتی تھی ۔ اس کی متحرک اور متجسس آنکھوں سے یوں ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ دنیا کا سرد و گرم اچھی طرح چکھ چکی ہو ۔ پتلے مسکراتے ہوئے ہونٹوں اور چہرے کے دیگر خد و خال سے بھی مردانہ کرختگی کے علاوہ ذہانت ٹپکتی تھی ۔ جوالا سنگھ نے اسے زیادہ دیر تک تاریکی میں رکھنا مناسب نہ سمجھا ۔ مدھم لیکن گونج دار آواز میں بولا ۔
"یہ سنتا سنگھ کا بیٹا بالا سنگھ ہے جو ...."
"اوہ میں جانتی ہوں ۔ یہ بچپن میں ہی بھاگ گیا تھا" یہ کہہ کر بالا سنگھ کے بہت قریب آ گئی ۔ اس قدر قریب کہ دونوں ایک دوسرے کے خدوخال بخوبی دیکھ سکتے تھے ۔
بالا سنگھ کو یوں محسوس ہوا کہ ادھیڑ عمر کی اس عورت کے جسم میں خون نہیں پارہ بھرا ہوا ہے ۔ وہ اس کے قریب ایک لمحہ کے لیے سپاہیانہ انداز میں سیدھی کھڑی رہی ۔ پھر اس نے مردانہ انداز میں اپنا داہنا ہاتھ اس کے کندھے پہ مار کر مسکراتے ہوئے کہا ۔
"آخر تم آ گئے ..... اچھا کیا " یہ کہہ کر اس کے ہونٹ بند ہو گئے ۔
بالا سنگھ کو اس عورت سے مل کر مسرت محسوس ہوئی ۔

۵

اپنے گاؤں میں واپس آجانے کے بعد چند روز تک تو بالا سنگھ کی طبیعت اکھڑی اکھڑی سی رہی۔ اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ اسے گاؤں کے لوگ یا یہاں کی فضا پسند نہیں۔ بلکہ وہ ہندوستان کے سب سے بڑے شہر سے دفعتاً پنجاب کے ایک دور افتادہ گاؤں میں چلا آیا تھا۔ اس لیے ظاہر ہے کہ فضا کے انوکھے پن سے مانوس ہونے کے لیے کچھ مدت تو درکار ہے۔ کلکتے میں بھی وہ ایک معمولی محلّے کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہتا تھا جو درحقیقت ایک ہی کمرے اور ایک چھوٹے باورچی خانے پر مشتمل تھا۔ لیکن کم از کم دیکھنے میں تو فلک بوس عمارتیں موجود تھیں۔ اعلیٰ ہوٹل، سیرگاہیں، سینما گھر اور دور نو کی رنگا رنگی نظر کے سامنے رہتی تھی۔ اس کے اپنے کمرے میں مٹی کے تیل کی لالٹین ہی روشن ہوتی تھی۔ لیکن سڑکوں پر برقی قمقموں کی بہار ہوتی تھی۔ بھانت بھانت کے لوگ اور بھانت بھانت کی بولیاں۔ صبح سے شام تک زندگی کی ریل پیل اور شوروغل ایسا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ایسی فضا میں پیشے کے لحاظ سے بظاہر وہ موٹر ڈرائیور تھا۔ لیکن موٹر چلانا تو سائیڈ بزنس ہو ہو SIDE BUSINESS تھا۔ ورنہ روپیہ کمانے کے اصل ذرائع تو قطعی مختلف تھے۔ وہ فطرتاً ہوشیار آدمی تھا اور پھر آغاز ہی سے اسے چند کہنہ مشق استادوں کی سرپرستی حاصل ہو گئی تھی۔ انہیں کا صدقہ تھا کہ اس کمسنی میں ہی اس کا ہاتھ بہت صاف ہو گیا تھا۔

ہر بڑے شہر میں دو طرح کی زندگی ہوتی ہے۔ ایک تو روزِ روشن کی طرح ظاہر اور دوسری پوشیدہ۔ عوام جو معمولی طور پر روزی کماتے، بچے پیدا کرتے اور زندگی کے دیگر جھمیلوں سے نبٹتے ہوئے اپنے دن گزارے چلے جاتے ہیں ان کے لیے زندگی کا یکسر دوسرا پہلو بڑی دلچسپی کا باعث ہوتا ہے۔ وہ خود اس قسم کی زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ البتہ اگر وہ چاہیں تو اس سے روشناس ہو سکتے ہیں۔ اور یہ اس قدر مشکل نہیں ہے جس قدر مشکل کہ وہ عام طور پر اسے سمجھتے ہیں۔

بالا سنگھ اسی "پوشیدہ" زندگی کا باشندہ تھا وہ جانتا تھا کہ سڑک پر چلتے چلتے کن لوگوں کے ذریعہ وہ پانچ منٹ کے اندر اندر ایک خوبصورت عورت حاصل کر سکتا ہے۔ اُسے معلوم تھا کہ کیسے بدمعاش کہاں سے حاصل کئے جاتے ہیں بیچارے سیدھے سادے اور پڑھے لکھے شہری بھی ان آدمیوں کو جو پاجاموں کے نیفوں میں چاقو اڑسے پھرتے ہیں۔

غنڈے اور بدمعاش سمجھ کر ان سے بُری طرح خائف رہتے ہیں۔ بالا سنگھ ایسے "بدمعاشوں" کی صورتیں دیکھ کر مسکرا دیا کرتا تھا۔ وہ اس بات سے بخوبی واقف تھا کہ اوّل تو ان لوگوں کا بدمعاشی سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ اگر ہو بھی تو سمجھنا چاہیئے کہ ابھی وہ اس فن کی کچی پہلی جماعت میں پڑھتے ہیں۔ وہ ان شراب خانوں، قحبہ خانوں اور رخنہ اڈوں کو اچھی طرح جانتا تھا جو بدمعاشوں کے گڑھ تھے۔ آوارگی کے دوران میں ان لوگوں سے بھی اس کی واقفیت پیدا ہو گئی تھی۔ جو بمبئی کے گھوڑ دوڑ کے میدانوں کے باہر انعام پانے والے گھوڑوں کی پیش گوئیاں کیا کرتے۔ اسی قسم کا ایک آدمی بیر سنگھ اس کے بہت ہی گہرے دوستوں میں سے تھا وہ بلا کا چپتا پرزہ تھا۔

بیرونی فوجیوں سے راہ رسم پیدا کر لینا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ اسی کے ذریعہ بالا سنگھ کا بھی کئی سپاہیوں سے دوستانہ ہو گیا۔ وہ لوگ اس کے ذریعے نت نئی عورتوں سے تعلقات قائم کرتے اور یہ ان سے جی بھر کر روپیہ بٹورتا۔ بالا سنگھ کا اصل منافع بخش کام تو بیرونی فوجیوں کی چھاؤنیوں سے ٹرک چرانا تھا۔ اس میں کئی مرتبہ

دست بدست لڑائی بھی کرنی پڑی۔ دو مرتبہ جبکہ وہ ٹرک لے کر فرار ہوا تو فوراً پتہ لگ جانے پر اُس کا بہت بُری طرح تعاقب کیا گیا۔ اس پر رائفلوں کے فائر بھی کئے گئے۔ ایک مرتبہ وہ ٹرک سمیت بچ کر نکل گیا۔ لیکن دوسری مرتبہ تعاقب کرنے والوں نے گولیوں سے اس کے ٹرک کے ٹائروں کا بھباکا اُڑا دیا۔ خوش قسمتی سے رات کا وقت تھا۔ وہ ٹرک روک کر ایک دم جنگل میں گھس گیا۔ گولیاں سیٹیاں بجاتی ہوئی اس کے قریب سے گزر گئیں۔ لیکن وہ بچ نکلا۔

امریکی "کھبتی" دوست سے اُس نے دست بدست لڑائی کے کئی نئے گُر سیکھ لیے۔ اُس کا ٹیڑھا میڑھا نام اس کی زبان پر نہ چڑھ سکا۔ اس لیے وہ اُسے کھبتی ہی کہا کرتا تھا۔

ان آٹھ برسوں میں اُس نے کئی دوستیاں پیدا کیں۔ گاؤں واپس پہنچ کر نہ صرف پُرانی زندگی اور دوستوں کی یاد ہی ستاتی رہی بلکہ گاؤں ان کی نسبتاً خاموش فضا، مختصر دلچسپیاں، کچی اینٹوں کے بنے ہوئے سیدھے سادے مکانات چند اینڈی مینڈی سی تنگ گلیاں، کوڑے کرکٹ کے ڈھیر اور انہیں کریدتے مُرغ اور چوزے دیکھ کر وہ بعض اوقات اس جگہ سے جلد از جلد بھاگ جانا چاہتا تھا — لیکن پہلے پہل صرف ایک چیز کی کشش —— یعنی سرنوں کی موجودگی کے باعث اس کے پاؤں میں بیڑیاں پڑی رہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ نئے حالات کے مطابق ڈھل گیا۔

گھر میں اس کی بھابی تاباں تھی۔ تاباں بڑی ہنسوڑ، خوش مزاج، اور باتونی عورت تھی۔ اسے پالا سنگھ کی آمد کا بڑا چاؤ تھا۔ ابھی نو عمر تھی۔ دو بچوں کی ماں بن گئی تھی۔ لیکن عمر اور صحت کے تقاضے کے سبب وہ بزرگانہ کیفیت کیونکر پیدا ہو سکتی تھی اور یہ بھی مشکل تھا کہ وہ سارا دن گاؤں کی کنواری لڑکیوں کی طرح صحبت میں انہی کی طرح اِدھر اُدھر ناچتی پھلانگتی پھرے۔ حالانکہ ابھی اس کے دل میں کوئی حسرت تھی تو لبس یہی۔ اُس نے سوتیلی ماں کی وجہ سے بچپن بھی بڑی بے کیفی سے گزارا۔ یہ محض اس کی طبعی خوش مزاجی تھی جس نے اُسے بچائے رکھا ورنہ اب تک ہلکان ہو گئی ہوتی۔ ایک دیہاتی عورت کی حیثیت سے ذہنی طور پر وہ اپنے شوہر سے

زیادہ مسرتوں کی طلبگار بھی نہیں تھی اور خصوصاً اس شوہر سے جو عمر میں بالکل نوجوان نہیں تھا۔ اور پھر زندگی کے جھمیلوں اور تفکرات نے اسے کافی سنجیدہ بنا دیا تھا۔ وہ سنتی تھی کہ بچپن میں اس کا شوہر خاصا شرارتی اور خوش مزاج تھا۔ بلکہ جب اُس نے جوانی میں قدم رکھا۔ اُس وقت بھی خاصا دبنگ تھا لیکن مخالف قوتیں اُس پر غالب آ گئیں۔ طبیعت ایک مرتبہ بجھی تو بس بجھ ہی گئی اور وہ خاصا امن پسند بلکہ دبو بن کر رہ گیا۔ سنداں تو خیر اتنی حساس بھی نہیں تھی لیکن تاباں بہت حساس واقع ہوئی تھی۔ اس کی چنچل طبیعت نہ سوتیلی ماں کے جور وستم سے بجھی اور نہ موجودہ مخالف حالات میں۔ لیکن مالی کمزوری اور گھر میں ایک بڑا کا مضبوط اور تنومند مرد کی کمی کی وجہ سے لوگوں سے مناسب احترام کروانا ممکن تھا۔ اس قسم کے ہلکے پن کے احساس سے بعض اوقات تاباں کے دل کو بہت ٹھیس لگتی تھی۔ اس لیے وہ پالا سنگھ کی واپسی کے لیے سنداں سے بھی زیادہ بے قرار تھی اور جب اس نے ایک نظر اپنے دیور کو دیکھ لیا تو بس نہال ہو گئی۔ شکل و صورت اور قد و قامت آواز اور تیور کے لحاظ سے بالکل اسی قسم کا ایک شخص وہ اپنے گھر میں چاہتی تھی۔

اس کا خیال دُرست بھی تھا کیونکہ جب سے پالا سنگھ آیا تھا۔ لوگوں کے دلوں میں احترام کے جذبات کو اُس نے بخوبی محسوس کر لیا تھا خصوصاً پالا سنگھ کی بشنے کشنے اور رتنے کے ساتھ پہلی جھپٹ تو گاؤں بھر میں مشہور ہو چکی تھی اور اس خبر پر کسی قسم کا شبہ کر کے گاؤں کا شاید ہی کوئی فرد بیٹھے بٹھائے مصیبت مول لینے پر تیار ہوتا۔

محض یہی نہیں پالا سنگھ کا سب لوگوں سے برتاؤ بھی بہت اچھا تھا۔ اس کی طبیعت میں اوچھا پن نہیں تھا۔ مفت کی اکڑ فوں اور بات بات پر جھگڑا کھڑا کرنے یا دوسرے کو دھمکانے کی اُسے عادت نہیں تھی۔ پالا سنگھ کو اپنے بازوؤں اور اپنی عقل پر پورا اعتماد تھا۔ نیکی اور شائستگی کا خواہ اُس کے اندر شائبہ تک نہ ہو۔ لیکن صرف اسی اعتماد کے باعث اس کے دل میں پہنچے ہوئے رشیوں اور

مٹنوں کا سا اطمینان پیدا ہو چکا تھا۔ گاؤں کے وہ جوان جو پہلے اس کی جسمانی طاقت کی تعریف میں اپنی تضحیک کا پہلو پا کر اسے دل ہی دل میں ناپسند اور شاید نفرت کرنے لگے تھے۔ اس کے برتاؤ سے خود ہی جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔ گاؤں کے چند جوانوں نے چاہا کہ کسی نہ کسی طرح بالا سنگھ سب سے تگڑے اور بگڑے ہی بانکے جوانوں سے لڑ پڑے لیکن وہ ایسی کچی گولیاں نہیں کھیلا تھا۔ اس نے اپنی مخصوص فن کارانہ صفائی کے ساتھ ان کی سب حرکتوں اور بلاواسطہ دھمکیوں کو نظر انداز کر دیا۔ اور رفتہ رفتہ دوسروں کی لن ترانیوں کے سامنے اس کی سنجیدگی اور خاموشی، زیادہ پُروقار، زیادہ پائدار اور زیادہ طاقتور نظر آنے لگی۔ خصوصاً جب وہ جوراسنگھ کے اس پانچ من وزنی مگدر کو جو علاقہ بھر میں دُور دُور تک مشہور تھا اور جسے خود جوراسنگھ بڑے اہتمام کے ساتھ بمشکل دو مرتبہ زمین سے اٹھا کر سر سے اُوپر تان سکتا تھا، بڑے عاجزانہ انداز میں اور فقیرانہ بے نیازی سے دس مرتبہ بلا تکان اُٹھا لیتا اور پھر سر جھکا کر اس انداز سے پیچھے ہٹ جاتا جیسے وہ گاؤں کے حقیر ترین آدمیوں میں سے ہو تو لوگوں کے دلوں میں ایک نامعلوم سی دہشت بیٹھتی چلی جاتی۔ لیکن بالا سنگھ نے کبھی کسی پر ایک انگلی تک نہیں اٹھائی تھی۔

وہ دل میں اپنی تکنیک کو خوب ہی سمجھتا تھا۔ قسم قسم کے لوگوں سے نپٹ چکا تھا اس لیے وہ اپنی لائن میں علم نفسیات سے بھی واقف ہو چکا تھا۔ جس سے اُس کے گاؤں والے نابلد تھے۔ اسے اگر کوئی کسی حد تک سمجھ سکا تھا تو وہ جوالا سنگھ تھا۔ اُن تگڑے جوانوں کے جھگڑے میں وہی ایک پرانا پاپی تھا۔ دل میں وہ بھی بالی کو پورے طور پر سمجھ لینے کا دعوے دار نہیں تھا۔ لیکن وجدانی طور پر اس پر یہ حقیقت کھل گئی تھی کہ بالی کوئی معمولی شخص نہیں اور وہ برملا کہہ دیتا تھا کہ اس گاؤں میں کیا علاقے بھر میں ایک بھی ایسا آدمی نہیں جو بالا سنگھ کی عقل کو پہنچ سکے۔

تاباں کو اس بات کی فکر نہیں تھی کہ بالی کوئی کام بھی کرے گا یا نہیں بلکہ وہ اس کے آنے سے پہلے بھی یہ سمجھتی تھی کہ بالی کوئی کام نہیں کرے گا۔ وہ کہتی نہ کرے۔ گھر کے اخراجات تو بڑھے نہیں۔ آخر جہاں کتنے بھر کی روٹی پکتی ہو وہاں ایک آدمی اور کھانے میں شامل

ہو جائے تو اس سے کچھ فرق تو نہ پڑ جائے گا۔ اگر کوئی اور عورت ہوتی تو یقیناً ایک ایسے بیکار دیور کی آمد پر اُسے خوشی چھوڑ غصہ آ جاتا۔ تاباں کا زندگی کا نظریہ ابھی تک رومنٹک تھا۔ اسے دال روٹی کے تفکرات سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اس نے انہیں کبھی کوئی اہمیت نہیں دی اور پھر دنیا نے اس کے دل میں جو احساسِ کمتری پیدا کرنے کی کوشش کی تھی اور جو ایک حد تک اس کے دل میں پیدا بھی ہو چکا تھا۔ اس کی سیری بھی پالی کی گھر میں موجودگی سے ہو جاتی تھی۔

چند روز بعد لنبا سنگھ نے پالی کی بیکاری اور لفنگ پن پر زیرِ لب بڑبڑانا بھی شروع کر دیا۔ لیکن تاباں نے اس کی باتوں کو اہمیت دینا تو ایک طرف انہیں کان دھر کر سُنا تک نہیں۔ بلکہ وہ اپنے شوہر کو غلط سمجھتی تھی یعنی اس کی بات سمجھنے کی کوشش نہیں کیا کرتی تھی کہ اگر کام نہ کیا جائے تو روٹی کہاں سے آئے۔ وہ نہ معلوم طور پر سمجھتی تھی کہ پالی کی موجودگی میں کوئی خرابی پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ باقی رہی سنداں تو اسے پالی کل کا بچہ نظر آتا تھا۔ اس کے بس میں ہو تو وہ اسے گود میں اٹھائے پھرے۔ اس نے کبھی بھُوٹے منہ سے بھی پالی کو نہ کہا کہ ہمارے حالات بہت اُمید افزا نہیں۔ بس یہی ہے کہ کھائے پیئے جا رہے ہیں۔ جاٹ کے ہاں ایک بھینس اور ایک گائے کوئی بڑی کائنات نہیں۔

بحیثیتِ مجموعی گھر کے حالات پالی کے موافق تھے۔ لیکن اگر نہ بھی ہوتے تو وہ ایک چڑھتے دریا کے مانند تھا۔ کوئی شے اس کے راستے میں رکاوٹ پیدا نہ کر سکتی بلکہ خس و خاشاک کی طرح بہہ نکلتی تھی۔ اگر کوئی کام ایسا تھا جسے پالی بلا کسی تحریک کے خود بخود کر دیتا تو وہ تھا تقریباً دونوں وقت بھینس اور گائے کے لیے سانی کرنا اور دودھ دوہنا۔ اس میں بھی شاید یہ لالچ شامل تھا کہ دودھ دوہنے کے بعد بھینس کا کم از کم ایک تھن دھاریں پینے کے لیے بچا لیتا تھا۔

اس کا برائے نام کام کرنا ہی اس کی بھابی کے دل کی صد تسکین کا باعث ہوتا اسے اس کی شخصیت سے محبت تھی۔ چنانچہ ان حالات میں بالا سنگھ کی بیکاری اور آوارگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اس کا معمول یہ تھا کہ علی الصبح حاجاتِ ضروری سے

فارغ ہونے کے لیے وہ گاؤں سے باہر چلا جاتا۔ اِس اندیشے سے کہ گھر میں بندھے ہوئے مویشیوں کے لیے سانی ضرور کر دیتا۔ گاؤں سے باہر داتون کرنے، نہانے اور تھوڑی بہت گپ لڑانے میں خاصا وقت گزر جاتا۔ واپس آتا دودھ دوہتا۔ پھر رات کی پکی ہوئی کھچڑی اور دیسی یا باسی روٹی اور مکھن یا اسی قسم کی اور کسی چیز کا ناشتہ کرتا۔ پھر بڑے اہتمام سے کپڑے پہنتا خصوصاً پگڑی باندھنے اور اس کے شملوں کو اُٹھانے میں کوئی کسر نہ چھوڑتا۔ پھر انگوچھے سے مونچھیں پونچھتا ہوا بھابی کے مقابل آن کھڑا ہوتا اور بڑے مخلصانہ اور فرماں بردارانہ انداز میں پوچھتا۔

"بھابی کوئی کام دام تو نہیں گھر کا؟"

اور بھابی اسے کوئی کام نہیں بتاتی تھی بلکہ شوہر اس پر دو ایک مرتبہ خفا بھی ہوا کہ وہ اس "لٹورے" کو کوئی کام کیوں نہیں بتاتی۔ لیکن تاباں شوہر کی سادہ لوحی پر بعض اوقات ہنس دیتی اور بعض اوقات جھگڑا بڑھ جانے کے خوف سے چپ ہو رہتی۔

لیکن دیور کے سوال کے جواب میں عموماً وہ چولہے میں پھونکیں مارتے مارتے دفعتاً سر اُوپر اُٹھاتی اور مارے دھوئیں کے چھوٹی چھوٹی پرآب آنکھوں کو میلے آنچل سے پونچھتے ہوئے انہیں جھپکا جھپکا کر دیور کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگتی۔

اسے چپ چاپ مسکراتے دیکھ کر وہ اپنی حرکات سے کام کرنے پر آمادگی کا اظہار کرتے ہوئے پھر کہتا: "نہیں بھابی! سچ سچ — کہو تو کوئی کام دام...."

تاباں کا منہ گیندے کے پھول کی طرح کھل جاتا۔ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہتی۔

"نہیں کوئی کام نہیں"

"واکھی؟" (واقعی)

"واکھی"

یہ سُن کر بالی اطمینان کا سانس لیتا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اور صحن میں اِدھر اُدھر نہایت اہم نظریں ڈالتا ہوا ڈیوڑھی کے دروازے کی طرف بڑھتا اور کبھی خیال آجائے تو جاتے جاتے ٹوٹی ہوئی چارپائی کی پٹیاں چرائے جانے کے خوف سے باہر والے دروازے کے قریب سے اٹھا کر صحن کے محفوظ کونے میں کھڑی کر دیتا....

تاباں کن انکھیوں سے لحیم شحیم دیور کو جھک سمٹ کر ڈیوڑھی کے دروازے میں گزر کر غائب ہوتے ہوئے دیکھتی رہتی۔

اس کے چلے جانے کے بعد اگر اس کا شوہر گھر میں نہ ہوتا (اور عموماً اس وقت وہ کھیتوں کو چلا جاتا تھا) تو اس کی پڑوسن جو اسی کی طرح خوش مزاج اور جوان تھی اور شاید پالی کو محبت کی نگاہوں سے بھی دیکھتی تھی۔ اُچک کر اپنے گھر سے ان کے صحن کی طرف جھانکتی اور پھر کہنیاں درمیانی دیوار پر ٹیک کر پوچھتی:

"چلے گئے ڈھولن (محبوب) کمائی کرنے کے لیے"

اس پر تاباں کھلکھلا کر ہنس پڑتی۔

"ہاں ڈھول ہی تو ہے"

شکل وصورت سے پالی کو ڈھول (محبوب) سے کوئی مشابہت نہیں تھی۔ وہ گھر سے نکل کر عام طور پر دینو لوہار کی دکان پر چلا جاتا۔ گو وہاں تک راستہ طے کرنے کی اسے کوئی جلدی نہیں ہوتی تھی۔ وہ راستے میں بھی گلی کی نکڑ پر کھڑے ہوئے یا دکانوں پر بیٹھے ہوئے آدمیوں سے بات چیت کرتا اور ہنستا کھیلتا تاک جھانک کرتا چلا جاتا۔

گاؤں کی لڑکیوں میں سے صرف سرتوں ہی سے اُسے محبت تھی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اسے دیگر لڑکیوں سے خدانخواستہ بیر تھا۔ حُسن صورت نہ سہی۔ لیکن اس کے مردانہ تیور اور وجاہت ہی اس کے حق میں بڑی بھاری سفارش کا کام تھی ...... وہ بھی میٹھی نظروں کا مسکراہٹ سے جواب دینا معیوب نہ سمجھتا تھا۔ لیکن ان کاموں میں وہ جنگل بلے سے زیادہ ہوشیار تھا۔ کبھی کسی لڑکی سے خواہ مخواہ نظریں لڑانے کی کوشش نہ کرتا۔ گاؤں والوں میں مفت کی بدنامی اُسے پسند نہیں تھی اور سب سے زیادہ خوف اسے سرتوں اور اس کے گھر والوں کا تھا۔ سرتوں سے اس کی شادی کے امکانات بھی تھے۔ اس لئے وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی کسی اور لڑکی کے متعلق افواہ اُڑے اور اس کا بنتا کام بگڑ جائے دیگر لڑکیوں کے معاملے

میں جس قدر محتاط تھا اسی قدر سرتوں کے معاملے میں وہ جرأت سے کام لیتا تھا۔ اس بات کا کہ دوسرے اسے سرتوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے نہ دیکھ لیں۔ خیال رکھتے ہوئے جب کبھی وہ اکیلی دکیلی مل جاتی تو وہ اس سے چھیڑ خانی کئے بغیر کبھی نہ رہتا۔ اُس نے پہلے پہل سرتوں کے وہاں بڑی پابندی سے آنا جانا شروع کر دیا تھا۔ لیکن بہت جلد ہی اپنوں ہی کے کنایوں سے اُس نے دور کی بات بخوبی سمجھ کر فوراً دوسری پالیسی اختیار کرلی۔ یعنی ان کے ہاں مناسب وقفے کے بعد جاتا۔ سرتوں کے والدین کو بھی سوائے اس کے کہ ان دونوں میں بچپن ہی سے لگاؤ ہے اور کسی قسم کا شک پیدا نہیں ہوا۔ سرتوں سے پرے پرے رہنا پالی کو بہت کھلتا تھا۔ لیکن وہ اس کی کسر دوسری لڑکیوں بلکہ زیادہ تر عورتوں سے پوری کر لیا کرتا تھا۔

شادی شدہ عورتوں میں ابھی ایسی عورتوں کی کمی نہیں تھی جو ابھی چوبیس پچیس برس سے زیادہ عمر کی نہیں تھیں۔ جن میں سے بیشتر غیر شعوری طور پر اپنے خاوندوں سے مطمئن نہیں تھیں اور پھر بالا سنگھ جیسے منچلے جوان کی چٹپٹی گفتگو سے محظوظ ہونے کو کس کا دل نہ چاہے گا۔ وہ کنواری لڑکیوں کی نسبت یوں بھی بے باک ہوتی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بدنامی کا ڈر نہ ہی چھوٹی موٹی چہل سے پتی برتا دھرم کو کوئی خطرہ۔ ان سے سب باتیں اشاروں اور کنایوں یا دیگر بالواسطہ طریقوں سے ہوتی تھیں۔ کوئی مامی کوئی چاچی کوئی بھابی بنی بیٹھی ہے۔ اس آڑ میں ذومعنی گفتگو کے دوران میں نارضامندی کے آثار نظر آئے تو راستے ہی سے پلٹ گئے اور اگر محض شرمیلی آنکھیں جھک کر رہ گئیں تو پھر انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں۔

باغیچی گاؤں کے مردوں کے کلب گھر کا کام دیتی تھی تو دینو لوہار کی دکان صرف نوجوان چھوکروں کے کلب گھر کا کام دیتی تھی۔

یوں دینو لوہار مشہور تھا لوہار کے نام سے۔ اس کے آباو اجداد لوہار رہے ہوں گے لیکن اب وہ بڑھئی کا کام کرتا تھا اور بڑھئی کا کام بھی بس برائے نام۔ محض ہلوں کی ٹھکائی کے لیے ہل دو دو چار چار دن پڑے رہتے تھے۔ دینو کی عمر ستائیس برس کے قریب ہو گی۔ لیکن اس کی صورت سے ایسی ملائمت اور آنکھوں سے ایسی سادگی ٹپکتی

تھی کہ اس کی عمر بائیس برس سے اوپر تو کسی صورت بھی نہ کہی جاسکتی تھی۔ گھر میں اس کی دادی ـــــ جو بے حد بوڑھی تھی قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی اور اس کی ماں تھی ۔ پائی کی طرح اس کا باپ بھی بچپن ہی میں مر گیا تھا ۔ ایک مرتبہ شادی بھی ہوئی تھی لیکن بیوی ایک بچی چھوڑ کر چل بسی ۔

بچی اس کی ماں پال رہی تھی لیکن وہ خود ہمیشہ کی طرح بے فکری سے دن گزار رہا تھا۔ وہ کام چور نہیں تھا۔ لیکن کام سے زیادہ اسے تاش کھیلنے اور گپ ہانکنے کا شوق تھا۔ اگر کوئی نہ ہو تو چپ چاپ اپنے کام میں جٹا رہتا۔ پنجالیاں، ہل، دہی بلونے کی مدھانیاں، گھڑونجیاں غرض اس قسم کی چیزیں اچھی بنالیتا تھا۔ کچھ دنوں شہر میں رہ کر یہ کام سیکھ چکا تھا ۔ نہ صرف اپنے گاؤں بلکہ قریب کے دیگر گاؤں کے لوگ بھی اسے اچھا کاریگر سمجھتے تھے۔ ایک اس کا سبھاؤ سیتل دوسرے اس کی باتیں تھیں بے حد میٹھی ۔ اس لیے نہ کام کی کمی تھی نہ اُجرت کی ۔ لیکن اگر کسی بات کی کمی تھی تو فرصت کی دو چار دوست آن بیٹھے جو عموماً آن ہی بیٹھتے تھے تو پھر دنوں تک اپنے کام کی نوبت ہی نہیں آتی تھی ۔ یہاں ہر نوجوان اپنی من پسند لڑکی اور اس سے تعلقات کا اظہار کرنے سے کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا تھا۔ ہر کسی کے دل کا راز یہاں محفوظ تھا۔ سبھی ایک دوسرے کے راز داں تھے۔ اس وجہ سے ان کے درمیان عجب لگا نگی کا احساس پیدا ہو گیا تھا۔ بلکہ اگر ایک دوسرے کی مدد کرنے کی ضرورت ہوتی۔ وہ اس میں ہرگز کوتاہی سے کام نہ لیتے۔

پالا سنگھ کا دوپہر کی روٹی سے پہلے کا وقت زیادہ تر اسی دُکان پر گزرتا تھا۔ دینو کو بھی اس سے لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ پہلے اس کا معمول تھا کہ دو ایک دوستوں کی موجودگی میں بھی تھوڑا بہت ضروری کام کئے جاتا لیکن جب سے پالا سنگھ نے اس دکان پر آنا شروع کیا تھا تو وہ اسے دیکھتے ہی سب کام چھوڑ چھاڑ کر ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جاتا۔

وہ پالا سنگھ کو بڑی قدر کی نظروں سے دیکھتا تھا۔ اس کے دل میں اس بات کی حسرت ہی رہی کہ وہ بھی گاؤں سے نکل کر شہر شہر گھومے۔ کہیں دُور دیس میں جائے

خیر اب وہ خود نہیں جا سکتا تھا تو کم از کم اُس کا ایک دوست تو ایسا تھا ہی جو آوارگی میں کئی برس بتا ہی چکا تھا۔ پالی باتوں کا پٹارہ تھا اور گاؤں والوں کا علم اس قدر محدود تھا کہ ان کے لیے نئی دنیا کا چھوٹے سے چھوٹا واقعہ بھی طلسم ہوشربا کی داستان سے کم نہ تھا۔ نوجوانوں کی زیادہ دلچسپی عورتوں میں ہی ہوتی ہے۔ اس معاملے میں پالا سنگھ کی زندگی کے واقعات نہ صرف تعداد میں بے شمار معلوم ہوتے بلکہ دینو اور دیگر جوانوں کے لیے بالکل انوکھے۔

دینو کی دکان پر چند اور بیکار بھی ڈیرہ جمائے رہتے تھے۔ ان میں سے سب کو دو وقت روٹی مل جاتی تھی۔ ماں باپ کا سایہ سر پر موجود تھا۔ یوں بھی پنجاب کے دیہات میں روزانہ ضروریات کی چیزیں تقریباً سبھی کو مل جاتی تھیں۔ جنگ نے رنگ اور چوکھا کر دیا تھا۔ جو رنگیلے تھوڑا بہت کام کرتے تھے وہ بھی کچھ نہ کچھ وقت نکال کر ادھر کا چکر ضرور لگاتے۔ ورنہ رات کے کھانے کے بعد جو محفل جمتی تھی اُس میں شامل ہونا تو ہر ایک نے اپنے آپ پر فرض کر لیا تھا۔

چاہ ویلے سے لے کر بھتے ویلے (یعنی لنچ ٹائم) تک پالی گپیں لڑانے میں ایسا محو ہوتا کہ اسے آگے پیچھے کا کچھ ہوش نہ رہتا۔ بیچاری سنداں پہلے پہل تو اُس کی تلاش میں سارا گاؤں چھان مارا کرتی۔ لیکن بعد ازاں جب اسے اس کے اڈے کا پتہ چل گیا تو وہ سب سے پہلے دینو کی دکان پر ہی آتی۔ پالی کو گپیں لڑاتے دیکھ کر ماتھے پر گہرے بل پڑ جاتے لیکن لمحہ بہ لمحہ چڑتی ہوئی باچھیں دل کی مسرت کو نہ چھپا سکتی تھیں۔ پہلے تو وہ زمین پر پاؤں جما کر ایستادہ ہو جاتی۔ اور چپ چاپ پالی کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگتی۔

بے تحاشہ باتیں کرتے کرتے دینو کا اشارہ پا کر یا خود بخود جب پالی ماں کو قریب کھڑی پاتا تو وہ دفعتاً چپ ہو جاتا۔ اور کچھ دیر تک تو خاموشی طاری رہتی۔ پھر پالا سنگھ حسب عادت تھوک کی پچکاری چھوڑ دیتا۔

ماں کہتی: "میں تجھے گاؤں بھر میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہلکان ہوگئی۔ لیکن تو یہاں بیٹھا ہے...."

"ہو ہو ـــــ ہو" پاتی ہنس پڑتا اور اس کے اگلے دو دانتوں میں جڑی ہوئی سونے کی مینخیں چمکنے لگتیں۔ "ماں تجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ میں یہیں دینو کے پاس بیٹھا کرتا ہوں۔ پھر تو گاؤں بھر میں کیوں ہلکان ہوتی پھرتی ہے۔۔۔۔"

"لو اور سنو، کام کا نہ کاج کا۔ میں جانوں یہاں ہر روز کیا کھچڑی پکتی ہے سارا سارا دن بیکار پھرتا رہتا ہے کام چور۔۔۔۔"

کہنے کو سنداں اس کی بیکاری پر خفا ہوتی تھی۔ لیکن دل میں اپنے بیٹے کے یہ چلن دیکھ کر وہ پھولی نہیں سماتی تھی۔

اس پر پاتی کے منہ کا بڑا دہانہ کھل جاتا۔

"اری ماں! تو لوگوں کے بہکانے میں آجاتی ہے۔۔۔۔"

"ہائے تو تو نے صبح سے کون سے کام کئے ہیں۔۔۔۔"

"میں نے بھابی سے پوچھا تھا کہ کوئی کام ہو تو بتاؤ۔ اس نے کہا کوئی کام نہیں۔۔۔ پھر میں کرتا رہا۔ مجبوراً ادھر چلا گیا۔"

یہ سن کر اسے مارنے کے انداز میں ہلکے سے ہاتھ اوپر کو اٹھاتی۔

"ہیں بے۔۔۔۔۔۔ اب ماں کو بھی آگے سے جواب دینے لگا ہے۔"

حالانکہ سنداں کو یہ ہاتھ اٹھانا بھی محض دھمکی کے طور پر ہوتا تھا۔ لیکن پاتی کہنی اٹھا کر اور سر چھپا کر اپنے آپ کو اس طرح سے بچانے کی کوشش کرتا جیسے اس کی کمر ہی تو ٹوٹ جائے گی۔

پھر سنداں ملائمت سے دونوں بازوؤں میں اس کا چہرہ سمیٹ لیتی اور اس کے گال ہلکے ہلکے تھپتھپاتے ہوئے کہتی۔

"اچھا چل روٹی۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔ تیری بھابی کب کی انتظار کر رہی ہے۔۔۔۔۔۔۔

ہم پر اتنی مہربانی تو کر دیا کر۔"

بالا سنگھ کو غصہ بہت کم آتا تھا۔ ہر ایک سے بڑی خوش مزاجی سے پیش آتا۔ لیکن اپنی ماں پر تو وہ کبھی خفا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ خواہ وہ کچھ کہہ دے۔

اس طرح سنداں ایک روز بڑی مشکل سے اپنے بیٹے کو کھدیڑ کر گھر تک

لائی۔ اب گھر پر بھابی کے شکوے شروع ہوئے وہ شکایت آمیز لہجے میں بولی۔

"نہ جانے باہر کیا رکھا ہے جو پالی ایک پل کو بھی تو گھر پر نہیں بیٹھتا۔۔۔۔"

پالی چپ رہا۔۔۔ ماں گھر سے باہر نکل گئی تو پھر کہا۔

"نہ معلوم ہمی سے کھفا ہے۔"

"ارے نہیں بھابی۔۔۔۔ بھلا تم سے کھفگی کیسی؟"

اس پر تاباں خوش ہوئی۔

"آکھر یہ کیا چکر ہے تیرے پاؤں میں ہے۔ ادھر دن چڑھا ادھر تو نے انگوچھا کندھے پر پھینکا اور چل دیا۔۔۔۔"

پہلی بار پالی خلافِ معمول چپ رہا۔

لیکن معلوم تھا کہ اس وقت بھابی کو کوئی شرارت سوجھ رہی تھی اور پھر اس وقت گھر میں کوئی اور تھا بھی نہیں۔ چنانچہ پُر معنی نظروں سے دیکھ کر بولی۔

"پہلے ہل جو تو آیا تو ہم سمجھے کوئی ہو گی۔۔۔۔"

پالا سنگھ کے کان کھڑے ہو گئے۔ بظاہر انجان بن کر بولا۔

"کون ہو گی؟"

بھابی نے مسکرا کر سکوت کیا۔

"یہی آکھر کو کوئی نہ کوئی تو ہو گی۔۔۔۔ جبھی تو۔۔۔"

اب پالا سنگھ کو بھانڈا پھوٹنے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔

"بھابی تم تو بجھارتیں بجھا رہی ہو۔"

"اے ہے بجھارت کیا ہے۔ اندھے کو بھی دِکھ رہا ہے۔"

"کیا دِکھ رہا ہے؟"

"یہی کہ لٹو ہو رہے ہیں کسی پر۔۔۔۔ جبھی تو بھابی کے پاس بیٹھنے کی فرصت نہیں ملتی۔۔۔۔"

"تو بھئی خواہ نخواہ۔۔۔۔"

"خواہ نخواہ کیسی برخوردار میری آنکھیں چندھی نہ سمجھو۔۔۔۔"

اب پالا سنگھ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"اچھا بھابی تمہیں کیسے پتہ چلا؟"

"چل گیا" یہ کہہ کر تاباں نے نازک انگلی تنبیہ کے طور پر اٹھا کر شرارت سے کہا۔" لیکن دیکھو پالی یہ بڑی کٹھن ہوتی ہے۔"

پالی کچھ شرما رہا تھا اور پھر بھی ہنسے جا رہا تھا۔" کٹھن وٹھن کیا۔ جب تمہاری سی بھابی کا ہاتھ ہمارے سر پر ہے تو پھر سب راہیں آسان ہو جائیں گی۔"

"ناں بابا ..... ہم ایسے پھیر میں نہیں پڑتے۔"

پالی نے بڑھ کر خوشامدانہ انداز میں بھابی کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔" نہیں بھابی تمہیں قسم ہے ہمارے ....."

"اوئی ہوئی ..... کیسے کاٹھ کے لیے سخت ہاتھ ہیں ..... اور بھئی یہ قسموں وسموں سے کام نہ چلے گا۔"

پالی نے مؤدبانہ سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے کہا۔

"تو پھر جو کہو گی۔"

"منہ سے کہو نا۔"

"تمہیں اکنی کا گٹا کھلا دوں گا۔"

اس پر تاباں بالکل ہی تڑخ گئی۔

"یہ گٹا وٹا تو اسی کو کھلانا ..... ہاں نہیں تو۔"

پالی نے شرارت سے تاباں کے پھولے ہوئے منہ کی طرف دیکھا۔

"پھر بھئی تم ہی کہہ دو۔"

تاباں چپ۔

"تم بگڑ گئیں ..... دیکھو ہم خوشامد کر رہے ہیں۔"

"تو پھر ہنسی کیوں اڑاتے ہو۔"

"واہگورو واہگورو ..... کون ہنسی اڑا رہا ہے جی؟"

"اور نہیں تو کیا۔"

"تو بھئی پہ ہے دل سے وعدہ کرتے ہیں ... . . جو تم کہہ دو گی ... بس وہی منظور ہو گا ہمیں۔"

"کہو بچن دیا؟"

"بچن دیا۔"

"تو میں سونا لوں گی۔"

"چلو منظور . . . . ."

"کیا چیز ہو گی بھلا؟"

"پہلی چیز تو ہو گی انگوٹھی منظور؟"

"منظور ــــ اس کا مطلب کہ دوسری چیز بھی ہو گی۔"

"ہاں ضرور ہو گی۔"

"جو تم کہو گی۔"

"منہ سے بولو۔"

"یہ اچھی رہی ابھی سے سب کچھ کہلوا لو ــــ خود بھی تو کچھ کر کے دکھاؤ۔"

"وعدہ بھولنا نہیں۔"

"واہ مجال ہے ہماری . . ."

"اچھا۔ اب کچھ باتیں بتا ڈالو۔"

"کہو۔"

"سروش ہی ہے نا؟"

"ہاں وہی۔"

"ابھی تک کچھ ہوا؟"

"کچھ نہیں۔"

"جھوٹ نہیں؟"

"بالکل سچ۔"

"اس کا کیا خیال ہے۔"
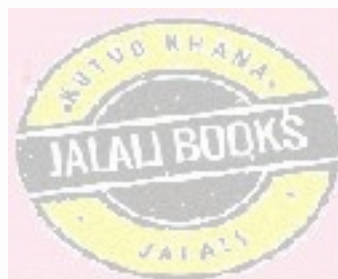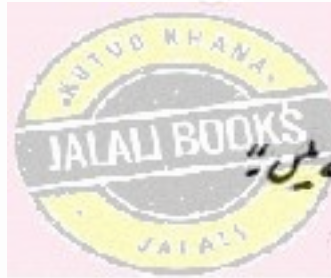
"خیال کیسا؟"

"یہی تمہارے بارے میں۔"

"بھئی کچھ معلوم نہیں۔"

"اچھی طرح بولتی ہے۔"

"بہت اچھی طرح۔"

"اور ـــ باقی کیسا برتاؤ ہے اس کا۔"

"بس ہنسے جاتی ہے۔"

"یعنی ہے اس کے دل میں بھی کچھ۔"

"کہہ نہیں سکتا ـــ اس بات کا پتہ لگانا تو تمہارا کام ہے۔"

"اچھا میں پتہ بتاؤں گی۔"

"تمہارا بہنا پا بھی ہے۔"

"میں نے خود ہی نہیں بڑھایا۔"

"تو بھابی دیکھتی کیا ہو ـــ بڑھالو نا۔"

"یہ تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔"

"بس تو آج ہی سے کام شروع کر دو۔ ابھی جاؤ۔"

"ابھی کیا بھاگڑ مچی ہے ۔ روٹی تو کھلالوں تمہیں۔"

اس روز کے بعد بھابی اس کی ہمراز اور ہمدم بن گئی وہ اسے ہمیشہ یہی نصیحت کرتی تھی کہ صبر سے کام لو۔ سہج پکے سو میٹھا ہوئے۔ بھابی کو ہمراز بنالینے سے اُسے بہت سی سہولتیں حاصل ہو گئیں۔ اسے سرنوں کی بابت کل خبریں ملتی رہتیں۔ آج اُس نے فلاں کپڑا پہنا تھا۔ اس کا مزاج درحقیقت کیسا ہے۔ وہ کن چیزوں کو پسند کرتی ہے اور کن سے نفرت کرتی ہے وہ کس وقت کہاں جاتی ہے پالی کو جب پیشتر ہی سے معلوم ہو جاتا کہ آج سرنوں فلاں وقت کنوئیں پر جائے گی۔ تو اسے راستے ہی میں گھیرنے میں آسانی ہو جاتی۔ بھابی کے مشورے اور اپنی عقل سے بھی اُس نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ وہ اس کے گھر بہت کم جایا کرے گا اور کھیتوں میں یا تنگ گلیوں میں وہ

اسے اس انداز سے ملتا جیسے ان کی یہ ملاقات بالکل اتفاقیہ ہو۔ حسب موقعہ وہ کوئی مناسب چھیڑ چھاڑ بھی کر لیتا۔ یُوں بھی اُسے یقین تھا کہ اس کی شادی سرنوں سے ہو سکے گی۔ اس لیے وہ شریفانہ حد سے قدم آگے نہ بڑھاتا تھا۔ بعض اوقات اُس کے ذہن کے گوشے میں ایک بات بہت بُری طرح کھٹکنے لگتی تھی اور وہ تھا سرنوں کا رویّہ۔

سرنوں کے اندازِ گفتگو اور حرکات و سکنات سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اسے بھی پالا سنگھ سے لگاؤ ضرور ہے۔ لیکن وجدانی طور پر پالی کبھی کبھی یُوں بھی محسوس کرنے لگتا جیسے ایک روز یہ سارا بھرم کھُل جائے گا۔ جیسے سرنوں کی ہنسی کھوکھلی اس کی باتیں بے معنی، اُس کی خوش طبعی ظاہر داری کے سوا کچھ بھی نہیں۔

پالی کو سرنوں کا ایک رنگ نہیں کئی رنگ نظر آتے تھے۔ روز بروز وہ اس کے لیے تجارت بنتی چلی جارہی تھی۔ جب کبھی راستے میں وہ اسے ملتی یا صحیح معنی میں یہ اس سے جا ملتا تو اس کی آنکھیں چمکنے لگتیں۔ وہ اُس کے لطیفوں اور ہنسی مذاق کی باتوں پر دل کھول کر کھلکھلاتی ہوئی ہنستی۔ اس کے ملائم رخسار دل کے اُبھار اور ان کی چمک میں جوانی کا لبولبریں لیتا تھا۔ اس کے ہونٹ ایک دم کو ساکن نہ ہوتے تھے۔ خواہ وہ بولے نہ بولے، خون دم بدم ان ہونٹوں کی رگوں میں سمندر کی لہر کے ریلے کی طرح آتا اور گزر جاتا۔ اسی لیے اُس کے ہونٹ متحرک یا لرزاں رہتے تھے۔ ہنسی تھی کہ پھُوٹی پڑتی تھی۔ غالباً سرنوں کو اس بات کا احساس بھی تھا۔

وہ بار بار اپنے ہونٹوں کو سنوار سنوار کر بند کرتی لیکن آنکھ جھپکنے میں وہ پھر کھل جاتے۔ ہونٹوں کے بگڑنے اور سنورنے کا عمل جاری رہتا اور ہر صورت میں حسین دکھائی دیتے تھے۔ ان کی ہستی ہی علیحدہ معلوم ہوتی تھی۔ پالا سنگھ سوچتا شاید کسی روز یہ متحرک ہونٹ مردانہ ہونٹوں کے لمس اور گرمی سے کچھ دیر کے لیے ساکن ہو جائیں جو شے ان میں اس قدر بے چینی اور تلملاہٹ پیدا کیے رہتی ہے۔ شاید اس کی تسکین ہو جائے۔

لیکن ان باتوں، اس ہنسی، اس مذاق میں کوئی ایسی شے نہ تھی جو محض بالا سنگھ کے لیے مخصوص ہو۔ سرتی کی چال یونہی اکھڑی اکھڑی سی ہوتی تھی۔ اس کی زبان میں بھی یہ اکھڑاہٹ ہوتی تھی۔ اسے اپنے ہاتھوں کا بھی کچھ پتہ نہ چلتا تھا کہ انہیں وہ کس انداز سے اٹھائے یا بڑھائے یا ہلائے۔ معلوم ہوتا تھا، کہ اس کے دل میں کئی متضاد جذبات نے گھر بنا لیا تھا اور انہیں کے اثر کے ماتحت اس کے اعضاء کی حرکات میں تغیرّ پیدا ہوتا رہتا تھا۔ لیکن جو بات بالی چاہتا تھا وہ نہیں ہوتی تھی وہ اس سے خاص طور پر جھینپتی نہیں۔ اس کی چھیڑ چھاڑ پر بگڑتی نہیں تھی بلکہ اس کی صورت سے تو یہ ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ ان کنایوں کا مطلب بھی نہ سمجھتی ہو۔

ان باتوں سے بالی عجب ذہنی مخمصے میں گرفتار ہو گیا تھا۔ اب وہ کیا کر سکتا تھا مثلاً اگر وہ کہتا:

"سرتی آج تو بہت خوبصورت دکھائی دے رہی ہو۔"

"جھوٹے کہیں کے۔"

یہ کہہ کر وہ بجائے شرمانے کے سنورنے لگتی۔ اگر وہ کہتا:

"سرتی! تمہیں دو دن نہ دیکھوں تو دل کو نہ معلوم کیا ہونے لگتا ہے۔"

"ہاں جی، تم جھوٹ بولنے میں سب کے سردار ہو۔ گھر پہ آتے نہیں۔ بھلا کے دن ہو گئے ہیں تمہیں......"

وہ کہتا۔

"سرتی! سچ کہو، تم مجھے بھی کبھی یاد کرتی ہو۔"

"کیوں نہیں۔" وہ ہنسنے لگتی۔

نہیں...... نہیں...... وہ ایسی بھولی نہیں تھی۔ وہ سب باتوں کو سمجھتی تھی۔ اتنا بھولپن عملی زندگی میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ کیا اسے اپنے حسن اور شباب کا کچھ بھی علم نہیں۔ کیا اس نے سہیلیوں کی زبانی محبت کے گیت اور قصے تک نہ سنے ہوں گے اور جب سنسان راتوں کو ہیر گانے والوں کی تانیں ساری فضائیں گونجنے لگتی ہیں تو کیا سرتی نے انہیں سنا تک نہ ہوگا۔ کبھی وہ سوچتا ممکن ہے۔ اُس نے

مجھے عاشق کی حیثیت سے دیکھا ہی نہ ہو کبھی۔ یا شاید دل میں میری چھیڑ چھاڑ کو پسند نہ کرتی ہو۔ لیکن اخلاقاً پیشانی پر بل نہ آنے دیتی ہو۔ سمجھتی ہو کہ اتنے برس باہر رہنے کے بعد آیا ہے۔ رفتہ رفتہ خود ہی سمجھ جائے گا یا مجھے جاہلِ مطلق سمجھ کر میری حرکات کو کوئی اہمیت ہی نہ دیتی ہو۔

اس قسم کے شکوک اور تفکرات اس کے ذہن کی گہرائیوں میں اُبھرتے اور پھر کبھی مٹ جاتے کبھی دب جاتے۔ لیکن اس نے کسی سے بھی ان کا اظہار نہ کیا تھا۔ سرنوں کا سلوک بظاہر اس قدر اچھا تھا کہ شکایت کا کوئی موقعہ ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔ اس گورکھ دھندے سے نکلنے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ وہ کسی روز ایسی چھیڑ خانی کرے کہ سرنوں دلی صحیح جذبات کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکے مثلاً وہ کسی روز اسے گلے سے لگا سکتا تھا۔ یا اس کے ہونٹ چوم سکتا تھا۔ پھر تو سرنوں کے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار نہ رہے گا کہ یا تو وہ شرما جائے اور مُنہ چھپا کر بھاگ جائے یا اس پر برس پڑے۔ لیکن یہ راستہ خطرے سے خالی نہ تھا۔ کیونکہ قیاس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کے والدین بھی اسے اپنا داماد بنانے کی سوچ رہے تھے اس لیے اس صورت میں سارا کھیل بگڑ جانے کا اندیشہ تھا۔ وہ ان متضاد قسم کے خیالات میں گھرا ہوا تھا اور اس باب میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔

دوپہر کے وقت جب وہ کھانا کھانے کے لیے گھر آتا تو عموماً اس کی ماں بہنے کے لیے روٹی لے کر کھیتوں کو چلی جاتی، وہ بھابی اور بچے ہی رہ جاتے۔ بھابی اور اس کی باتیں عموماً سرنوں ہی کی بابت ہوا کرتی تھیں۔ اس نے اپنے تفکرات کا ذکر تو خیر کبھی نہ کیا۔ لیکن بھابی کی باتوں سے اصل حقیقت کی ٹوہ میں رہتا۔

کھانے کے بعد اس کا معمول یہ تھا۔ کُرتا اُتار کر کندھے پر ڈال لیتا اور بغل میں چارپائی دابے باغیچی کی طرف چل کھڑا ہوتا۔ وہاں سُورج کی حدت کم ہونے تک مختلف مشاغل میں مصروف رہتا۔ کبھی تاش کبھی چوسر۔ شطرنج کی چالیں ہی اُسے یاد نہ رہتی تھی۔ اگر کھیلنے کو جی نہ چاہا تو لیے سرو پا باتیں شروع کر دیں۔ ورنہ سر کے نیچے بازو دبا کر خراٹے لینے لگے۔

گاؤں والوں سے اس کے تعلقات بھی گہرے ہو گئے تھے۔ اس کے ہم عمر سب کے سب اس کے دوست بن گئے تھے۔ کسی کو اس کے خلاف کوئی شکائت نہیں تھی۔ بڑے بوڑھوں میں اسے تایا ہر پرشاد کی باتیں بہت پسند تھیں۔ اس کا سنجیدہ اور عالمانہ گفتگو اسے بہت پسند تھا۔ وہ اسے بہت بڑا عالم سمجھتا تھا۔ تایا ہر پرشاد پڑھا لکھا تھا اور اس نے دوسروں کی بہ نسبت اِدھر اُدھر گھوم کر دُنیا بھی دیکھی تھی۔ یوں بھی وہ ذہین تھا۔ چنانچہ جب سیدھے سادے دیہاتیوں کے دلائل کو اپنی منطق لڑا کر رد کرتا تھا تو بالا سنگھ کو وہی لطف حاصل ہوتا جو دو پہلوانوں کی کشتی میں ایک پہلوان کے چاروں شانے چت گرنے پر آتا ہے۔

کرم دین بھی خاصا دلچسپ آدمی تھا۔ بالا سنگھ کو ان دونوں کی نوک جھونک بہت پسند تھی۔ پہلے دن ہی اُس نے ان دونوں کا تماشا دیکھ لیا اور بعد ازاں جب آپس میں ذرا بے تکلفی پیدا ہو گئی تو وہ انہیں لڑا کر بہت خوش ہوتا۔ وہ باری باری انہیں شہ دیتا اور وہ پیچ پیچ بحث کرنے لگتے۔ میراسیل مُرغوں کی طرح اپنی اپنی بات پر اڑ جاتے کیا مجال جو ان میں سے کوئی اپنی ہار مان لے۔
تایا ہر پرشاد ذہین اور میراسے اپنے وقار کا خیال بھی تھا۔ وہ ہتھیار کیوں ڈالے اور ادھر کرم دین آن گھر جاٹ۔ وہ بھی حقہ تازہ کرکے ہر پرشاد کے مقابل ڈٹ جاتا۔ اس کی دلیلیں سیدھی سادی ہوتی تھیں لیکن اس کا بات کرنے کا ڈھنگ ہی ایسا تھا کہ دیکھنے سننے والے مارے ہنسی کے پیٹ پکڑ کر بیٹھ جاتے آخر تنگ آکر ہر پرشاد کہتا۔

"بھئی تم ٹھہرے اڑوت جاٹ۔ تم سے سر کون کھپائے"۔
وہ دونوں ہم عمر تھے۔ ایک دوسرے کا لحاظ بہت کم کرتے تھے۔ ہر پرشاد کی اس بات پر کرم دین حقے کی نے کھینچ کر مارنے کے انداز سے اوپر اُٹھا کر کہتا۔
"کھڑار ہو ادئے بامن دیا پترا! بات نہیں سوجھتی تو منہ چڑانے پر

اُتر آئے۔"

یہ کہہ کر کرم دین پیچ پچ نے سے کر اسے پڑ پل پڑتا اور ہر پرشاد ایک ہاتھ سے عینک سنبھالتا ہوا سمٹ کر چارپائی سے چپک کر رہ جاتا اور چلا چلا کر کہتا۔

"اوئے نہ ماریں۔۔۔۔ اوئے نہ ماریں اپنے پیو نوں (باپ کو)"

اس پر کرم دین واقعی ہلکے ہلکے دو ہاتھ چھوڑ دیتا۔ اسے اپنی نے کے ٹوٹ جانے کا ڈر بھی تو لگا رہتا تھا۔

پھر جب کرم دین اپنی جگہ پر جا بیٹھتا تو ہر پرشاد کہتا۔

"یارو کرم دین پر تو وہ قصہ صادق آتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک گاؤں میں بڑا قابل پڑھا لکھا پنڈت گھومتا پھرتا آن نکلا۔۔۔۔"

اس پر کرم دین جلدی جلدی حقے کے کش لینے لگتا۔

"اس نے لوگوں سے کہا کہ میں پنڈت ہوں۔ اگر کوئی گیان دھیان کے مسائل پر بات چیت کرنا چاہے تو میں تیار ہوں۔۔۔۔ اس پر کرم دین ہی کا کوئی جاٹ بھائی کہنے لگا۔ اوئے اس پنڈت کو میں ابھی ہرائے دیتا ہوں۔ سارا گیان دھیان دھرا رہ جائے گا، سب لوگ حیران رہ گئے۔۔۔۔"

اس پر کرم دین گھور کر ہر پرشاد کی طرف دیکھتا "بیٹا! معلوم ہوتا ہے کہ ابھی اور مار کھانے کو جی چاہتا ہے تیرا"

ہر پرشاد مسکرا کر سلسلۂ کلام جاری رکھتا "جب وہ جاٹ پنڈت جی کے سامنے آیا تو پنڈت جی نے بڑے پریم سے کہا "اُچرو" یعنی فرمایئے اس پر جاٹ کہنے لگا "کھچرو، بچرو، ڈھچرو"

حاضرین کی ایسی ہنسی چھوٹتی کہ بعض زمین پر لوٹنے لگتے۔

کرم دین قدرے کھسیا جاتا۔

ہر پرشاد کامیابی کے نشے میں مخمور ہو کر کہتا "اور جھٹ پنڈت جی نے جاٹ کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے اور کہا۔

"بھائی! تم جیتے اور میں ہارا۔"

پالی، جوالا سنگھ کا بھی بڑا احترام کرتا تھا صرف اس لیے نہیں کہ وہ اس کے باپ کا دوست تھا اور دونوں نے بڑے بڑے معرکوں میں ایک دوسرے کا ساتھ دیا تھا بلکہ جوالا سنگھ کے اپنے کارنامے ایسے تھے کہ بالا سنگھ ایسے انسان کے دل میں خواہ مخواہ اس کے لیے عزت پیدا ہو گئی۔ جوالا کو بھی پالی سے اُنس ہو گیا تھا۔ اگر کبھی کھیت کے مینڈھ پر یا گوردوارے کو جاتے وقت ان دونوں کا میل ہو جاتا تو جوالا سنگھ گھنٹوں اسے اپنی زندگی کے واقعات سنایا کرتا۔ اس کی زندگی بھی کچھ کم دلچسپ نہ تھی۔ بڑے بڑے خطروں میں پھنس چکا تھا۔ کئی مرتبہ جیل بھگت چکا تھا۔ پالی نے عجیب عجیب آدمیوں کی اس کے گھر میں آمد و رفت دیکھی تھی۔ دو تین مرتبہ دن کے وقت وہ اس کے گھر میں بھی جا چکا تھا۔

جوالا سنگھ کی بہن کی شخصیت پالی کے لیے اور زیادہ دلچسپ تھی۔

پالی دل میں سوچتا کہ جوالا سنگھ کی بہن کا نام جنتو کی بجائے جگنو ہونا چاہیے کیونکہ اُس نے آج تک اسے اُداس نہ دیکھا تھا۔ وہ ہر دم تیار بر تیار رہتی۔ جیسے میدانِ جنگ کو جا رہی ہو۔ ہونٹوں پر ہنسی، آنکھوں میں چمک، حرکات و سکنات میں بلا کی پھرتی، چہرہ پر جلال، چال میں وقار ——— جوالا سنگھ نے دبی زبان میں دو ایک مرتبہ اپنی بہن کے خصائل بھی بیان کئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ جوالا سنگھ نے کسی خفیہ مقام پر ہتھیار بھی جمع کر رکھے تھے۔ کرپانیں۔ چھویاں، کلہاڑیاں چاقو، چھرے اور رسیاں اور غالباً پستول اور بندوقیں بھی۔ اس نے ان باتوں کا صاف صاف اعتراف کبھی نہ کیا تھا۔ لیکن ایک روز اُس نے پالی کو یہ حقیقت بتا دی تھی کہ جنتو کا پستول کا نشانہ بہت زبردست ہے۔ اگر دیوار پر مکھی بیٹھی ہو تو بھی اس کا نشانہ چوک نہیں سکتا۔ خود پالی نے زیادہ سوالات کرنا نامناسب سمجھا۔ اس طرح خواہ مخواہ جوالا سنگھ کے دل میں شک پیدا ہونے لگتا۔ پالی نے اتنا سمجھ لیا تھا کہ عین ممکن ہے کسی روز ان دونوں کو ایک دوسرے کا ہاتھ بٹانا پڑے۔

باغیچی میں دوپہر کا وقت کاٹنے کے بعد وہ گھر جاتا اور کھٹی لسی میں نمک کی ڈلی اور کالی مرچ گھول کر صبح کی پڑی ہوئی ایک روٹی کھالیتا۔
شام کے وقت سب لوگوں کی ملی جلی محفل گاؤں سے پرے کھیتوں میں منعقد ہوتی۔ اس وقت عموماً گاؤں کے لڑکے بالے اور نوجوان علیحدہ علیحدہ ٹولیوں میں بٹ کر کبڈی کھیلا کرتے۔ بالا سنگھ ان کھیلوں میں حصہ نہ لیتا۔ لیکن تماشائیوں میں شامل ہو جاتا۔ ہاں اگر کبھی طاقت آزمائی شروع ہو جاتی اور اسے بھی اصرار کے ساتھ شامل کر لیا جاتا تو وہ انکار نہ کرتا۔
رات کے بعد کے بعد صرف نوجوانوں کی جو خفیہ محفل جمتی۔ اس میں بالا سنگھ پیش پیش ہوتا۔ ایک دوسرے کی معشوقاؤں کی تعریفیں اور تنقیدیں کی جاتیں۔ بالا سنگھ نے اپنے عشق کا قصہ عام نہ ہونے دیا تھا۔ دوسرے جانتے تھے کہ بالی نووارد ہے۔ ابھی کسی سے عشق لڑا بھی نہیں ہوگا اور سمجھتے تھے کہ محفل میں گانے والوں کے محبت بھرے عریاں گیت سن کر ہو سکتا ہے کہ ایک روز اس کے دل میں بھی عشق کی آگ بھڑک اُٹھے۔
لیکن وہاں تو آگ پہلے ہی بھڑک چکی تھی۔ ایک روز یہ راز بھی افشا ہو گیا۔
شام کا وقت تھا۔ گاؤں کو واپس آنے والے مویشیوں کی اُڑائی ہوئی گرد نے بڑھتی ہوئی تاریکی میں گھل مل کر فضا میں اور زیادہ دھندلاہٹ پیدا کر دی تھی۔ بالا سنگھ کبڈی کھیلنے والوں کو چھوڑ کر گھر واپس آ رہا تھا۔ اس کا دل کھویا کھویا سا تھا۔ جیسا کہ کبھی کبھار ہر انسان محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس نے نگاہ اُٹھا کر اینڈے بینڈے کچے مکانوں کو اور گاؤں کی تنگ گلیوں کی طرف دیکھا جہاں اس وقت نامعلوم سی اداسی چھائی ہوئی تھی۔ خصوصاً مکانوں کے درمیان جہاں کہیں درخت اُگے ہوئے تھے۔ وہاں تاریکی اور زیادہ بڑھ گئی تھی۔ ان کے پھیلے ہوئے گدلے سائے فضا کو اور اُداس بنا رہے تھے۔ ہوا بالکل بند تھی۔ اُمس اور پسینے سے دم گھٹتا اور طبیعت بے چین ہوئی جاتی تھی۔
بالا سنگھ نے بے ڈھب پگڑی میں اپنی دو لمبی اُنگلیاں ڈالیں۔ پسینے سے

تربالوں میں سے ہوتی ہوئی انگلیاں آخر اس مقام تک پہنچ گئیں۔ جہاں وہ کھجانا چاہتا تھا۔ پھر نہ معلوم فضا کی بے کیفی سے تنگ آکر یا گرمی کی شدت سے گھبرا کر ایک لمبی سانس چھوڑی۔ کبڈی کے میدان سے چیخنے کی بہت ہی مدھم آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ بالا سنگھ کو گرمی کی وجہ سے کندھے پر پڑا ہوا انگوچھا بھاری معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے بلا سوچے اسے کندھے سے اتار کر کمر کے گرد لپیٹ لیا اور کس کر گرہ لگا دی۔ اس سے اس کی کمر کا گھیرا تنگ ہو گیا اور اس کی چھاتی کا پھیلاؤ بہت زیادہ دکھائی دینے لگا۔

سامنے نواب کا طویلہ دکھائی دے رہا تھا۔ جس کے گرداگرد چار ہاتھ اونچی دیوار بنا دی گئی تھی۔ اس دیوار کی تعمیر میں بہت گھٹیا سرمئی رنگ کی مٹی استعمال کی گئی تھی۔ اسے کبھی پوتنے کی کوشش بھی نہیں کی گئی تھی۔ چنانچہ پتلے گوبر کے چھینٹے اس پر جم کر رہ گئے تھے۔

اسے طویلے کے قریب ہی سے گزرنا تھا۔ جب وہ طویلے سے ادھر تن کے درخت تلے سے گزر رہا تھا تو دفعتاً اس کو کھیتوں سے ایک لڑکی آتی دکھائی دی۔ قیاس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ سرون ہی ہے۔ وہ ایک بیل گاڑی کے پیچھے دبک گیا۔ جب اور قریب آگئی تو اس نے دیکھا کہ اس کا خیال درست نکلا۔ چنانچہ وہ بھاگ کر چکر لگاتا ہوا طویلے کی دیوار کے پرلے کونے پر کھڑا ہو گیا۔

وہ قریب پہنچی تو وہ ہیج سے دو قدم بڑھ کر اس کے قریب چلا گیا سرون نے قدرے خوفزدہ نظروں سے اپنے شانے کے اوپر سے اس کی طرف دیکھا اسے دیکھتے ہی اس کی گھبراہٹ دور ہو گئی اور وہ ہنسنے لگی۔

"اوہ! میں تو ڈر ہی گئی۔"

یہ کہہ کر ہنستے ہنستے اس نے غالباً سنجیدہ دکھائی دینے کے لیے ہونٹ بند کر لینے کی کوشش کی۔ لیکن حسب عادت دانت نکلے پڑتے تھے۔ لیکن اس کی اس کوشش کے دوران میں اس کی گول ٹھڈی پر کئی ننھے ننھے نشیب و فراز پیدا ہو کر غائب ہو گئے۔

دھندلائی ہوئی روشنی میں اس کے ڈھیلے ڈھالے بالوں کی لٹیں جن پر گرد کی نہایت ہلکی سی تہ جمی ہوئی تھی، اس کی چمکتی ہوئی آنکھیں جو بادلوں کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں اس کے رسیلے ہونٹوں سے نکلتے ہوئے الفاظ جو دور دیس کے کسی گوشے سے آتے ہوئے سُنائی دے رہے تھے......

سرنی نے کئی مرتبہ بالی کو اپنی طرف اس انداز سے گھورتے پایا تھا اس لئے اب اس نے اس کی اس حرکت پر پریشان ہونا ترک کر دیا تھا....

"میں نگھے (قریب کا گاؤں) تک گئی تھی" اس نے کہنا شروع کیا۔

"جولا ہوں کو سوت دے رکھا ہے ہم نے...."

بالا سنگھ نے ایک ہاتھ اُٹھا کر سرمئی دیوار پر رکھ دیا۔ اور قدرے آگے کو جُھک کر آہستہ سے کہا "سرنوں مجھ سے کب تک ڈرتی رہو گی...." اور پھر اُس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ملائمت سے اپنی طرف کھینچا۔ وہ پہلے بھی اس کے قریب ہی کھڑی تھی۔ لیکن اب شاید ایک طرف کو زیادہ بوجھ پڑ جانے پر وہ ایک قدم اور قریب آ چکی تھی۔

بالی نے محسوس کیا کہ وہ اس وقت اس قسم کی حرکت پر آمادہ نہیں تھی۔ لیکن اب اسے خطرناک حد تک قریب لے آیا تھا۔ اس کی رنگین قمیض کے اوپر کے دو کھلے ہوئے بٹنوں کی وجہ سے اس کی نرم گردن کی اُجلی جلد قمیض کے کپڑے کے ہلکے رنگین سائے میں گھل مل کر اور بھی زیادہ دلفریب ہو گئی تھی۔ اُس کی چھاتیوں کا نچلا حصہ پسینہ کی وجہ سے قمیض سے چپک گیا تھا اور وہ متناسب گولائیاں اور بھی نمایاں ہو گئی تھیں۔ جذبات کے ہیجان میں سرنوں زیرِ لب بے ترتیب الفاظ سے احتجاج کر رہی تھی۔ بالی کی عقل کہتی تھی کہ اسے یہ حرکت نہیں کرنی چاہیئے۔ لیکن اب جبکہ وہ اپنے سینہ پر سرنوں کی سخت چھاتیوں کے لمس سے گویا مسحور ہو چکا تھا اس کے لیے پیچھے قدم ہٹانا ناممکن تھا....

عین اس وقت نامعلوم سا کھٹکا سنائی دیا۔ اس کے بازو فوراً ڈھیلے پڑ گئے اور آنکھ جھپکنے میں سرنوں اس کی گرفت سے باہر نکل گئی۔ اُس نے سوچا

اچھا ہی ہوا کہ میں نے سوالنگیر ہونے کے اور کوئی حرکت نہیں کی۔ شاید وہ پھر بھی ہنس رہی تھی۔ خجالت کو مٹانے والی ہنسی ...... شاید اس کے پھڑکتے ہوئے ہونٹوں پر خفگی بھری بڑبڑاہٹ تھی ...... اسے واضح طور پر کچھ بھی یاد نہ رہا ..... اُس نے دیکھا کہ وہ جلد جلد بے ترتیب کپڑوں کو درست کرتی ہوئی نہایت تیزی سے قدم اُٹھاتی گلی کے موڑ پر آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔

کش مکش کے دوران میں پالی کے دل اور دماغ میں جنگ جاری رہی وہ اس اندرونی انتشار کی وجہ سے کچھ تھک سا گیا تھا۔ اس لئے ایک لمحہ کے لیے وہ دیوار ہی سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا ...... پھر نہایت سُروں میں مدھم مردانہ آواز سنائی دی:

آئی ہے کورے

جاہ نی بے کورے

بھیڑی گل وچہ ہووے ٹاکرا

ادئے

بھیڑی گل وچہ ہووے ٹاکرا

بھائیاں تیریاں نوں خبر جو ہو جاؤ

آجان سلنگاں پھڑ کے

نی پھر توں

پھیر توں رودیں گی۔

لڑ صافے دا پھڑ کے

پالی نے چونک کر سر گھمایا تو دیکھا نواب طویلے کی دیوار پر دونوں کہنیاں ٹیکے شرارت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ دیکھ کر گیت گا رہا تھا۔

نواب اس کا دوست تھا، جگری دوست۔ یوں بھی اس کے دل میں کسی کے لیے بدی نہیں تھی۔ پھر جب وہ دیوار پر سے کود کر گلی میں اترا، تو اس

کے سیاہ بالوں والے پٹے کانوں کے پیچھے سے نکل کر آنکھوں پر آن گرے
پالی نے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور خوشامدانہ لہجے میں بولا :
"دیکھ یار اور کسی کو خبر نہ ہو۔"
وہ جانتا تھا کہ دوستوں میں تو یہ قصہ مشہور ہو ہی جائے گا۔ لیکن وہ غیروں سے یہ بات چھپانا چاہتا تھا۔
پھر رات کو جب پالی کھانے کے بعد یاروں کی محفل میں پہنچا تو سب کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔ پالی کو معلوم ہو گیا کہ ان سب کو اس کے عشق کا پتہ چل گیا ہے۔ رتنے نے اپنی بے معنی بھینگی آنکھوں کو پُر معنی بنانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔
"بیٹا عاشق کہو مجاج کیسے ہیں ؟"
پالی تھوک کی پچکاری چھوڑ کر مسکرانے لگا۔
اس وقت وہ گاؤں سے باہر ایک بہت پرانے کنوئیں کی ٹوٹی پھوٹی منڈیر پر بیٹھے تھے اور باقی سب اُونچی نیچی زمین پر بیٹھے تھے۔ کبھی اس کنوئیں پر لوگ پانی بھی بھرا کرتے تھے لیکن اب اسے مٹی سے بھروا دیا گیا تھا۔ یونہی چھوٹا سا گڑھا رہ گیا تھا یا دو بوسیدہ لکڑی کے ستون جن پر چرکھڑی پڑی رہتی تھی۔
سب لوگ نواب کو گانے کے لیے اُکسانے لگے۔ نواب نے بڑی رسیلی آواز پائی تھی۔ اس کے مقابل خیراتی بھی خوب گاتا تھا لیکن مسخرا تھا کم بخت۔ عورتوں کی آواز اور حرکات کی بہت اچھی نقل اتارتا تھا۔ دونوں کو محفل میں پاکر سب نے شور مچایا کہ ہاں جھٹی ہو جائے۔
نواب نے دفعتاً اپنا خوبصورت مردانہ چہرہ اُوپر اٹھایا اور کان پر ہاتھ رکھ کر گیت کے بول شروع کیے۔

ایس کولڑے نی   پانیئے توں کیوں جلی ایں
میرے نازکے نارے

خیراتی نے میلے کرتے کو اُلٹا کر سر پر اوڑھ لیا اور عورتوں کی طرح

گھونگھٹ سا نکال کر اپنے بھدّے موٹے ہونٹوں میں سے باریک آواز نکالی۔

السں کو ہلیڑے دے
پلینئے دی لوڑسی
میریا ڈھیا ڈھولا!

حاضرین مارے خوشی کے ناچ اُٹھے۔ بشنے نے ناک اور انگلیوں کی مدد سے گویا الغوزے بجانے شروع کر دیئے اور پھوجو نے زبان اور تالو کی مدد سے چھپ چھپا چھپ کی آواز نکال کر گویا گھونگروؤں کی آواز بلند کی۔ نواب نے بڑھ کر بالی کی پگڑی جھپٹ کر سر پر اوڑھنے کے لیے خیراتی کی طرف پھینک دی۔ بالی نے اس پر اسے دو تین گندی گالیاں دیں لیکن اُس کے جوڑے پر بندھی ہوئی جالی کے رنگین پھندنوں کی لرزش کے ساتھ نواب کی مترنم آواز گونجی۔

کیہڑی گھوہڑی نی
سانوں دس دے
میرئیے نازکے نارے

"واہ واہ ..... بلہارے ....."
خیراتی نے کمر بلائی۔

"او ہو گھوہڑی دے
سانوں بھل گئی
میریا ڈھیا ڈھولا

محفل ایک مرتبہ پھر اُچھل پڑی "ہائے او ہائے .... او ہ گھوہڑی!"

نواب نے اپنے پٹوں کو سنوارتے ہوئے ہنس کر سب کی طرف دیکھا۔
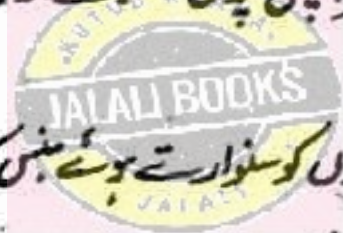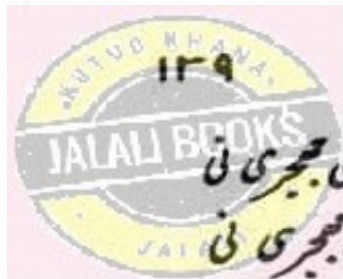
کیہڑی جھجری نی
کیہڑی جھجری نی
سانوں دس دے

میریئے ناجکے نارے

خیراتی نے اُٹھ کر بھونڈے طریق سے رقص کرنا بھی شروع کر دیا تھا اب اُس نے بڑے زور سے کر بلائی۔

ادہو جھجری وے
ادہو جھجری دے
ساتھوں بجھ پئی

میریا دھیا ڈھولا

اس پر سننے والوں کی مسرت اور وارفتگی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ بعض نے ہائے وائے کے نعرے بلند کر کے تہبند اتار پھینکے اور چاندنی میں بلا تکلف ننگ دھڑنگ اُچھل کود کرنے لگے۔

اب کے نواب نے اپنے لمبے قد کو اور لمبا کیا اور ایک ہاتھ ہوا میں لہرا دیا۔

ادہو ٹھیکری نی
سانوں دس دے

ادہو ٹھیکری نی
میریئے ناجکے نارے

اس پر خیراتی گھونگٹ اُلٹ کر نواب کے سامنے جا کھڑا ہوا اور اپنے بدصورت چہرے کو اور بھی بھونڈا بنا کر تان اُڑائی۔

ادہو ٹھیکری دے
بالک سے گئے

ادہو ٹھیکری وے
میریا دھیا ڈھولا

بالا سنگھ کے عشق کے اعزاز میں گایا ہوا یہ گیت ختم ہوتے ہی محفل میں گویا قیامت آگئی۔

۶

شام کو جو واقعہ پیش آیا تھا۔ اُس نے پاتی کو دوستوں کی محفل میں بھی بے چین ہی رکھا۔ بظاہر وہ ان کے گانوں، باتوں اور لطیفوں سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ لیکن روح پر ایک نامعلوم سا غبار تھا۔ وہ اس رات کے بعد آنے والی صبح سے ڈرتا تھا۔

بدنامی اور لڑائی جھگڑے سے وہ خوف کھانے والا نہیں تھا۔ نیک نامی کی اس کے نزدیک کوئی کشش نہیں تھی وہ سمجھتا تھا کہ آخر نیک نامی حاصل کرنے کے لیے کچھ کرنا تو نہیں پڑتا۔ کسی سے کوئی بات نہ کہو۔ اگر کوئی زیادتی کرے تو چُپ رہو، ڈاکے نہ ڈالو، پرائی استری پر بُری نگاہ نہ ڈالو۔ یعنی بُزدلی اور غیر مردانہ قسم کے کام کرنے پر نیک نامی کا تمغہ مل جاتا ہے۔ باقی رہ گئے سرتوں کے بھائی۔ اگر سرتوں انہیں کہہ بھی دے اور وہ لڑنے کے لئے چڑھ دوڑیں تو اس کا کیا بگاڑلیں گے۔ خود ہی مار کھا کر بھاگیں گے ــــــ اسے خود سرتوں سے ڈر لگتا تھا۔ بچپن ہی سے اُس کے دل میں سرتوں کی برتری کا احساس تھا وہ ستھری رہتی تھی۔ دانت صاف کرتی تھی۔ آنکھوں میں سرمہ لگاتی تھی۔ دُھوپ میں آوارہ نہیں پھرتی تھی۔ نہانے یا بال دھونے سے نہیں کتراتی تھی۔ خیر یہاں تک تو وہ اپنے دل کو یہ کہہ کر تسکین دے سکتا تھا کہ سرتی لڑکی ہے۔ اسے یہ کام کرنے ہی چاہئیں لیکن اس کا سرتی سے جو بھی اختلاف ہو وہ اس کا اظہار نہیں

کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے کوئی ایسی بات یا حرکت نہیں کرنا چاہتا تھا جس سے وہ اس کے خلاف ہو جائے۔

لیکن شام کو تو روکتے روکتے نوبت کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ پھر اس واقعہ کی تفصیلات پر غور کرنے لگا۔ اُس نے کیا حرکت کی تھی اور سرتی پر اس کا کیا ردِعمل ہوا تھا۔ لیکن اُسے واضح طور پر کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ جو کچھ اُس نے کیا ظاہر تھا لیکن اس کے نتائج کیا ہو سکتے تھے۔ وہ اس کا اندازہ لگانے سے قاصر تھا۔

دوستوں کی محفل برخاست ہونے کے بعد وہ گھر کو چلا۔ اس رات پھر گرمی بہت بڑھ گئی تھی۔ اس لئے لوگ زیادہ تر گھروں کی چھتوں پر سو رہے تھے۔ ڈیوڑھی میں سے ہوتا ہوا جب وہ صحن میں داخل ہوا تو دیکھا کہ اس کی بھابی چوکے کی گوبر... لپائی کر رہی تھی۔ اسے حیرت ہوئی تقریباً آدھی رات کا وقت تھا۔ گھر کے باقی لوگ چھت پر جا چکے تھے۔ اس نے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی مدھم روشنی میں بھابی کی طرف دیکھا جو اس وقت سر پر دوپٹے کی بجائے یونہی ایک جھاڑن رکھے اُچک اُچک کر گوبر میں سنے ہوئے کپڑے کے ٹکڑے کو چولھے پر پھیرے جا رہی تھی۔ وہ ایک لمحہ کے لیے چُپ چاپ رہا۔

پھر بولا:

"بھابی! تم اس وقت لپائی کر رہی ہو۔ میں سمجھا سو گئی ہو گی اور سب تو سو گئے ہیں نا؟"

تاباں نے حسبِ عادت ہنستے ہوئے کہا: "کاکے کے ساتھ جب تک میں نہ لیٹوں وہ سوتا نہیں۔ آج نہ تو وہ خود سویا نہ مجھے اپنے قریب سے اُٹھنے دیا۔ مشکل سے جب سو گیا تو ایک مرتبہ تو میرا دل بھی چاہا کہ سو جاؤں لیکن پھر صبح کو بھی مجھے ہی یہ سب کام کرنا پڑتا۔"

بالا سنگھ کو اس قدر طویل جواب کی توقع نہیں تھی۔ اس نے بھابی کے فقرے دھیان سے نہ سُنے تھے۔ وہ بے معنی نظروں سے صحن میں پڑی ہوئی

چیزوں کا جائزہ لینے لگا۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ چھکڑے کا ڈھڑا لگا ہوا تھا۔ اس کے قریب پنجالی۔ درانتی اور چھ پھل والی ترنگلی وغیرہ بے ترتیب پڑی تھیں وہ سوچنے لگا کہ آخر ترنگلی کی کیا ضرورت ہے۔ لہٰذا ہر چیز اندر سے نکال کر باہر ڈال دیتا ہے۔ پھر غلّے پھینکنے والی کمان کو جو دروازے کے آگے گری پڑی تھی اُٹھا کر اُس نے صحن کی دیوار میں ٹھکے ہوئے لکڑی کے کھونٹے سے لٹکا دیا۔ پڑوس والوں کے صحن میں پیپل کا ایک بھاری درخت کھڑا تھا۔ جس کی شاخیں ان کے صحن تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ان پر بیٹھے ہوئے کوّے اور طوطے نہ صرف شور مچاتے بلکہ بیٹوں کی بھی بارش کئے جاتے انہیں اڑانے کے لیے اس کے باپ نے وہ کمان ایجاد کی تھی۔ اس کمان کے دونوں سروں پر سُتلی کی دو رسیاں ایک دوسرے کے متوازی چلی گئی تھیں بیچوں بیچ غلّے کے لیے بنی ہوئی پوٹ تھی وہ اس پوٹ کو دیکھتا رہا۔ جس کے تاگے کمزور ہو رہے تھے۔ اس کی نگاہ صحن کے اس گوشے کی طرف چلی گئی جہاں پھیکی چاندنی میں پکے فرش پر بٹیں چمک رہی تھیں۔ پھر وہ ٹہلتا ہوا کھرلیوں کی طرف چلا گیا اور تھوڑی دیر تک مویشیوں کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتا رہا۔

تاباں نے نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور اسے بلا مقصد کھڑا پا کر بولی۔

"تمہیں نیند نہیں آئی۔ جاؤ تمہارا بستر بچھا دیا ہے۔ میں نے۔ سو رہو۔ صبح اُٹھ کر تمہیں سانی بھی تو کرنی ہو گی۔"

پالی نے بھابی کی بات سُنی اَن سنی کر کے یونہی بات چھیڑنے کی غرض سے کہا:

"بھابی تمہیں بہت کام کرنا پڑتا ہے۔"

تاباں نے یہ بات سُنی تو مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر سر جھکا کر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

"اب تمہاری جورو آئے گی تو میرا ہاتھ بٹا دیا کرے گی۔ بھلا سوچو پھر میں آدھی آدھی رات تک لپائی پتائی تھوڑے ہی کیا کروں گی۔"

یہ کہہ کر تاباںؔ نے قدرے سکوت کیا اور پھر اپنی بات کا ردِ عمل جاننے کے لیے اُس نے سر اُوپر اٹھایا اور پالیؔ کی طرف دیکھا۔ پالیؔ کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی اور پھر معدوم ہو گئی۔ تاباںؔ کو یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوئی۔ اُس نے ایک گول مونڈھا اس کی طرف لڑھکاتے ہوئے کہا

"اگر نیند نہیں آئی تو بیٹھو نا! کوئی مزے دار بات یا نئی خبر ہی سناؤ۔"

پالیؔ نے لڑھکتے ہوئے مونڈھے کو پاؤں سے روکا اور وہ آڑا ترچھا ہلتا ہوا بالآخر زمین پر آن رہا۔ پالیؔ بغیر کچھ کہے اس پر بیٹھ گیا اور قریب پڑی ہوئی بچوں کے کھیلنے کی چند ٹھیکریاں اُٹھا کر انہیں ہوا میں اچھالتا اور بوجھا ہوا کہنے لگا۔

"کیا خبر سنائیں۔"

"کیا معاملہ ہے...... آج اکھڑی اکھڑی سی باتیں کر رہے ہو۔ چہرہ بھی کچھ اُداس ہے......"

"نہیں تو۔"

تاباںؔ نے اپنی بات کی تردید کو قبول کر لینے کے خیال سے زیادہ طول نہ دیا لیکن دل ہی دل میں کھٹک رہی تھی کہ کوئی بات ہے ضرور۔

قدرے سکوت کے بعد پالیؔ نے ٹھیکریاں اُچھالنے اور بوجنے کا عمل جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔

آج تم گئی تھیں ___ وہاں۔"

"وہاں ___ کہاں؟"

پالیؔ چپ رہا۔ اُس نے سوچا کہ بھابی خود ہی سمجھ جائے گی..... اور دوسرے لمحہ میں وہ سمجھ بھی گئی۔

"اوہ اچھا سُسرال کے بارے میں؟...... ہاں گئی تھی۔"

"کب۔"

"دوپہر ڈھلے...... لیکن وہ نہیں تھی گھر پہ..... پھر روٹی کے بعد ڈھینگری کی کٹوری دینے......اس وقت وہ گھر پر ہی تھی۔"

پالی کے ہاتھ رُک گئے۔

"لیکن تاباں کی صورت سے کسی غیر معمولی بات کا اظہار نہیں ہوا۔ پالی اس بات کا منتظر تھا کہ وہ اور آگے کچھ کہے لیکن اس کا معمولی سکوت بھی اس کے ذہن پر بھاری ہو رہا تھا وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"وہ کیا کر رہی تھی؟"

یہ کہہ کر پالی کو احساس ہوا کہ دراصل پوچھنا وہ چاہتا تھا کہ اس کا رویہ کیسا تھا۔ لیکن......"

تاباں کے بالوں کی ایک لٹ آنکھ پر آن گری تھی۔ اس نے گوبر سے سنا ہوا ہاتھ اٹھایا اور کلائی کی الٹی جانب سے اسے پیچھے کی طرف ہٹا دیا۔ اس کی اس حرکت سے جواب دینے میں اور دیر ہو گئی۔ پالی نے بے چینی سے انگلیوں میں ایک ٹھیکری کو دبا کر توڑ ڈالا۔ ٹھیکری توڑ ڈالنے کے بعد خیال آیا کہ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ بیچارے بچے بڑی مشکل سے اچھی اچھی ٹھیکریاں چنتے ہیں۔ پھر انہیں بڑی محنت سے اینٹوں پر گھس گھس کر ہموار کرتے ہیں...... پالی کو بھی اس بات کا احساس نہ تھا کہ وہ اس کے جواب کا کس بے چینی سے انتظار کر رہا ہے اور بیچاری کو احساس بھی کس طرح ہوتا اسے یہ تو معلوم ہی نہیں کہ آج کس قدر اہم واقعہ پیش آ چکا ہے۔

آخر تاباں بول ہی پڑی۔

"وہ دیر سے روٹی کھایا کرتے ہیں۔ اسی لئے میں کھانا وانا کھلانے سے فارغ ہو کر ڈھینگری لے کر وہاں گئی تھی۔ سرواں کے باپ کو ڈھینگری کا سالن بہت پسند ہے۔ اس نے پوچھا: کہو بیٹی اچھی تو ہو۔ آج تمہیں بہت دنوں کے بعد دیکھا ہے...... میں نے جواب دیا۔ میں تو آتی ہی رہتی ہوں۔ آپ ہی نہیں کبھی دکھائی دیئے اور نہ کبھی ہمارے گھر پر آتے ہیں۔ پھر اسے جب معلوم ہوا کہ میں ڈھینگری کا سالن لائی ہوں تو کہنے لگا۔ تو بیٹی ہم تو کھانا کھا چکے...... لنیبب کی بات ہے نا، یہ کہہ کر ہنسنے لگا۔ میں نے کہا۔ آپ لوگ تو کھانا وانا بہت دیر سے کھاتے ہیں

اسی لیے تو میں بے فکری سے اس بکت چلی آئی۔ اس پر ماں بول اُٹھی۔ گرمی ہے نا آج اور پھر سبھی گھر پر موجود تھے۔ سوچا ساری الا بلا چھت پر لے جانی ہوگی کیوں نہ کھا ہی لیں...... اور ہاں لاؤ کٹوری پانی میں رکھ دیتی ہوں۔ چھت پر پڑی رہے گی تو خراب نہیں ہوگی ڈھینگری......"

پالی کو بھابی کی یہ گفتگو سُن کر از حد کوفت ہوئی اور بار بار ڈھینگری کا لفظ سُن کر تو اس کے کان پک گئے۔ اس قدر طویل گفتگو میں کام کی بات ایک بھی نہ کہی۔

اُس نے سر سے پگڑی اتار کر اپنے گھٹنے پر دھر دی۔ ڈاڑھی کے چھوٹے چھوٹے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا:

"تو تم وہاں بیٹھی رہیں یا بھگ آئیں"

"ارے بیٹھی کیوں نہیں۔ بیٹھنے کے لیے تو گئی تھی۔ ہاں اب سارا کام ٹشم پشٹم......"

پالی کا دل کچھ بھر آیا۔ ہاں بہت کام کرتی تھی بھابی۔ اور پھر اسے اپنا نِنگھ پن یاد آیا۔

"بھابی! تم بہت ہی کام کرتی ہو۔ ایک ہم ہیں۔ فالتو، بیکار اور نکھٹو......"

اپنی تعریف سُن کر تایاں خوش ہوئی لیکن اس کے ساتھ ہی بزرگانہ شفقت بھی جاگ اُٹھی:

"ارے کون کہتا ہے کہ تو نکھٹو ہے"

"سبھی کہتے ہیں"

"زبان کھینچ لوں کہنے والے کی"

پالی خوش ہوا۔

"مُنہ سے نہ کہیں دل میں تو کہتے ہیں"

"کسی کی مجال بھی ہے۔ آخر تجھے یہ وہم کیسے ہوگیا"

"نہیں بھابی! میں کبھی کبھار سوچنے لگتا ہوں..... تم اتنا کام کرتی ہو اور میں ہر روز تم سے پوچھ کر گھر سے باہر نکلتا ہوں۔"

بھابی کو دیور کے "پوچھ کر گھر سے نکلنے کی حقیقت معلوم تھی۔ تاہم اسے دیور کی یہ ادا پسند تھی۔

"ہاں ہاں پُوچھ کے تو جاتے ہی ہو مجھ سے۔" یہ کہہ کر اس نے کن انکھیوں سے پاآی کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں اور ایک ہی خیال کے تحت دونوں کے مُنہ سے بے اختیار ہنسی نکل گئی ــــ جیسے وہ دونوں ایک دوسرے کو خوب اچھی طرح سمجھتے ہوں۔

تاباں لوگوں کے سامنے دب کر رہنے والی نہیں تھی۔ فطرتاً وہ لڑاکا عورت تھی۔ اسے صرف سہارے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ جب سے پاآی گاؤں میں آیا تھا۔ وہ دو تین نہایت معرکے کی لڑائیاں لڑ چکی تھی۔ کام کرنے میں وہ تیز مزدور تھی۔ لیکن گھومنے پھرنے کا شوق شروع ہی سے اُس کے دماغ میں سما گیا تھا۔ کام وام بھگتا کر وہ سارے گاؤں میں پھرکی کی طرح گھوم جاتی۔ اُسے سب عورتوں کے بھید اور ہر گھر کی ڈھکی چھپی بُرائیوں کا علم تھا۔ اسی لئے ذرا کسی سے لڑائی ہو جائے تو وہ اس کے آباؤ اجداد تک کی تاریخی بُرائیاں گنا دیتی تھی۔ بالا سنگھ کو عورتوں کی ان لڑائیوں کی خبر تک نہ ہوتی تھی۔ لیکن اس کے نام کا دبدبہ تو تھا اور تاباں نے اس کا جائز یا ناجائز فائدہ اٹھانے سے کبھی گریز نہ کیا۔

تھوڑی دیر تک ہنستے رہنے کے بعد پاآی نے ناک کے نتھنے میں اُنگلی پھیرتے ہوئے کہا:

"اچھا بھابی تو پھر تم وہاں بیٹھی رہیں۔"

"ہاں۔"

"چھت پر یا صحن میں؟"

"پہلے صحن میں پھر چھت پر۔"

تاباں کو معلوم تھا کہ پاآی جرح کیوں کر رہا ہے۔ وہ اُلٹ پھیر کی باتیں پُوچھتا

رہا اور وہ رُک کر چند ہی آنکھوں سے پُر معنی انداز میں ہاتھ روک کر دیوار کی طرف دیکھنے لگی .... پالی اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ سے سب کچھ سمجھ گیا۔ اس نے جھنجھلا کر کہا۔

"بھابی جان بوجھ کر تم مجھے دق کر رہی ہو۔"

"ہے ہے یونہی بیٹھے بٹھائے ---؟"

"دیکھو تو جان بوجھ کر اِدھر اُدھر کی ہانکے جا رہی ہو۔"

"تم بھی تو اِدھر اُدھر کی ہانک رہے ہو۔ تمہیں جو بات پوچھنی ہو صاف صاف پوچھو۔"

اس کے دل میں شک گزرا کہ ضرور بھابی کو آج کی بات کا علم ہو گیا ہے بھابی نے پھر کہا۔

"اب تم ہی سے کوئی پوچھے کہ روز تو باتیں ہوتی ہیں آج یہ گول گول باتیں کیوں؟"

بھابی کی یہ بات بھی دُرست ہی تو تھی۔ جب اُس نے خود شرما کر اصل بات پوچھنے سے کترانا شروع کیا تو بھلا بھابی اس کی جھینپ کا تھوڑا بہت لطف کیوں نہ اٹھائے ..... لیکن وہ خود بھی تو لاچار تھا۔ اس کے دل میں بھی چور تھا۔ تاہم اس نے رازِ افشا کرنے سے پہلے بھابی کے دل کی ٹوہ لگانے میں چنداں حرج نہ سمجھا۔

اس دوران میں اُس نے اپنے جُوڑے پر سے جالی اُتار لی اور اسے ایک پُھندنے سے پکڑ کر گھماتے ہوئے بولا۔

"اچھا تو بتاؤ۔"

"پوچھو۔"

"وہ کہاں تھی؟"

"وہ کون؟"

"بھئی وہی ..... یہ کیا مذاق ہے؟"

"وہی کون ؟"

"سروں ۔ سروں ۔ سروں ۔"

پالی نے چڑ کر یہ الفاظ اتنی زور زور سے کہے کہ تاباں نے زمین پر پھیرتا ہوا ہاتھ روک لیا ۔ اسے ڈر لگا کہ مزدور گھر کا کوئی فرد سُن کر چھت پر جھانک کر پوچھے گا کہ آخر یہ سروں سروں کی رٹ کیا لگا رکھی ہے ۔

تھوڑی دیر تک وہ کان دھر کر سنتی رہی ۔ کوئی آہٹ نہ پا کر اُس نے قدرے ملامت آمیز نظروں سے پالی کی طرف دیکھا ۔

پالی نے بچوں کی سی خفگی کے ساتھ دبی آواز میں کہنا شروع کیا :

"بھابی تمہارا ہی تو قصور ہے ۔ مفت میں بات کا بتنگڑ بناتی ہو ......

پریشان کر دیا مجھے ۔"

اس پر تاباں چپ ہو گئی اور مُنہ پھیر کر جلدی جلدی لپائی کرنے لگی ۔

کچھ دیر تک تو پالی اس کی بات کا منتظر رہا ۔ پھر اُسے شک گزرا کہ بھابی مزدور خفا ہو گئی ہے ۔ چنانچہ وہ بیل کی طرح دونوں ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چلتا ہوا اُس کے قریب پہنچا ۔ دیکھا تو واقعی مُنہ پھولا ہوا تھا ۔

تاباں نے دوسری طرف مُنہ پھیر لیا ۔ وہ بھی اُچک کر اپنا چہرہ اس کے چہرے کے بالمقابل لے گیا ۔ تاباں اپنے پھولے ہوئے مُنہ کو اِدھر اُدھر حرکت دیتی رہی ۔ لیکن پالی کا چہرہ بھی اُدھر ہی پہنچ جاتا ۔ آخر کار تاباں کے مُنہ سے ہلکی سی ہنسی نکل گئی ۔ یُوں بڑے بھائی کی بیوی ہونے کی حیثیت سے وہ بُزرگ بن بن بیٹھتی تھی ورنہ مزاج میں تو بچپن ہی تھا ۔

"ہٹ با گھڑ بلا ۔"

پالی نے اپنا بھاری بھر کم ہاتھ بڑھا کر انگلیاں اُس کی چکنی ٹھڈی کے نیچے رکھ دیں ۔

"اچھا بھابی گُسہ تھوک دو ۔"

"پیچھے تو ہٹ ...... آدھی رات کو کوئی ہمیں اس طرح دیکھ لے

تو نہ معلوم کیا پیچھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

یہ کہہ کر دفعتاً اُس نے اپنا مُنہ بند کر لیا اور بالی شریفانہ انداز سے پیچھے ہٹ کر چوکے کی بالشت بھر اُونچی دیوار پر بیٹھ گیا ۔

" تم ہی تو بات بے بات پر روٹھ جاتی ہو "

" تم چلائے جو ہو اتنی زور سے "

بالی نے اُنگلی سے ابروؤں کا پسینہ جھٹک کر کہا ۔

" تم ہی تو ۔ ۔ ۔"

" تو کیا اب ہنسی مذاک بھی نہ کریں "

" تو بھائی میں کون سے لٹھ برسا دے "

" گلا پھاڑ کر جو چلائے تم ۔ ۔ ۔ ۔"

" اچھا بھابی دیکھو ادھر ۔ ۔ "

تاباں نے دیکھا کہ وہ پگڑی گلے میں ڈالے دونوں ہاتھ باندھے بڑی مسکین صُورت بنائے بیٹھا ہے ۔

بھابی نے دیور کی یہ صُورت دیکھی تو مسکرا کر مُنہ دوسری طرف پھیر لیا ۔ صُلح ہو گئی تھی لیکن بات از سرِ نو شروع کرنے کے لیے خوشگوار تمہید کی ضرورت تھی ۔

تاباں نے لپائی والے گوبر کی ہنڈیا کو اُس کے گلے سے بندھی ہوئی رسّی سے پکڑ کر اُوپر اٹھایا ۔ غالباً وہ بیٹھوں سے اٹے ہوئے حصّے پر لپائی کرنے کے خیال سے اُٹھی تھی ۔ بالی موقع تاڑ گیا اور بڑھ کر ہانڈی کی رسی پکڑ لی ۔

" لاؤ بھابی ہم لے چلتے ہیں "

تاباں نے چپ چاپ ہانڈی اُس کے حوالے کر دی ۔

بالی نے اُجڈپن سے پہاڑی کوّے کی طرح چونچ آڑی کر کے بھابی کی طرف دیکھا اور مصنوعی تفاخر سے بولا ۔

" بھلا بھابی ہمارے ہوتے ہوئے تم گوبر کی ہانڈی اُٹھاؤ گی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر اُٹھاؤ

گی بھی تو کیا ہم اُٹھانے دیں گے "

اب وہ کوٹھے کے سائے سے چاندنی میں آگئے تھے۔ تاباں بڑی حساس عورت تھی۔ بچپن ہی سے وہ محبت کی بھوکی رہی تھی۔ اس لیے پیار اور اخلاص کی چھوٹی سی بات پر وہ موم کی طرح پگھل جاتی۔

چنانچہ بالی کی حرکتوں اور باتوں کا اس کے دل پر بہت ہی خوشگوار اثر ہوا۔

سچ تو یہ ہے کہ وہ خفا ہی کب ہوئی تھی۔ وہ تو محبت کا روٹھنا تھا۔ اسے پیار کی چہل ہی تو کہیں گے اور اگر بالی اسے منانے کی کوشش نہ کرتا، تو تھوڑی دیر بعد وہ خود ہی اسے منا لیتی۔

وہ بیٹوں اُٹھے ہوئے حصے پر لپائی کرنے لگی۔ لیکن ایک دو ہاتھ مارنے کے بعد دیکھا کہ بٹیں ایسی جمی ہوئی ہیں کہ گوبر کی پتلی سی تہ میں نہ تو یہ چھپیں گی اور نہ اس کی رطوبت میں گھل سکیں گی۔

بالی نے دیکھا تو بول اُٹھا۔

" بھابی بٹیوں کو کھرچنا پڑے گا "

" یہ تو مصیبت ہے کیا کروں۔ سوچا تھا جلدی سے اس پر بھی لپائی کر دوں گی "

وہ بات ختم بھی نہ کر پائی تھی کہ بالی دوڑ کر صحن کے تاریک کونے سے کھرپا اُٹھا لایا اور بٹیں کھرچنے لگا۔

" لو میں بٹیں کھرچے دیتا ہوں اور تم لپائی کرتی چلی آؤ ...... دیکھو ابھی دم کے دم میں سب کام ہو جائے گا ..... "

آوارہ مزاج بالی کا اس قدر انکسار سے کام کرنا تاباں کو بہت بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ وہ لپائی کرتے کرتے سوچ رہی تھی کہ اب پھر کسی نہ کسی طرح سرتوں کے گھر کی بات چیت شروع کر دینی چاہیئے۔ محض کچھ کہنے کی خاطر بولی:

" اب تو سرتوں بھی بہت کام کرنے لگی ہے۔ اس کی ماں کہہ رہی تھی کہ آج دوسرے گاؤں میں گئی ہوئی تھی۔ پہلے تو بڑی مشکل سے اسے بھیجنا پڑتا تھا۔ اب وہ خود بخود ہی چلی جاتی ہے ..... جب تم دونوں کی شادی ہو جائے گی۔ تو پھر تم اِدھر اُدھر

گھومنا پھرنا بھول جاؤ گے۔ بس جو بی بی رانی کہے گی، وہی کرو گے بھاگ بھاگ کر...“
اب گویا تاباں نے بھی مزے دار باتیں کہہ کر دیور کا دل خوش کر دیا تھا۔
پالی کے چوڑے منہ پہ ہنسی پھوٹ پڑی۔ لیکن پھر اسے شام کی کرتوت یاد آئی۔

”اچھا تو پھر باتیں واتیں ہوتی رہیں خوب۔“

”ہاں گھر کے سب لوگ تھے نا۔“

”اور سرنوں؟“

”وہ بھی بیچ ہی میں تھی...... لیکن ہم دونوں کو اکیلے میں بیٹھنے کا موکا نہیں ملا نا۔“

”پھر بھی —— وہ تو باتیں کرتی ہوگی۔“

”ہاں ہاں...... تو کیا بات بھی نہ کرتی۔“

”میرا مطلب ہے تم سے بھی باتیں کرتی رہی تھی۔“

”ہاں کیوں نہیں بھئی۔“

پالی ابھی تک ذہنی تذبذب میں تھا۔ نہ معلوم بھابی کو شام کے قصے کا علم تھا یا نہیں۔

”کیا بات کہی تھی اس نے۔“

”لو اور سنو...“ یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگی ”تو کیا اب مجھے اس کے منہ سے نکلی ہوئی ہر بات یاد ہے..... گھر کے سبھی لوگ بیٹھے تھے۔ عورتیں بھی مرد بھی بچے بھی۔ سبھی اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ اب میں کیا جانوں کس نے کیا کہا ارے کوئی ہے بھی ایسا جو سب باتیں یاد رکھ سکے۔

”بھابی سب کی تو نہیں...... سرنوں کی باتیں پوچھ رہا ہوں.....“

”ہائے ہائے..... پگلا ہے پگلا۔“
پالی کھسیا کر ہنسنے لگا۔
”بس سمجھ لو خوب، مزے دار باتیں ہوتی رہیں اور سرنوں بھی بولتی رہی.....

اور کیا کہوں۔"

"کیا باتیں...... یُونہی بس گپ شپ۔"

"سرنو کی ماں کہنے لگی...... اب کے چلیں گے امرت سر صاحب دیوالی دیکھنے کے لیے۔"

"کب؟"

"اب کے...... جب دیوالی آئے گی۔"

"کب ہو گی دیوالی۔"

"ابھی تو ڈھائی تین مہینے پڑے ہیں...."

"تو تم بھی جاؤ گی؟"

"میں کیا...... تم بھی چلو گے 'ماں' کا کے دا بابو، سبھی...."

"اچھا تو...."

"ہم سب مل کر چلیں گے نا! ہر سال تو ہم جاتے ہیں۔ وہ کہتی تھی اب کے تو پالی بھی آگیا ہے اور رونق رہے گی اس کے ساتھ...."

"تو کیا اس نے یہ بات بھی کہی تھی۔"

"ہاں۔"

"نہیں مجھے خوش کرنے کو کہتی ہو۔"

"دھُر۔"

پالی خوش ہوا۔

اور وہ یہ بھی کہتی تھی...... ہاں بھئی وہ تو گلہ کرتی تھی کہ پالی ہمارے ہاں آتا نہیں...... کھچا کھچا رہتا ہے۔ ہم تو اسے اپنا بیٹا سمجھتے ہیں لیکن نہ معلوم اس کے دل میں کیا بات بیٹھ گئی ہے...."

پالی نے خوش ہو کر بٹیں کھرچنی بند کر دیں اور حیرت سے بھابی کی طرف دیکھنے لگا۔

"سچ بھابی.... نہیں!"
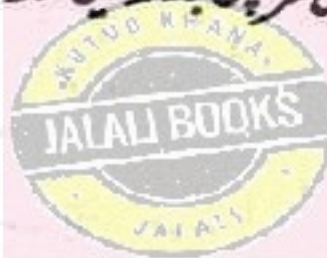
"ہاں ہاں ..... اسے تو تیرا بہت ہی چاؤ ہے۔ مجھ سے کہنے لگی کہ اسے ہمارے گھر بھیجا کر..... میں نے جواب دیا..... پر ماں پالی کو بھی آپ لوگوں سے بڑی محبت ہے۔ سر یا تا ہے جو آتا نہیں..... گھر میں بیٹھ کر تم لوگوں کی بہت ہی تاریف کرتا ہے۔ کہتا ہے مجھے سروپ کی ماں بہت اچھی لگتی ہے....."

سروپ کی ماں اچھی لگنے کی گپ سن کر پالی دل ہی دل میں بڑا محظوظ ہوا اور اس نے جب سر اٹھا کر بھابی کو دیکھا تو وہ شرارت آمیز انداز میں مسکرا رہی تھی۔

"دیکھ لو..... میں نے اسے یہ نہیں کہا کہ اسے سروپ اچھی لگتی ہے، بلکہ سروپ کی ماں اچھی لگتی ہے....."

پالی بھابی کی سیاست دانی کا قائل ہو گیا۔

"پھر اس نے کیا کہا۔

"کہنا کیا تھا۔ جلدی جلدی پنکھا جھلتے ہوئے بکنے لگی۔ واری جاؤں میرا بیٹا جو ٹھہرا۔ تجھے کیا بتاؤں تاباں ــــ ننھا سا تھا..... ہے بس اتنا سا..... ہم نے اسے کھلایا گودی میں..... اسے جادو نہ ہو۔ دل سے مانوس کرتا ہے نا! میں بھی تو اس کی ماں ہی ہوں۔ سنداں ٹھہری میری بہن۔ اور تاباں تو کیا جانے جب وہ کلکتے بھاگ گیا تو بچاری سنداں ایسی روئی کہ بس ..... یہ کہہ کر وہ آنچل سے ناک پونچھنے لگی....."

پالی کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"اچھا! بھابی سچ کہو....."

"اب میں تجھے کیسے اکین دلاؤں"

"تو اس کا مطلب ہے کہ انہیں میرا بہت خیال ہے..... کیوں بھابی!"

"واکھی انہیں تیرا کھیال ہے"

"اچھا تو دیوالی پر مجھے بھی ساتھ لے جاویں گے"

"ہم ہر سال جاتے ہیں"

"میرا مطلب ہے ان کے ساتھ"

"ہاں ــــ مجا رہے گا ساتھ ساتھ"

وہ دل میں سوچنے لگا۔ معلوم ہوتا ہے۔ ابھی سرتوں نے اس کی شرارت کا ذکر ماں سے نہیں کیا۔ نہیں تو وہ ایسی پریم بھری باتیں نہ کرتی۔ شاید سیدھے مُنہ بولتی بھی نہ ..... یا اور غصہ چڑھا ہوتا تو لڑنے پر طیار ہو جاتی۔ لیکن اگر اب بھی سرتوں نے بتا دیا تو پھر بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ وہ اپنے آپ کو لعنت ملامت کرنے لگا۔ مفت میں چھیڑ دیا اس نے۔ آخر اتنی بے صبری کی بھی کیا ضرورت تھی۔ اُس نے کئی مرتبہ تہیّہ کیا تھا کہ وہ سرتوں کے ساتھ بات چیت کرتے وقت نہ زیادہ چھیڑ چھاڑ نہیں کرے گا۔ لیکن جو بات نصیب میں لکھی ہو اسے کون روک سکتا ہے۔ نہ معلوم اُس کے سر پر کیا بُھتنا سوار ہو گیا تھا۔ کاش آج کی شام وہ رُک جاتا تو اسے معلوم ہو جاتا کہ اس کا کام رفتہ رفتہ بن رہا ہے لیکن واہگورو اکال پرکھ نے حالات ہی ایسے پیدا کر دیئے تھے۔ وہ دونوں اتفاق سے مل گئے۔ گاؤں کا گوشہ سنسان۔ اُس نے ہاتھ بڑھا دیا۔ عقل نہ نہ کرتی رہی۔ دل قابو سے باہر ہو رہا تھا اور پھر آنکھ جھپکتے میں اس نے اسے پکڑ لیا۔ اسے کوئی سدھ بدھ نہ رہی۔ واقعی اس کے ہوش ٹھکانے نہ رہے تھے۔ اتنے دنوں سے وہ صبر کر رہا تھا تو اب کیا مشکل تھی۔ کاش وہ گلی میں نہ ملتے یا نزدیک کوئی آدمی شروع ہی میں چلتا پھرتا دکھائی دیتا تو بھی ایسی جرأت نہ کرتا۔

پالا سنگھ کا چہرہ بھی اس ذہنی کشمکش کی وجہ سے اُتر گیا۔ آنکھوں میں کھوئی کھوئی سی کیفیت نظر آ رہی تھی۔ تاباں کو کچھ شُبہ ہوا۔ پالی نے یہ دیکھتے ہی بات ٹالنے کے لئے کہا:

"اچھا تو سرتوں بھی باتیں کرتی رہی؟"

"ہاں وہ بھی تھی؟"

"تو وہ بھی خوش ہوئی ہو گی؟"

"ہاں خوش تو تھی؟"

تاباں کی حیرت کم ہونے کی بجائے بڑھتی جا رہی تھی۔ پالی نے محسوس کیا کہ وہ

دلی کیفیت زیادہ عرصے تک نہیں چھپا سکے گا۔ اُس نے نظریں ملانے سے کتراتے ہوئے پُوچھا:

"میرا اجیل ہے اس نے...... اُس کا مجاز کچھ بگڑا ہوا تو نہیں.... تجھے کچھ پھرک دکھائی دیا یا نہیں؟"

بھابی کو اپنی جانب مشکوک نظروں سے تاکتے دیکھ کر بالا سنگھ نے پھر کھرپا سنبھالا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ تاباں بھانپ گئی کہ وہ جان بوجھ کر اس سے آنکھ ملانے سے کترا رہا ہے۔ ادھر بالی کا ہاتھ چل رہا تھا۔ ادھر تاباں کا ہاتھ چلتے چلتے رُک گیا تھا۔ آخر اس سے نہ رہا گیا۔

"کیوں بالی! کیا بات ہے؟"

بالی نے سر اُوپر اٹھایا۔

"بات؟" اُس نے دلی جذبات کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھو میری آنکھوں میں دھول مت ڈالو۔"

"اوہ ہو، کیا کہتی ہو؟"

"دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔"

بالی چپ رہا۔

"مجھ سے چھپانے سے تمہیں کیا مل جائے گا؟"

بالی نے کھرپا ہاتھ سے رکھ دیا۔

"اور تم تو ہاتھ دھو کر میرے پیچھے ہی پڑ گئی ہو۔"

جواب میں تاباں کے لبوں پر محبت بھری مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ لیکن وہ مُنہ سے کچھ نہ بولی۔

اب بالی نے ہار مان لی۔

"اچھا اب بتا دے بالی! کیا بھید ہے؟"

"سچ کہو بھابی تمہیں کچھ خبر نہیں۔"

"نہیں۔"

"دھرم سے کہتی ہو۔"

"ہاں بھئی دھرم سے کہتی ہوں۔"

پالی نے چند سے بے یقینی سے بھابی کی طرف دیکھا۔

"میرا خیال ہے تمہیں پتہ چل گیا ہوگا۔

"بھلا وہ کیسے؟"

"سرتوں کی جبانی۔"

"نہیں مجھے کچھ نہیں بتایا اس نے۔"

پالی نے اُچٹتی ہوئی ایک نظر بھابی پر ڈالی۔

"آج شام میں نے اسے چھیڑ دیا تھا جرا۔"

کچھ دیر کے لیے سکوت طاری رہا۔ تاباں شاید اس بات کی منتظر تھی کہ وہ خود ہی سارا واقعہ کہہ سنائے گا۔

پالی مناسب الفاظ کی تلاش میں تھا۔

"تو کیا کہہ دیا تُو نے اسے۔"

"میں نے نباب کے طویلے کے نجدیک اُسے روک لیا تھا۔"

"کچھ اور۔"

"اس کے کندھوں پہ ہاتھ رکھ دیئے۔"

"بس؟"

"اسے اپنی طرف کھینچا۔"

"بس؟"

"میرا خیال ہے میں نے جرا...."

"کہو۔"

"جرا کی جرا چھاتی سے لگا لیا تھا۔"

پالی زمین کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے یہ معلوم کرنے کی جرأت ہی نہ ہوئی۔

کہ اس کی بھابی کے چہرے پر اس کا کیا ردِ عمل ہوا ہے لیکن اس نے سوچا کہ اب چھپانے کی بات تو کوئی رہی نہیں کیوں نہ اس اہم واقعہ پر تبادلۂ خیال کر لیا جائے۔

"میں ڈر رہا تھا کہ کہیں سروں نے اپنی ماں کو نہ بتا دیا ہو۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کچھ نہیں کہا۔ نہیں تو کیا اس کی ماں تم سے ایسی پریم بھری باتیں کرتی بھلا"

قدرے سکوت کے بعد بولا۔

"نہ جانے ابھی کہنے کو ہمت ہی نہ ملا ہو۔۔۔۔۔ شیتت رات کو کہہ دے گی۔"

معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بھابی اس بات پر زیادہ فکر مند نہیں تھی۔

"کسی اور نے تو نہیں دیکھا؟"

"نہیں۔"

"تمہیں اچھی طرح یقین ہے نا"

"ہاں ۔۔۔۔ لیکن وہ اپنا نباب ہے نا اسے پتہ چل گیا تھا۔"

"کیا سروں کو بھی معلوم ہے کہ نباب نے تم دونوں کو ساتھ دیکھ لیا ہے۔"

"نہیں اُسے کچھ معلوم نہیں۔۔۔۔۔ وہ تو یونہی کھٹکا سُن کر بھاگ آئی تھی۔"

"ہوں۔"

"اور پھر جب وہ چلی آئی تو نباب نے دیوار پر سے سر نکال کر میری طرف دیکھا۔"

"نباب کی فکر نہیں وہ بڑا سر پھرا ہے کسی سے نہیں کہے گا۔"

"میرے دوستوں کو اس نے اُتا پتا بتا دیا ہے کہ ہم دونوں کا پریم ہے لیکن اصل بات نہیں بتائی۔"

"ہاں تو بھکر کا ہے کو کرتا ہے۔ یہ پریم وریم کا کہنا تو سبھی کا چلتا ہے اصل بات معلوم نہیں ہونی چاہیے۔ نباب بہت سر پھرا آدمی ہے۔۔۔۔۔ بیچارا کسی کی برائی نہیں کرتا اور پھر تیرا تو دوست ہے اس لیے۔۔۔۔"

بات بنتی دیکھ کر پالی کا حوصلہ استوار ہونے لگا۔

"لیکن بھابی بھکر بابا کا نہیں...... سرنوں کا ہے وہ خُود ہی بتادے جو اپنی ماں کو....."

"دُر" تاباں نے ہاتھ کو جھٹکا جو دیا تو گوبر کے چند چھینٹے پالی کے چہرے پر بھی آن گرے "بھلا شیار لڑکیاں بھی ایسی باتیں ماں باپ کو کہتی ہیں۔ بھولے بھیا لڑکیاں اپنے ڈھکے چھپے بھیدوں کا بھانڈا خود ہی نہیں پھوڑ دیا کرتیں۔"

"سچ بھابی؟"

پالی کی باچھیں مارے خوشی کے چرنے لگیں۔

"اور نہیں تو کیا؟"

پالی کے سینہ پہ سے بہت بڑا بوجھ اُتر گیا۔

"اچھا تو اس کی بات چیت کرنے کا ڈھنگ کیا تھا؟"

"روز کی طرح"

"کوئی جھڑک نہیں تھا؟"

"نہیں تو"

"بھابی کیا بتاؤں میں تو بہت ڈر گیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں نے خُود ہی اپنا بنا بنایا کام بگاڑ ڈالا ہے"

"پگلا جو ٹھہرا........ ارے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ اتنی اکل بھی نہ آئی۔ ہائے بیچارے کو جندگی میں عورت کا مُنہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ بھلا ایسی باتیں کیسے سمجھے گا؟"

بھابی کی اس غلط فہمی پہ پالی نے دل ہی دل میں خوب بغلیں بجائیں۔ وہ بدمعاش عورت کو قابو میں رکھ سکتا تھا۔ لیکن شریف لڑکی سے پالا نہیں پڑا تھا۔ اسے پہلے کسی عورت سے محبّت نہیں ہوئی تھی۔ وہ تو کام چلاؤ محبّت کرتا رہا تھا۔ لیکن سرنوں کا معاملہ ٹیڑھا تھا اور پھر وہ اسے اپنی ادھرنگی (جنم ساتھی) بھی بنانا چاہتا تھا۔ بس کچھ ایسی ہی پیچ در پیچ باتیں تھیں جو ذرا اس کی سمجھ سے باہر تھیں۔ ورنہ

وہ کبھی کا اس جھنجھٹ سے چھوٹ گیا ہوتا۔

تاباں نے سمجھا کہ دیور پھر تفکرات میں ڈوب گیا ہے۔ چنانچہ اس نے بڑے عالمانہ انداز میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"سرون تو سمجھتی ہے کہ اس بھید کو دنیا میں کوئی نہیں جانتا۔ بس ایک تم جانو یا وہ جانے۔ اب ذرا عقل سے سوچو کہ وہ خواہ مخواہ اپنی بدنامی کیوں کرے آئی میری بات سمجھ میں؟"

اس پر پالی چہک کر بولا۔

"سچ پوچھو بھابی! تو میں نے اس سے کہا ہی کیا؟"

یہ کہہ کر وہ اس کے قریب کھسک آیا اور اس نے شانوں پر دونوں ہاتھ رکھ دیئے: "تو بس ایسے میں نے اس کے کندھوں پر ہاتھ دھرے اور پھر ذرا سا کھینچ کر اپنے ساتھ لگا لیا۔"

"ہٹ رے۔" بھابی نے اسے پرے دھکیلتے ہوئے کہا۔ پھر مسکرانے لگی۔

"دیکھو تو منہ پر ڈاڑھی اگ آئی ہے اور...... اور یہ آدمی رات کے بکھت جو کوئی اس طرح ہم دونوں کو دیکھ لیتا تو پھر...."

پالی پاؤں کے بل اکڑوں بیٹھا تھا دھکا کھا کر لڑھک گیا اور بھابی کو یقین دلانے کے انداز میں بولا۔

"سچ بھائی! بس اِتی سی بات تھی..... اب تم ہی کہو میں نے کون سا لٹھ کھینچ مارا ہے...."

"بیا کوئی تو ہے تیری۔"

"بیا کوئی کیسی؟"

"اور جو کوئی دیکھ ہی لیتا۔"

"کون دیکھ لیتا۔"

"کوئی بھی دیکھ لیتا۔"

"تو پھر کیا۔"

"سارے گاؤں میں مساہور ہو جاتی یہ بات۔"

"ہوں مساہور کیسے ہو جاتی میں بجان جیجو کا وہیں دم نکال دیتا گلا گھونٹ کر......"

تاباں آنچل میں منہ چھپا کر ہنسنے لگی۔

"نرا مورکھ ہے مورکھ۔"

"اچھا بھابی! تم ہمیں ہمیشہ مورکھ کہتی ہو۔ کیا میرے ڈماگ میں بالکل ہی بھُس بھری ہے۔"

"بھئی اب تم سے بحث کون کرے اب جاؤ سو جاؤ۔ دیکھو یونہی بات کا بتنگڑ بنایا۔ باتوں باتوں میں مجھے کام بھی کھتم نہیں کرنے دیا......"

"واہ جی واہ...... ہم نے اتنا کام کر دیا۔ ایک تو بات بتائیں۔ دوسرے گالیاں بھی کھائیں......"

"اچھا بھئی اچھا...... جا تیرا بھلا ہو...... تیری کھاٹ بچھادی ہے میں نے جا کر سو رہو۔ صبح اٹھ کر سانی دانی کرنی ہو گی۔ پڑا خراٹے لیتا رہے گا دن چڑھے تک۔"

"نہیں بھابی، جی چاہتا ہے۔ آج تو رات بھر باتیں ہی کرتے چلے جائیں۔"

پالا سنگھ وہیں پھیل پڑا۔

"اب چلا بھی جا جو ماں کی آنکھ کھل گئی تو چلّانے لگے گی۔ گاؤں بھر کو کھبر ہو جائے گی......"

اتنے میں چوکیدار نے ہانک لگائی یہ جاگتے رہو۔ ہُو ہُو دو۔"

"نہیں بھابی ساتھ ساتھ چلیں گے اوپر...... اب کام ہی کیا ہے کھتم تو ہو گیا۔"

تاباں نے چپ رہنے ہی میں اپنی خیر سمجھی۔

پالی نے سارس کی سی ٹانگیں سمیٹیں اور بھابی کے قریب کھسکتے ہوئے بولا:
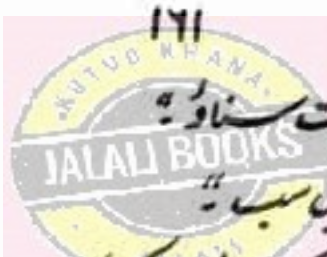
"ہاں بھابی! کچھ اور بات سناؤ۔"

"کیا بات.... سنا تو دیں سب۔"

"اچھا تو اب کے امبر سر کی دیوالی دیکھنے کا ارادہ ہے۔"

"تو اب پھر سے رامائن چھیڑ بیٹھے۔"

"نہیں بھابی جرا گور تو کرو میں نے امرت سر کی دیوالی دیکھی ہی نہیں۔"

"ارے ہاں، میں تو بھول ہی گئی۔ ہاں پالی تو تو چھوٹا سا ہو گا۔ تجھے امبر سر کی دیبالی یاد ہی کیا ہو گی۔"

"ہاں وہی تو کہہ رہا ہوں۔"

"تو نے امبر سر تو دیکھا ہی ہو گا۔"

"اب کے آیا تو دیکھا۔ پہلے کا مجھے بہت اچھی طرح یاد نہیں تھا نا۔ میں بہت چھوٹا تھا۔ جب ماں مجھے دیبالی پر لے گئی تھی۔ پھر جب بڑا ہوا تو امبر سر دیکھا امبر سر مجھے تھوڑا تھوڑا جاد تھا لیکن دیبالی بالکل نہیں جاد...."

"ارے ہائے پھر تو نے کیا دیکھا۔ کیا باتیں بناتا ہے۔ دیبالی دیکھے گا تو پھر کہے گا ایسی رونک ہوتی ہے ایسی رونک ہوتی ہے کہ کیا بتاؤں۔"

"ہو ہو۔"

"بس رونک تو بلیاکھی کی دیبالی کی دیکھے آدمی۔"

"اچھا...... بھابی میلوں کی باتیں یاد ہیں مجھے..... جب ہماری نہر کے پل سے سنگ گزرا کرتا تھا۔ ہائے میرے پاس گھوڑا ہوتا تو میں بھی اسے کوداتا ہوا جاتا سنگ پہ...."

"تو نے کلکتے میں رہ کر روپیہ بھی نہ کمایا...."

"کمایا تو بھابی!...."

"پھر؟"

"سب چٹ۔"

"تو گھوڑا کہاں سے آئے پھر" یہ کہہ کر نانا ہنسنے لگی "ہاں رے کیا تو
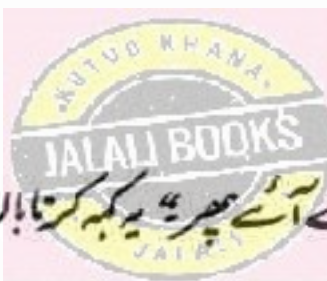
نے سرنوں کی ماں سے کہا تھا کہ اب میں جمین کھرید وں گا۔"
پالا سنگھ نے ذہن پر زور ڈالا۔
"اور ہاں کہا تو تھا پہلے دن جب گیا نا تو۔۔۔۔ اچھا کیا کچھ کہتی تھی؟"
"پوچھتی تھی کہ پالی نے جمین کھریدی کہ نہیں۔"
"پھر تو نے کیا کہا؟"
"میں نے کہا کھرید لے گا۔۔۔۔"
پالی چپ سا ہو گیا۔
"کہنے لگی۔ پاس والے گاؤں کے نمبردار کا لڑکا لپھٹین ہو گیا ہے۔ چھوٹا سا تھا۔ یونہی گھوما کرتا تھا۔ پھر سہر میں پڑھنے لگا پھر لپھٹین ہو گیا اب سرکاری بردی پہنتا ہے۔ اور سرکار کا تکمہ (تمغہ) لگاتا ہے۔"
"پر اس بات کا متبل کیا۔۔۔۔" پالی نے ماتھے پر بل ڈالے۔
"کیا جانیئے کیا متبل تھا۔۔۔۔"
"اور یہ سور نمبردار کا لڑکا کون ہے۔"
"وہ، وہ کیا بھلا سا نام ہے۔۔۔۔ پر۔۔۔۔ پرتھی پال سنگھ۔"
"تو نے دیکھا ہے اسے۔"
"ہاں دو ایک بار دیکھا ہے۔۔۔۔۔۔ بڑا ہی کھب صورت ہے کیا پیارا ناک نکستا ہے جیسے مورت۔۔۔۔۔"
پالی کو پرتھی پال سنگھ کی یہ تعریف پسند نہ آئی۔
"پر بھابی میں نے تو سنا ہے پرتھی پال سنگھ بڑا بدمعاش ہے۔۔۔۔ عورتوں کو کھراب کرتا ہے۔"
"با ہگورو ہی جانے۔۔۔۔ سکل سے بڑا بھولا دکھائی دیتا ہے اور جب بردی پہنتا ہے تو کیسی سج دھج ہوتی ہے اس کی۔ ارے ہاں اسے کون پوچھے تھا یونہی بے کار گھومے تھا۔۔۔۔۔ اب جو آیا تو لوگ آگے پیچھے گھومتے تھے۔۔۔۔"
"چھوڑ و بھابی اس منحوس کی باتیں۔۔۔۔"

"ارے تیرا اس سے کیا بیر ہے ؟"

"بھابی! تم ان پڑھے لکھوں کی باتیں نہیں جانتیں۔ بڑے بدمعاش ہوتے ہیں یہ لوگ ــــ بس اُوپر کی ٹیپ ٹاپ ہی ہوتی ہے۔"

"جو ہو سو ہو...... بچارے نے ہمارا تو کچھ نہیں بگاڑا۔ ہر کسی سے ہنس کر بولے۔ ایک بار میں اُن کے گاؤں میں گئی تو وہ جیپ گاڑی پر سوار ہو کر ہوا کو جا رہا تھا۔ مجھے دیکھا تو رُک گیا۔ تم ہی سوچو کہاں اتنا بڑا آدمی اور کہاں میں..... دونوں ہاتھ جوڑ کر پہلے اسی نے ست سری اکال کہی اور پھر ہنس کر بولا۔ "آپ کو یاد نہیں..... ہم پہلے بھی ملے تھے کہیں، ہاں مجھے یاد تو تھا...... پر بابی میں تو گھبرا گئی نا۔ میں چپ رہی۔ "آپ سردار زنجن سنگھ کے ہاں بیٹھی تھیں۔"

ہاں ہاں مجھے اچھی طرح یاد تھا...... بچارا مجھے آپ کہہ کر بلاتا تھا۔"

"تو کیا وہ نرنجن سنگھ کے ہاں بھی جاتا رہتا تھا ؟"

"ہم نے تو ایک ہی بار دیکھا ہے یونہی کبھی کبھار آتا ہو گا۔ گاؤں میں جو کوئی نیا آدمی آئے تو پتہ چل ہی جاتا ہے نا۔"

"کیا اس نے بہت روپیہ کمایا ہے ؟"

"ہاں سنتے ہیں ڈیڑھ ہزار تنخواہ پاتا ہے۔"

"اجی ہاں اتنی تنخا تو لاٹ صاحب کی بھی نہیں ہوتی۔"

"اب بتاؤ میں کیا جانوں ان باتوں کو۔"

پرتھی پال سنگھ کا ذکر چھڑنے پر بابی ذرا سوچ میں ڈوب گیا۔ مبہم سائے اس کے ذہن میں گھومنے لگے۔ اسے اس بات کا تو علم بھی نہیں تھا کہ وہ سرتوں کے ہاں بھی جاتا رہتا تھا اور نہ معلوم وہ بھی سرتوں سے شادی کرنا چاہتا ہو۔ لیکن وہ شادی کیا کرے گا۔ پڑھا لکھا بیشنٹین تو کسی میم کو پھانس لے گا یا کسی پڑھی لکھی لڑکی سے بیاہ رچائے گا جو گٹ مٹ گٹ مٹ کر سکے۔ بھلا سرتوں میں کیا دھرا ہے صورت اچھی بھی لیکن ہے تو آخر کو دیہاتن کی دیہاتن۔

"کیا سوچ میں ڈوبے ہو۔" بھابی نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔"

"نہیں، کچھ تو ہوگا۔"

پاآلی کھرپے سے ساری بٹیں کرید چکا تھا۔ اب وہ چوکے کی ننھی سی دیوار پر بڑے آرام سے چڑھ بیٹھا۔ پھر اس کے لبوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ پیدا ہوئی۔

"اچھا تو تمہیں پٹھین پسند آگیا ہے۔"

تاباں نے ماتھے پر بل ڈال کر اس کی طرف دیکھا اور شرارت بھانپ کر تاؤ میں آگئی۔

"مجھے کیوں پسند ہوتا۔"

"خود کہہ رہی تھی نا۔"

"کہہ کیا رہی تھی۔۔۔"

پاآلی نے بات ٹوک دی۔

"یہی کہ بڑا کھب صورت ہے۔ ہنستا رہتا ہے۔ تمہیں 'آپ' کہتا ہے اور راستے میں کھڑا ہو کر تم سے میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہے۔"

"دُر مجھ سے میٹھی میٹھی باتیں کیوں کرنے لگا۔"

"بھئی دل ہی تو ہے۔"

"دل کی کیا بات۔"

"اس نے دیکھا ہوگا کیسی پیاری لڑکی ہے۔۔۔"

"دُر۔"

"یہ ننھی ننھی پیاری پیاری چندھی آنکھیں۔۔۔"

"ہائے۔"

"ہائے کیا۔"

"تو اپنی صورت تو دیکھ۔"

"میری صورت کو کیا ہے۔"

وہ دونوں کبھی بالکل جاہل بچوں کی طرح لڑنے لگتے تھے۔ بھابی نے منہ
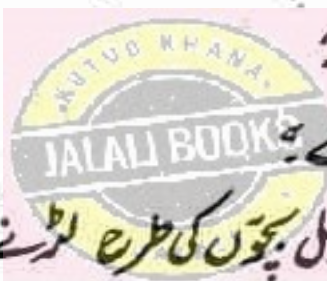
چڑا کر کہا۔

"یہ لمبا بانس۔"

"بُرائی کیا ہے؟"

"بڑے بڑے کان ہاتھی کے سے۔"

"تجھ سے بھی بڑے؟"

"یہ بڑا منہ بیل کی طرح سر۔"

"اچھا جی؟"

"کہاں سرنوں اور کہاں تم چٹو وٹے۔"

"بڑی سرنوں کی طرف دار آئی ہیں وہاں سے۔"

"ہاں نہیں تو میری سہیلی جو ہے۔"

"ہاں جی جیسا منہ ویسی چپت۔"

"منہ سنبھال کر بولو نا۔"

"کیوں سہیلی کی بلے اچھی ہوتی ہے؟"

"کیوں نہیں۔"

"بڑی سہیلی تو دیکھو۔"

"کیسی پیاری ہے سرنوں جیسے ریشم کی لچھی۔"

یاآنی نے منہ چڑا دیا۔

"ارے شرم کرو نا منہ چڑاتے جواب۔"

"ارے میں پرواہ نہیں کرتا کسی کی۔"

"اچھا جی؟"

"ہاں جی؟"

"اور جو میری خوشامدیں کرتے رہتے ہو۔"

"کیا خوشامد کی ہے میں نے۔"

"یہی کہ ملا دوں سرنوں سے۔ اس کا دل توڑو۔ ہائے میری شادی

ہو جائے اس سے۔"

"میرے جُوتے سے۔"

"اچھا پھر یاد رکھنا۔"

"یاد رکھیں گے۔"

"پھر نہ کہنا۔"

"نہیں کہیں گے۔"

"تم تو ناک رگڑ وگے ناک۔"

"میں کسی سالے کے آگے ناک نہیں رگڑتا۔"

"اچھا یہ اکڑ ہے تو پھر دیکھ لینا۔"

"کیا۔"

"میری بھی بلا سے۔"

"منجور۔"

"اب تمہارے لئے کوئی کوشش نہیں کروں گی۔"

"نہ کرو۔ لیکن ہم تو تمہارے لئے کریں گے۔"

"کیا مطلب۔"

"یہی کہ سفارش کریں گے۔"

"ڈر۔"

"آنے دو پھٹین کو۔"

تاباں روہنکی ہو گئی۔

"کہوں گا ـــــ حجور پھٹین صاب، آپ ہی اس عورت کے مائی باپ ہیں اس کی جندھی آنکھوں کا کھیال نہ کیجئے۔ چھاتی چیر کر دل دیکھئے آپ کے پریم میں ..."

"ہٹ کتے بے شرم۔"

تاباں کی آواز بھرا گئی۔

"وہ کہے گا ـــــ مت رو میری مانو۔ مت رو میری کٹو۔ میں میم کے بدلے

تجھے اپنے گھر لے جاؤں۔"

تاباں نے اسے مارنے کے انداز میں گھڑیا اوپر اٹھایا۔ پالی شکاری کتے کی طرح اچھل کر کھڑا ہو گیا: "میری لٹھیائی..... پچ پچّ......"

تاباں آگے بڑھی وہ پیچھے ہٹا۔ پھر بھگدڑ مچ گئی۔ پالی ایک دروازے سے ڈیوڑھی میں گھستا اور دوسرے میں سے نکل آتا۔ اس طرح آگے پیچھے انہوں نے تین چار چکر لگائے۔ پالی گھوڑے کی طرح ہنہنا کر ہنس رہا تھا اور تاباں کے رندھے ہوئے گلے سے گالیاں نکل رہی تھیں۔ آخر تھک کر وہ چوکے کی دیوار پر بیٹھ کر خوب زور زور سے رونے لگی۔

سنداں جاگ اٹھی۔ اس نے کوٹھے پر سے جاگ کر دیکھا: "ارے کیا ہے؟"

پالی نے منہ اوپر اٹھا کر دیکھا۔ "ماں بھابی کے پیٹ میں درد ہے۔"

سنداں نے نہ معلوم ہنسنے کو بتانے کے لیے یا کیوں بڑے زور سے "واہگورو واہگورو" کا ورد کیا اور پھر سیڑھیاں اترنے لگی۔

ماں کے آنے سے پہلے پہلے پالی نے جھک کر بھابی کے پاؤں کے قریب ناک سے زمین پر تین چار لکیریں نکال دیں۔

چنانچہ تاباں نے ماں کو کچھ نہیں بتایا اور پھر ماں کی دی ہوئی اجوائن چپکے سے پھانک کر اوپر سے دو گھونٹ پانی پی لیا۔

۷

کوئی نامعلوم سا احساس تھا جس کے زیرِ اثر پالا سنگھ نے شروع ہی سے جوالا سنگھ کے ساتھ تعلقات پیدا کر لئے۔ جوالا سنگھ کو بھی اس بات کا کچھ کم احساس نہیں تھا۔ یعنی دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی۔ یا پھر دل کو دل سے راہ ہوتی ہے کے بمصداق چونکہ وہ دونوں درحقیقت ایک ہی قماش کے انسان تھے۔ اس لیے ایک دوسرے کی دوستی کی خواہش ایک قدرتی امر تھا۔

ہر چند پالی کو جوالا سنگھ سے اور جوالا سنگھ کو پالی سے اندرونی طور پر لگاؤ تھا لیکن بظاہر پالا سنگھ نے اس سے زیادہ میل جول سے پرہیز کیا۔ اس کی تہ میں سرنوں کا خیال کارفرما تھا۔ ادھر ان کا گھرانہ شرافت کا دعوے دار تھا اور ادھر پالی کے آباؤ اجداد کے کارنامے اس کے قطعاً برعکس تھے۔ اب اس کے بھائی لہنے کی حیثیت ایک معمولی کاشت کار کی سی تھی۔ لیکن باپ کی موت کے بعد ان کے گھر کے کسی فرد نے کوئی قابلِ اعتراض حرکت نہیں کی تھی۔ گاؤں والوں میں سے بیشتر کو اس بات کا رنج تھا وہ اس کے باپ کے کارناموں کو فخریہ دُہراتے اور سر دُھنتے تھے۔ رنجن سنگھ کی یہ مجال ہی نہ ہو سکتی تھی کہ وہ ان کے خیالات کی تردید کرے۔ البتہ وہ اپنی لڑکی سرنوں کی شادی تو اپنی مرضی کے مطابق جہاں جی چاہے کر سکتا تھا۔ اس میں روک ٹوک کرنے کا کسی کو کیا حق حاصل تھا۔ پالی کو معلوم تھا کہ زیرِ غور لڑکوں میں اس کا نام پیش پیش ہے اور وہ اس

بات سے بھی بے خبر نہیں تھا کہ زین سنگھ اور اس کی بیوی کے خیالات کیا ہیں ان حالات میں اُس نے یہی مناسب سمجھا کہ مفت میں بدنام ہونے سے وہ جس قدر بھی احتراز کرے اسی قدر اس کے حق میں بہتر ہو گا۔ اسی لیے وہ باوجود دلی لگاؤ کے جوالا سنگھ اور اس کے واقف کاروں سے کچھ پرے پرے ہی رہتا۔

رفتہ رفتہ پربھی پال سنگھ کا نام بھی اس کے کان میں پڑنے لگا۔ وہ ایک مالدار اسامی تھی۔ پھر خوبصورت اور بارو زگار نوجوان۔ وہ سرتوں کے ہاں دو چار مرتبہ جا بھی چکا تھا۔ اس لیے اس کا نام بالا سنگھ کے دل میں کھٹکنے لگا۔ اس کی صورت دیکھے بغیر اور اس کے ساتھ گفتگو کرنے سے پہلے ہی بالی نے اسے حریف متصور کر لیا۔ ایک طرف اس نے اپنی شرافت کا ڈھونگ بھی رچائے رکھا اور دوسری طرف چپکے چپکے جوالا سنگھ سے تعلقات بڑھانے شروع کر دیئے۔

بالا سنگھ کی صورت اور رتو رہی ایسے تھے کہ کسی کو اس کی شرافت کا یقین نہیں آتا تھا۔ تاہم اس نے ہمت نہیں ہاری۔ جہاں تک بن پڑا سفید پوش شرفا کے اوصاف پیدا کئے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی جوالا سنگھ سے تعلقات بڑھانے میں نہ معلوم کیا مصلحت پوشیدہ تھی۔ خود اس کے ذہن میں یہ بات مکمل طور پر واضح نہیں ہوئی تھی۔ محض انجانے طور پر اس نے محسوس کیا کہ اسے جوالا سنگھ سے تعلقات بڑھانے چاہئیں خواہ وہ پس پردہ ہی ہوں۔

اسے معلوم ہو چکا تھا کہ سرتوں کی ماں اس کی بھابی سے پوچھتی رہی تھی کہ وہ اور زمین کب خرید رہے تھے۔ بالی نے تو یونہی گپ ہانک دی تھی اسے کیا معلوم تھا کہ سرتوں کی ماں اسے پلے ہی سے باندھ لے گی۔ لیکن عورتیں ان معاملات میں بھلا کب چوکتی ہیں اور پھر پربھی پال سنگھ کے ذکر نے اُسے اور فکر مند کر دیا۔

دیوالی کے دن قریب آ رہے تھے۔ ان دونوں گھرانوں نے امرت سر جانے کی تجویز قریب قریب پختہ کر لی تھی۔ بالی کے دل کو اس بات پر یقیناً بڑا اطمینان حاصل ہوا کہ سرتوں نے اس کی دست درازی کا بُرا نہیں مانا تھا۔ اس واقعہ کے بعد چند روز تک تو وہ جان بوجھ کر سرتوں کے گھر نہیں گیا بلکہ اگر کہیں راستے

وہ دکھائی دیتی تھی تو وہ کترا کر نکل جاتا۔ البتہ بھائی کو بھا رہا۔ تاباں بھی ان معاملات میں بڑی ہوشیار تھی۔ یُوں بھی ہنس مکھ، چلبلی اور باتونی عورت تھی۔ اس لئے سرنوں کے دل میں گھر کرنے میں اسے زیادہ وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ جب اس سے اس قدر گہرے تعلقات ہو گئے تو بھلا اس کے دیور کی بات وہ اپنے دل میں بُری بھلی بات کیوں کر رکھ سکتی تھی۔ پالی نے چاہا کہ بھابی اس کی اس حرکت کا ذکر کر کے اظہارِ افسوس کر دے تاکہ اس کے دل کی کدورت دور ہو جائے۔ لیکن تاباں کو اس بات سے اختلاف تھا۔ وہ کہنے لگی کہ سرنوں کو یہ بات جتلا کر خواہ مخواہ اس کے دل میں یہ وہم پیدا کیوں کیا جائے کہ بات پھیل رہی ہے اگر اس کے دل میں یہ خیال ہو کہ گاؤں بھر میں کسی اور شخص کو اس واقعہ کی کچھ بھی خبر نہیں تو اور اچھا ہے۔ اتنی سی بات کا بھلا بُرا ماننے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ خصوصاً جب اور کسی نے دیکھا ہی نہ ہو اور ممکن ہے اُسے پالی سے تھوڑی بہت محبت بھی ہو۔ اس صورت میں اس کے دل پر یہ بات گراں گزرنے کا امکان اور کم ہو جاتا ہے۔ پالی نے بھابی کی تجویز منظور کر لی اور اس کا نتیجہ بھی خاطر خواہ نکلا...... بالآخر جب اس کی سرنوں سے ملاقات ہوئی تو اُس کے بُشرے اور حرکات سے اس بات کا قطعاً اظہار تک نہ ہوتا تھا کہ اسے اس سے کسی قسم کی شکایت ہے۔

یہ دیکھ کر پالی نے اطمینان کا سانس لیا اور اس کے دل پر سے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا۔ آئندہ کے لیے اس نے کانوں کو ہاتھ لگایا کہ پھر کبھی ایسی حرکت ہرگز نہیں کرنے کا۔ وہ سُن چکا تھا کہ یہ بھتی پال سنگھ کس قدر چکنی چپڑی باتیں کرتا ہے اس کے دل میں خوف پیدا ہوا کہ ایسا نہ ہو کہیں وہ سرنوں کے کان میں میٹھی میٹھی باتیں پھونک کر لے اُڑے اور وہ منہ تاکتا ہی رہ جائے۔

ایک روز پالی صحن میں بیٹھا کمان کی رسیاں ازسرِ نو کس کر باندھنے میں مصروف تھا۔ جب کمان ٹھیک ہو گئی تو اس نے پیپل پر بیٹھے ہوئے چند کوّوں کو مٹی کے غلّے کھینچ مارے۔ کمان کو پہلے کی نسبت بہتر پا کر اس نے مارے خوشی کے منہ ڈھیلا چھوڑ

دیا اس کے دانت نمایاں ہو گئے۔ پھر اس نے کمان ایک طرف رکھ دی۔ روٹیاں پیٹنے والے جھاڑن سے ہی جوتوں کی گرد جھاڑنے لگا۔ اتنے میں سنداں آنکل۔

اس نے یہ ماجرا دیکھا تو برس پڑی۔

"ارے دیکھتا نہیں......"

"ہو ہاں کیا بات ہے۔"

"روٹیوں والے جھاڑن سے جوتے صاف کر رہا ہے۔ تُو تو پچھلے جنم کا بھنگی ہے بھنگی۔"

بیچارا بالی حیران تھا۔ طویل بحث مباحثے کے بعد اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوا ماں بیٹے کا جھگڑا سُن کر چھت سے تاباں اُچک کر جھانکنے لگی۔

بالی نے یہ بات تو تسلیم کر لی کہ اس کی بیوقوفی تھی کہ وہ ایک عام کپڑے اور روٹیوں کے جھاڑن میں تمیز کرنے سے قاصر تھا لیکن مکمل شکست تسلیم کرنے سے انکاری تھا۔

"پر ماں تیری بھی تو بیا کو بھی ہے جھاڑن روٹیوں کے چھکو (ٹوکری) میں ہونا چاہیئے نہ کہ دیوار پر پھینک دینا چاہیئے....."

"ہائے ہائے اُسے تو دھو کر دیوار پر سُوکھنے کے لیے ڈال دیا تھا تو کیا اب اُسے دھونا بھی نہیں چاہیئے...."

"دھونے میں تو کوئی برائی نہیں پر اُسے دیوار پر آدی کیوں ڈالے...."

"دیوار پر نہیں تو کیا اپنے سر پر ڈالوں۔"

"ہاں سر پر ہی ڈال لیا کر..... یہ جو سر پر دوپٹہ ڈالے پھرتی ہے وہ اس جھاڑن سے زیادہ صاف تو نہیں۔"

اس پر سنداں نے جان بُوجھ کر چمٹا اس انداز سے پھینکا کہ نشانہ اوچھا پڑے بالا سنگھ نے ازراہِ مذاق بارہ سنگھے کی طرح اتنی بڑی چھلانگ لگائی جیسے اس پر چمٹا نہیں بھالا پھینکا گیا ہو.... اس پر تاباں ہنسنے لگی اور سنداں بناوٹی خفگی میں لیکن زیرِ لب مسکراتی ہوتی پیار میں چلی گئی۔

پالی نے پگڑی کے شملے کو درست کرتے ہوئے سر اوپر اٹھایا اور بھابی کو ہنستے پاکر بولا:

"تو بھابی جرا کی جرا باہر گھوم آؤں۔"

"جاؤ۔" بھابی نے ہاتھ جھٹکا کر جواب دیا "گھر پہ کونسا کولہو کے آگے جُتے ہوئے ہو۔"

"اچھا بھابی یہ باتیں ہیں لیکن یہ نہ سمجھنا کہ چھت پہ بیٹھی ہو تو میں وہاں تک پہنچ ہی نہیں سکتا....."

"اچھا جی کیسے پہنچو گے۔ سیڑھیوں کے دروازے کا کنڈا چڑھا دوں گی۔"

"چڑھائے رکھو۔ مجھے اگر کوئی بانس مل جائے نا بڑا سا تو پھر دیکھو ایک ہی جست میں چھت پر پہنچتا ہوں یا نہیں....."

یہ کہہ کر وہ بانس کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگا۔

بھابی نے جان چھڑانے کے لیے کہا۔

"اچھا بھئی مان لیا ہم نے کہ تم بڑے استاد ہو۔ لو ہاتھ جوڑتے ہیں جان بخش دو ہماری اور سیدھے باہر کا راستہ لو۔ اب، ہاں اور نہیں تو کیا....."

پالا سنگھ نے بھی اس معاملے کو زیادہ طُول دینا مناسب نہ سمجھا اور باہر جانے کے لیے پر تولنے لگا۔ پھر حسب عادت کہنے لگا:

"نہیں واکھی بھابی کوئی" کام ہو تو بتا دو۔"

"واکھی" بھابی کی چُندھی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"ہاں ہاں واکھی۔"

"شاباش! بس اسی طرح بڑوں کا کہنا مانا کرو۔ اچھا اب جاؤ تمہیں بخش دیا ہم نے۔"

جب وہ صحن سے ڈیوڑھی کے دروازے میں داخل ہونے ہی کو تھا تو بھابی کی بلند آواز سُنائی دی۔

"ارے پالی..... پالی رے۔"

"ہو بھابی۔"

اُس نے صحن میں آکر بھابی کی طرف دیکھا۔

"تو نے بھی کام کام کی رٹ لگا رکھی تھی۔ لے دیکھ آکے باگورو نے سُن لی ہے تیری۔"

"بات کیا ہے؟"

"ارے بڑی بھاری آندھی اٹھی ہے۔ کیا معلوم بارش بھی ہونے لگے۔ چھت پر رکھی ہوئی منجھٹی (کپاس کی چھڑیاں) اتار کر ڈیوڑھی میں رکھ دے اگر بھیگ گئیں۔ تو تنور گرم کرنے کی مشکل ہو جائے گی۔"

پالی فوراً چھت پر چڑھ گیا اور پھر تین چار پھیروں میں اُس نے ساری منجھٹی ڈیوڑھی میں جا پھینکی اور واقعی یہ کام اس نے بہت پھرتی کے ساتھ کیا تھا۔ اسے ختم کرتے ہی اُس نے ایک مرتبہ پھر اپنی پگڑی کو دُرست کیا اور نتھنے پھلا کر فخر سے بھابی کی طرف دیکھا۔

"ہو بھابی۔"

"ہو دیور۔" تاباں نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔

"کوئی اور کام ہو تو بتاؤ۔"

"نہیں بس بھیا۔"

"بتا دے اب پھر طعنے وانے مت دینا۔"

"نہیں بھئی بس اب اور کوئی کام نہیں۔"

اس پر پالا سنگھ ٹانگیں چوڑی کیے اینٹھ اینٹھ کر قدم اٹھاتا ہوا شاداں اور فرحاں گلی گلی چل دیا۔

معلوم ہوتا تھا کہ کوئی شخص بھوسے کا بڑا گٹھا ادھر سے لے کر گزرا تھا کیونکہ زمین پر بھُس کی لمبی سی لکیر گلی میں دُور تک چلی گئی تھی۔

وہ تنگ گلی میں سے ہوتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ ایک تو گلی تنگ اور پھر ہر مکان کے دروازے کے آگے بڑھا ہوا چبوترا۔ چلنے کے لیے راستہ اور بھی زیادہ تنگ

ہو گیا۔ بعض مکان جو ذرا اچھے کھاتے پیتے لوگوں کے بنوائے ہوئے تھے ایسے بھی تھے جن کے ہر دروازے کے آگے دائیں بائیں دو دو چبوترے بنے تھے۔ ان چبوتروں پر عام طور پر یا تو ننھے ننھے بچے کھیلا کرتے جو ہر آنے جانے والے شخص کو حیرت سے دیکھتے اور اُن کے کھلے ہوئے مُنہ سے رال ٹپکے جاتی یا گھر کے بہت ہی ضعیف آدمی پاؤں کے بل بیٹھے اپنی لمبی لمبی سفید ڈاڑھیوں میں کنگھا کیا کرتے۔ اپنی دانست میں ننھوں کی رکھوالی بھی کرتے۔ لیکن ان کی پیلی پیلی گدلی اور کمزور آنکھوں کو بہت کم سجھائی دیتا تھا۔ چنانچہ انہیں کسی ہونے والے حادثے کی خبر اس وقت ہوتی تھی۔ جب کوئی بچہ چار پاؤں سے چلتا ہوا دھڑام سے گلی کی کیچڑ میں جا گرتا۔ اس وقت بدمزاج بہورانیاں بھاگی بھاگی آتیں اور چھوٹے چھوٹے گھونگھٹوں کے پیچھے سے بڑبڑاتیں۔

"اتنا بھی تو نہیں کہ بچے کو دیکھتے رہیں۔ بس کھا پھٹ کر بیٹھ گئے۔"

بوڑھوں کی عمر کا یہ حصہ بڑا ہی صبر آزما ہوتا تھا۔ بہوؤں کو کون سمجھائے کہ بھلا ان بچاروں کو سجھائی بھی کہاں دیتا ہے جو وہ بچوں کی رکھوالی کرتے پھریں اور اگر دیکھ بھی لیں تو پیشتر اس کے کہ ان کی لرزتی ہوئی کمزور ٹانگیں انہیں وہاں تک پہنچائیں سپنولیوں کی طرح تیز و طرار بچے دم بھر میں پھسل کر نیچے جا گرتے۔

پالی اُونچے نیچے چبوتروں سے گزرتا اور سڑے ہوئے کیچڑ کو پھاندتا ہوا بڑھا جا رہا تھا۔ آگے گلی کشادہ ہو گئی تھی۔ وہاں چند دکانیں بھی تھیں۔ جہاں ضروریات کی معمولی چیزیں مل سکتی تھیں۔

اس وقت دُکانوں کے چبوتروں پر چند بڑے بوڑھے بیٹھے تھے۔ ان میں تایا ہر پرشاد اور کرم دین وغیرہ بھی شامل تھے۔ کرم دین حسب معمول حقّہ پی رہا تھا۔ حقّے کی آڑی چلم سے نکلتی ہوئی جھٹی ہوا میں جھُول رہی تھی۔ پالی نے سوچا کہ اگر وہ ادھر سے گزرا تو وہ اسے روک لیں گے۔ کرم دین اور ہر پرشاد بحث شروع کر دیں گے اور اسے ثالث مقرر کر کے اس کا مغز بھی چاٹیں گے حالانکہ وہ اس وقت دینو کی دکان کی طرف جانے کے ارادے سے نکلا تھا۔ چنانچہ کترا کر وہ

بغل والی گلی میں گھس گیا۔

یہ گلی اندر والے رہٹ پر جا نکلتی تھی۔ رہٹ گاؤں کے عین سرے پر ہی تھا۔ گاؤں والوں کے ایک حصے کو اس کی بہت بڑی سہولت تھی۔ عورتوں کے نہانے کا یہاں کوئی انتظام نہ تھا۔ البتہ مردوں کے لیے کوئی دقت نہ تھی۔ پالی آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ سامنے آسمان پر نگاہ دوڑائی تو دیکھا کہ گرد آسمان کی وسعتوں پر چھا گئی تھی۔ ایک مٹیالا دھبہ جس کی وسعت دم بدم بڑھتی چلی جا رہی تھی بارش کا امکان بھی تھا کیونکہ چیلوں کے جھنڈ پر پھیلائے آندھی کے آگے پرواز کرتے چلے آ رہے تھے۔

فضا پر عجب قسم کا سکوت طاری تھا۔ درخت چپ چاپ کھڑے تھے۔ ہوا بند تھی۔ گاؤں کے سرے کے مکانوں کو چھوتا ہوا ایک جوہڑ تھا جس میں بھرے ہوئے بدبودار، گدلے اور مٹیالے پانی کی سطح پرسکون تھی۔ ایسے سمے میں روں روں کرکے تیزی سے چلتا ہوا رہٹ آنکھوں کو بہت بھلا دکھائی دیتا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک اوپر تلے گھومتی ہوئی ٹنڈوں کی طرف دیکھتا رہا۔ کنوئیں کے پانی کی سطح دم بھر کو ہموار نہ ہوئی تھی۔ ٹنڈیں بڑی تیزی کے ساتھ یکے بعد دیگرے پانی میں غوطہ لگاتیں اور پھر بھری بھرائی ماہل سے چپکی ہوئی اوپر چڑھنے لگتیں۔ اوپر پہنچنے تک پانی ان کے کناروں سے چھلکتا رہتا۔ پالی سوچنے لگا کہ پرانے زمانے میں اس آدمی کا بھی کیا دماغ ہوگا جس نے کنوئیں سے پانی نکالنے کی یہ تجویز سوچی ہوگی۔ پانی اولو میں گر کر تلملاتا، کلبلاتا اور جھاگ اڑاتا آڈ (نالی) میں بہہ نکلتا تھا۔ کھیتوں کو پیچ وخم کھا کر جاتی ہوئی آڈ بھی آنکھوں کو بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ پانی کی شفاف سطح پر اونچے اونچے درختوں کے عکس جھلملاتے اور آڈ کے نمدار کناروں پر ایک خاص قسم کے گچھے دار چھوٹے چھوٹے پودے اُگ آتے تھے۔ لڑکے بالے انہیں اکھاڑ لیا کرتے اور کہتے یہ ہمارے بٹیر ہیں اور پھر وہ انہیں آپس میں بھڑا بھڑا کر لڑتے۔

رہٹ دیکھ کر پالی کو پیاس بھی لگ آئی۔ اس نے جوتا اتارا۔ اولو میں گھس گیا اور دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنا کر جھال کی طرف بڑھا دیا۔ پانی کے ننھے چھینٹے اُڑ

اُڑ کر اس کے بوٹوں اور بھنووں پر گرتے رہے۔ اس کے پاؤں تلے پانی کی تہ میں بیٹھی ہوئی نرم نرم ریت اور چکنی چکنی ٹھیکریاں پھسلتی رہیں۔ پانی پی کر اس نے پاؤں جھٹکا جھٹکا کر جوتوں میں ڈال دیئے۔ عین اس وقت رکھی پانی بھرنے کے لیے وہاں آن پہنچی۔

رکھی ایک بچے کی ماں بائیس سالہ حسین عورت تھی۔ اس کی بھابی کی طرح وہ بھی بڑی ہنسوڑ تھی۔ دانت صاف کبھی نہیں کرتی تھی۔ لیکن اس کے چھوٹے چھوٹے زردی مائل دانت دوسروں سے کم حسین دکھائی نہیں دیتے تھے۔ پھر اس کی ناک کے ایک نتھنے پر چپکی ہوئی چوڑی سر والی میخ کا تو کوئی جواب ہی نہ تھا۔ اس وقت گہرے نیلے رنگ کا تہبند اور لال رنگ کا چھینٹ کا ڈھیلا ڈھالا کرتا پہنے تھی۔ کرتے کے کپڑے کی سرخ زمین پر چھٹے ہوئے سپید سپید آم بہت دلکش دکھائی دیتے تھے اس کے کرتے عام طور پر ڈھیلے ڈھالے ہی ہوتے تھے لیکن اس کے متناسب جسم یعنی کمر، پیٹ، چھاتیوں کے خطوط کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا تھا۔ وہ ناباں کی سہیلی تھی اور ان کے گھر میں عام طور پر آیا کرتی تھی۔ پالی نے اسے کئی مرتبہ دیکھا تھا اور اس سے باتیں کی تھیں۔ اسے اس بات پر تعجب ہوا کرتا کہ یہ نازک عورت نہ معلوم کیسے چار چار گھڑے اُٹھائے بے خطر چلی جاتی تھی اور اب جو اس نے رکھی کو پانی بھرتے دیکھا تو اُسے خیال آیا کہ کم از کم تین گھڑے تو ضرور ہوں گے اس کے پاس اور واقعی تین گھڑے بھر کر اُس نے کنوئیں کی منڈیر پر رکھ لئے اور جب پالی مڑ کر اپنی راہ چلنے لگا تو پیچھے سے آواز سُنائی دی۔

"وے ویرا گھڑے تو اُٹھوا دے۔"

پالی نے گھوم کر دیکھا۔ وہ سر پر ایک گھڑا رکھے کچھ ہنس رہی تھی کچھ جھینپ رہی تھی۔ پالی نے ماتھے پر مصنوعی غصے کے بل ڈال کر کہا۔

"اور تجھے کس نے کہا تھا کہ درجن درجن گھڑے سر پہ رکھ کر چلا کر۔"

یہ کہہ کر وہ شتر مرغ کی طرح اس کی طرف بڑھا۔ جان بوجھ کر شیخی بگھارنے کے لیے گھڑے کے منہ میں ہاتھ ڈالا اور ایک ہی ہاتھ کے زور سے ہوا میں اٹھا

کرجواس کے پہلے گھڑے پر رکھا تو دھکے سے کچھ تو پانی چھلک کر رکھی کے چہرے اور سینے پر گرا اور کچھ اس کے سر پر دھمک پڑی۔ اس پر رکھی چیخ کر بولی۔

"میری گردن توڑے گا کیا؟"

پالی نے ہنسی روکنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں اس کے نتھنے پھول کر سرخ ہو گئے۔ مسخرے پن سے بولا:

"میں تیری گردن کیا توڑوں گا تو خود ہی تلی ہوئی ہے —— نہ اٹھایا کرا تنے گھڑے۔"

رکھی نے ہونٹ سیکڑ کر جواب دیا۔

"تیرا کیا بگڑتا ہے۔ کیا تجھے اٹھانے پڑتے ہیں گھڑے؟"

"اٹھانے نہیں پڑتے تو اٹھوانے تو پڑتے ہیں۔"

اس پر رکھی ناک پر انگلی جما کر بولی۔

"ارے ایک ہم ہیں کہ اتنے بڑے بڑے چار گھڑے اٹھائے بلا تکان چلے جاتے ہیں اور ایک تم ہو کہ.......... اچھا اب لاؤ وہ گھڑا میری بغل میں دے دو۔"

پالی نے منہ ڈھیلا چھوڑ کر اپنی زبان منہ میں ادھر ادھر گھمائی اور شرارت سے مسکرا کر کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا اور سب سے بڑے پیٹ والے گھڑے کے کنارے کو انگوٹھے اور صرف ایک انگلی کی گرفت میں لے کر اوپر اٹھا دیا۔ گھڑا ہوا میں جھولنے لگا۔

"کیوں کیا ہم کم جور ہیں؟"

رکھی کا کلیجہ حلق کو آ گیا۔

"بھئی لاؤ ہمارا گھڑا۔ کنارہ ٹوٹ گیا تو مفت میں گھڑا گر کر پھوٹ جائے گا۔ .... تھوڑا سا کام کہہ دیا تو مار کے کھا دیا مجھے۔"

پالی نے گھڑا اس کی بغل کی طرف اس طرح بڑھایا جیسے کوئی شخص کتے کے پلے کو ایک کان سے پکڑ کر اٹھا دے اور پرے پھینک دے۔

خدا خدا کر کے جب گھڑا اس کی بغل میں پہنچ گیا۔ تب کہیں چین آیا اسے۔

"جراسا کام کہہ کے پچھتائے۔" یہ کہہ کر رگی نے کمر ٹھمک دی تاکہ گھڑا ٹھکانے سے بیٹھ جائے اور بھر جانے سے پہلے وہ سر تو اوپر اٹھا نہ سکی۔ محض پپوٹے اٹھائے اور چُپ چاپ مُسکرا دی۔ جیسے کہہ رہی ہو "شکریہ"۔

وہ چلی گئی اور پالی کچھ دیر تک اسے پیچھے سے دیکھتا رہا۔ اس کی لمبی چوٹی کا سُرخ رنگ کا پراندا ادھر ادھر لہراتا رہا اور پھر گلی کے موڑ پر وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔

رہٹ کے آگے تھوڑی دُور تک ڈھلوان تھی۔ وہ بڑھا تو خواہ مخواہ اس کے قدم کھنچتے چلے گئے۔ اس کے پاؤں کی چاپ کی آواز سے ڈر کر ایک بڑا سا کچھوا جو ہڑ کے کنارے پر بیٹھا تھا رینگ کر پانی میں غوطہ مار گیا۔ توت کے درخت کی ایک بلند اور مضبوط شاخ سے جھولے کی رسی لٹک رہی تھی۔ غالباً گاؤں کی لڑکیاں اس پر جھولتی رہی تھیں۔

اب وہ گاؤں سے باہر نکل آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ باہر ہی باہر چکر لگاتا ہوا دینو کی دکان پر پہنچ جائے۔ وہ گوبر اور کیچڑ سے بچ بچ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا بڑھ رہا تھا اور ابھی وہ پنڈت گیان کے باڑے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ اسے تیز مردانہ لہجے کی ایک باریک آواز سنائی دی۔

"ہو پالی!"

اس کے قدم رُک گئے۔ اُس نے پیچھے کی طرف گھوم کر دیکھا کہ چنتو کھڑی ہے۔ وہ حسبِ معمول سر بلند سپاہیانہ انداز میں کھڑی مسکرا رہی تھی۔

"ست سری اکال!"

"سس سری اکال!"

چنتو اس کے قریب پہنچ گئی اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر لمحہ بھر اس کی طرف بغور دیکھنے کے بعد بولی:

"کہاں جا رہے ہو؟"

"اوہ کہیں نہیں۔۔۔"

"چھپاؤ مت، آخر یہ جو ٹیکے جا رہے تھے تو کچھ دال میں کالا ضرور ہے۔"

پالی نے بے داہی سے قہقہہ لگایا۔

"سچ کہتا ہوں کسی کام سے نہیں جا رہا تھا۔ بیکار بیٹھا تھا۔ سوچا ذرا چکر لگا آؤں۔"

"آخر بھی ہم سے کیا چھپانا۔ ۔ ۔"

"یہی دینو کی دکان تک جانے کا ارادہ تھا۔ بھلا اور کونسی جگہ ہو سکتی ہے میرے جانے کی۔"

چنتو کے بشرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے پالی کی بات کا یقین نہیں آیا۔ اس نے اس کے شانے کو قدرے ہلا کر ہاتھ ہٹا لیا اور پھر اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے بولی:

"دیکھو آج آندھی کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔ شاید بارش ہو، اولے بھی پڑیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اس بات پر پالی نے ایک مرتبہ پھر آسمان کی طرف دیکھا۔ آندھی کا غبار پھیل کر تقریباً سارے آسمان پر چھا گیا تھا۔ اُڑتی ہوئی چیلیں بھی قریب آن پہنچی تھیں۔ جو کور کھیتوں کے سلسلے دور پہنچ کر آپس میں بالکل گھُل مل ہو گئے تھے۔ بہت بڑے کچھوؤں کی مانند دکھائی دینے والی بھینس کی دھڑوں کے اوپر ہلکی ہلکی گرد اڑنے لگی تھی۔ پالی کی تیز نظریں اُفق کو چھو کر واپس چلی آئیں اور پھر چنتو کے چہرے پر گڑ گئیں۔

چنتو نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

"پالی! تم ہمارے یہاں نہیں آتے۔"

پالی نے پیشانی کے اوپر پگڑی کو ذرا آگے کو دباتے ہوئے جواب دیا۔

"واہ یہ تم کیسے کہتی ہو۔ کیا میں تمہارے ہاں کبھی نہیں جاتا؟"

اس پر چنتو کے لبوں پر مسکراہٹ پھوٹنے لگی۔ اس کے حساس نتھنے پھڑک اٹھے اور آنکھوں کے گوشوں کے خطوط ابتا کبھرے ہو گئے۔

"آتے ہو پر بہت کم۔"

اس اعتراف پر پالی کو مسرت حاصل ہوئی اور اُس نے اس مسرت کو چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی۔

"تو پھر کیسے کہتی ہو کہ میں کبھی آیا ہی نہیں۔"

"بھئی آج چلو تو جانیں۔"

"کیوں آج کیا ہے؟"

"ذرا آسمان کی طرف دیکھو، کیسی آندھی آرہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد شیت بارش بھی ہونے لگے۔ پھر دیکھنا کیسا سماں بندھتا ہے...... ایسے میں تم دینو کی دکان پر جاکر کیا کروگے؟"

پالی نے دل میں سوچا کہ واقعی دینو کی دکان پر کوئی خاص بات تو ہوگی نہیں۔

"لیکن تمہارے ہاں کیا ہوگا۔ تم ہوگی یا چاچا جوالا سنگھ۔ ہم کریں گے کیا؟"

"نہیں آج تو ہمارے ہاں کچھ مہمان بھی آئے ہوئے ہیں، کچھ پینے پلانے کا انتظام بھی ہے۔ اچھا جلسہ رہے گا۔ تمہارا چاچا کہہ رہا تھا کہ اگر پالی آجائے تو بس کیا ہی مزا ہو۔ اور سچ پوچھو تو میں اسی کھیال سے نکلی تھی کہ تم نجر آجاؤ تو ساتھ لے چلوں۔ تم راستے میں نہ ملتے تو میں تمہارے گھر جاتی..... اُدھر سے آندھی کا ڈر بھی تھا۔ اچھا ہوا جو تم مل گئے......"

پالی سر جھکا کر سوچ میں ڈوب سا گیا۔ جنتو نے اس کی کہنی کو ہاتھ سے تھپتھپا کر کہا۔

"کیوں ایسی سوچ بچار کیسی؟"

پالی کے ذہن میں سرتوں کے گھر والوں کا خیال تھا۔ لیکن اب وہ جوالا سنگھ سے تعلقات بھی رکھنا چاہتا تھا۔ سوچا تھا کہ تھوڑی دیر بعد آندھی کے شور اور گرد کی گھٹا میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے گا۔ مجھے کون دیکھنے آئے گا کہ میں اپنے گھر پر ہوں یا دینو کی دُکان پر ہوں یا جوالا سنگھ کے گھر میں اور پھر جنتو کے قول کے مطابق سماں بھی بہت اچھا تھا۔ ایسے موقعے پر شراب کی بوتل اور مُرغ کی بھرپور

مانگیں کھانے کو ملیں تو انسان کس چیز کی تمنا کر سکتا ہے۔ بلکہ ایسی بر محل دعوت کے لیے اسے جنتو کا شکر گذار ہونا چاہیئے۔ جنتو کا سوال سن کر وہ بظاہر لا پروا ہی سے ہنس پڑا۔

"نہیں سوچ بچار کا کیا کام، اور پھر اپنا گھر ہی تو ہے۔ اور نہیں تو چار گھڑی ہنس بول لیں گے۔"

جب وہ دونوں جوالا سنگھ کے گھر کی طرف لوٹے تو ہوا آہستہ آہستہ چلنے لگی۔

یہاں تک کہ جب وہ گھر کے قریب پہنچے تو دیوار کے اوپر دھرے ہوئے اُپلوں میں پھنسے ہوئے بھوسے کے تنکے بھی ہوا کے تند جھونکوں سے ہلنے لگے۔

مکان میں داخل ہونے سے پہلے کچی اینٹوں کی بنی ہوئی ایک ٹوٹی پھوٹی چار دیواری میں سے گزرنا پڑتا تھا۔ چار دیواری کے اندر بھی دھریک کے تین چار درخت کھڑے تھے۔ ان درختوں کے سائے تلے عام طور پر ان کی بکریاں ٹے ٹے کرتیں یا مرغیاں کڑ کڑاتیں۔ اسی جگہ آٹا پیسنے کا خراس بھی تھا۔ اب لوگ مشین کا آٹا کھانے کے عادی ہو گئے تھے۔ پھر بھی اس کی آمدنی معقول تھی۔ بھلا جوالا سنگھ کو اس کا بوجھ کیوں معلوم ہوتا وہ ایک بوڑھی سانڈنی خراس کے آگے جوت دیا کرتا تھا۔ سانڈنی مزے مزے میں چلتی رہتی۔ لوگوں کا اناج پس جاتا۔ اور جوالا سنگھ کے پیسے کھرے ہو جاتے۔ آمدنی کے حقیقی ذرائع تو کچھ اور ہی تھے لیکن ظاہر داری کے لیے کوئی نہ کوئی معقول پیشہ تو ہونا ہی چاہیئے۔

چار دیواری سے گزر کر وہ دونوں صحن میں داخل ہوئے۔ بالی نے صحن کے ایک گوشے میں کلغی دار مرغوں کے بہت سے سر اور نُچے ہوئے پر پڑے دیکھے تو اسے اندازہ ہو گیا کہ آج وسیع پیمانے پر دعوت کا سامان ہو رہا تھا۔

جنتو بالی کے آگے آگے چلی جا رہی تھی۔ وہ چار قدم پیچھے پیچھے تھا۔ جنتو نے لیار میں پاؤں رکھا ہی تھا کہ جوالا سنگھ قدرے غصیلے لہجہ میں بول اٹھا:

"اری تو کہاں کو چل دی تھی......"

"گئی تھی کھیت میں اپنے یار سے ملنے کے لیے ......" چنتو نے تنک کر جواب دیا۔

اتنے میں جوالا سنگھ کو بالی دکھائی دیا۔ پیار میں چونکہ چند شی مورتیں بھی دکھائی دے رہی تھیں، اس لیے بالی نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اوپر اٹھائے اور قدرے بلند آواز میں بولا:

"واہگورو جی کا خالصہ......"

"سری واہگورو جی کی فتح" اب دوسروں نے بھی اس کی سُر کے ساتھ سُر ملائی۔

حاضرین کی آواز سے گرم جوشی کا اظہار ہوتا تھا۔ بالی کو دیکھتے ہی جوالا سنگھ کی باچھیں کھل گئیں۔

"آہا بیٹا بالی! تم آگئے بھئی یہ تو بہت ہی اچھا کیا تو نے ...... آ ادھر بیٹھ جا چارپائی پر۔"

چنتو کا مزاج ابھی تک بگڑا ہوا تھا۔ وہ تیکھی نظروں سے جوالا سنگھ کی طرف دیکھتی ہوئی بولی:

"اب لگے بیٹا بالی، بیٹا بالی کہنے .... اسی کو بلانے کے لئے تو گئی تھی۔"

جوالا سنگھ نے یہ بڑا منہ بے معنی انداز میں کھول دیا اور لمحہ بھر تک اسے کھلا ہی رہنے دیا۔

"بھئی بہت اچھا کیا، آخر ہمیں کیا معلوم تھا کہ تو بالی کو بلانے کے لیے گئی ہے۔"

"معلوم کیسے نہیں تھا۔ کیا تم نے ہی نہیں کہا تھا کہ بالی آجاتا تو بڑا مزا آتا ..... اور اب لگے مجھی کو جھوٹا بنانے بالی کے سامنے۔"

"ارے بابا تو تو مفت میں ہاتھ دھو کر پڑ گئی ہے میرے پیچھے۔ آخر میں نے کیا کہہ دیا تجھے۔ گھر سارا نے کام کرنے کو پڑا ہے تجھے۔"

وہ بھاڑ میں گئے کام۔ کیا میں ہی کاموں کے لیے رہ گئی ہوں۔ بڑے کام لئے پھرتا ہے....."

اس پر جوالا سنگھ نے چپ ہی بھلی جھی۔ وہ جانتا تھا کہ جنتو کا یہ بڑبڑانا محض اوپری دل سے تھا۔ اگر اس نے مفت میں چوں دچرا کرکے بنا بنایا کھیل نہ بگاڑا تو وہ خود ہی سب کاموں سے نبٹ لے گی۔ چنانچہ اس نے جنتو کی جلی کٹی باتوں کی طرف توجہ نہ دی۔

اس دوران میں پالی نے بھی حاضرین کا آنکھوں ہی آنکھوں میں جائزہ لینا شروع کیا۔ ان میں تین مرد تھے اور ایک عورت۔ انہیں اس نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ ان کے گاؤں کے باشندے تو وہ خیر تھے ہی نہیں۔ ان میں ہر ایک نے چارخانے کا کھیس اوڑھ رکھا تھا۔ صرف عورت کا کھیس سادا تھا۔ لیکن اس کے دونوں کناروں پر سُرخ رنگ کا چوڑا حاشیہ مُوجود تھا۔

ہوا تو ابھی چلنی شروع ہوئی تھی۔ اس سے پہلے تو شدّت کی گرمی پڑ رہی تھی۔ اس کے باوجود ان لوگوں نے کھیس کیوں لپیٹ رکھے تھے۔ تینوں مردوں کی صورتیں اچھی طرح دکھائی نہ دیتی تھیں۔ البتہ عورت نے کھیس چھاتی سے اوپر کھینچنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ شاید اس کی تہ میں ذوقِ نمائش کا دخل تھا۔ ورنہ وہ بھی ساتھیوں کی طرح کھیس لپیٹے گُپ چُپ بیٹھی رہتی۔

پالا سنگھ کے لیے یہ بات تعجب انگیز ضرور تھی۔ لیکن اس وقت اس کی حقیقت دریافت کرنے کا موقعہ بھی نہیں تھا۔

جنتو کی باتوں سے کان ہٹا کر جوالا سنگھ نے خاصی بلند آواز میں مخاطب ہو کر کہا۔

"یہ اپنا ہی لڑکا ہے۔ بچپن ہی سے سیر کرنے کا شوکین تھا۔ بارہ تیرہ برس کی عمر میں یہ گھر سے بھاگ نکلا اور پھر کئی برس تک گھر سے غائب رہا۔ آخر لمبے عرصے کے بعد گھر پہ مُنہ آن دکھایا...... جب یہاں سے گیا تھا تو یہ بالکل ننھا سا تھا۔ اب جو واپس آیا تو صُورت میں زمین و آسمان کا پھرک پیدا ہو گیا

تھا۔

حاضرین میں سے کسی کے بشرے سے اس بات کا اظہار نہیں ہوتا تھا کہ انہیں اسے دیکھ کر مسرت حاصل ہوئی ہے۔ وہ چپ چاپ جس انداز سے جیسے پہلے بیٹھے تھے۔ اسی انداز میں بیٹھے رہے اور سرد نگاہوں سے پالی کی طرف دیکھتے رہے۔ کھیوں میں ان کی ڈاڑھیاں تو چھپی ہوئی تھیں۔ البتہ ان کی آدھ کھلی آنکھیں کبھی بہت خطرناک معلوم ہونے لگتیں اور کبھی بالکل معصوم۔ محض عورت تھی کہ اس نے پالی کا نام سن کر ذرا سا رُخ بدلا۔ پالی نے دیکھا کہ عورت کی ناک اور آنکھیں بہت ہی دل کش تھیں۔

پالی بھی جوالا سنگھ کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ لیکن ان سب کی پُراسرار خاموشی کی وجہ سے اسے کوفت سی ہونے لگی۔ رفتہ رفتہ ہوا تیز چلنے لگی۔ پالی نے دروازے میں سے دیکھا کہ ہوا لحہ بہ لحہ تیز ہوتی جا رہی تھی اور گرد اس قدر پھیل چکی تھی۔ کہ صحن سے پرے کوئی چیز ہی نہیں دکھائی دیتی تھی۔ آخر جب گرد اندر بھی داخل ہونے لگی تو پالی نے اُٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔ جوالا سنگھ اٹھا اور دیوار کی کھونٹی کے ساتھ لٹکی ہوئی لالٹین کا بٹن دبا کر چمنی اوپر اٹھا دی اور پھر ماچس جلانے لگا۔ دو تیلیاں خالی گئیں۔ تیسری جل اُٹھی اور اس نے لالٹین روشن کر ہی دی۔

یہ کام ختم کر لینے کے بعد سب کی طرف اچٹتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے پہلے ایک گہرا سانس اندر کھینچا اور پھر بلند آواز کے ساتھ منہ سے ہوا اس طرح چھوڑ دی جیسے اس نے بڑے معرکے کا کام کر ڈالا ہو۔

کچھ دیر تک جوالا سنگھ بلند آواز میں باتیں کرتا رہا۔ لیکن گفتگو میں اور کسی نے حصہ نہ لیا۔ یونہی ان پراسرار آدمیوں میں سے کسی کے نتھنوں میں سے درندے کی غراہٹ کی سی آواز پیدا ہوتی اور مونچھیں نامعلوم طور پر متحرک ہو کر رہ جاتیں۔

اتنے میں جنتو اندر آئی۔ اس کے ہاتھ میں مٹی کے آبخورے تھے۔ اس نے آبخورے ایک بڑے آلے میں رکھتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر

اس کی نظریں دوسری عورت کے چہرے پر جا کر رک گئیں۔ حسبِ معمول بے تکلفانہ لہجے میں بولی:

"کیا نام تمہارا ...... پیارے ذرا اُٹھ کر مجھے (آبخورے) ہی دھو ڈال۔"

معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ان کی آپس میں بے تکلفی نہیں ہوئی تھی۔ اجنبی عورت نے جنتو کی اس بات پر فوراً اُٹھنے کی بجائے ان میں سے ایک مرد کی طرف دیکھا اس مرد کے رخساروں کی ہڈیاں اُبھری ہوئی تھیں۔ چہرے پر چیچک کے داغ تھے۔ خصوصاً اس کی اونچی ناک کی نوک پر بے شمار چھوٹے چھوٹے داغوں کی جالی سی بنی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ اس کے ابروؤں کا ہلکا سا اشارہ پاکر عورت نے قمیص اُتار کر پرے رکھ دیا۔ وہ تہبند سنبھالتی ہوئی کھڑی ہوئی تو پالی نے دیکھا کہ وہ خاصی تگڑی عورت تھی اور پھر جب اس نے پیٹ پر کھینچ کر تہبند کے پلّو کسے تو اس کی آگے کو بڑھی ہوئی ہنڈول چھاتیوں سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگ سکتا تھا کہ قدرے موٹاپے کے باوجود اس کا جسم ڈھیلا ڈھالا نہیں تھا۔ خدوخال بھی واجبی تھے۔ اس کے چلنے پھرنے اور اوڑھنی سنبھالنے کا انداز ایسا دلکش تھا کہ مرد کے دل میں خواہ مخواہ پیار پیدا ہوتا تھا۔ وہ خاصی کھائی کھیلی عورت معلوم ہوتی تھی۔ اس کا بھرپور بدن اور ناز و ادا اس بات کے ضامن تھے کہ وہ اپنے مقابل مضبوط سے مضبوط مرد کو پوری طرح تسکین دے سکتی تھی۔

اس نے آبخورے پسار کے اندر ہی دھو ڈالے۔ کچے فرش پر پانی کی لکیریں سانپوں کی طرح بل کھاتی بہہ نکلیں۔

جوالا سنگھ نے پالی کو سرگوشی میں بتایا کہ چیچک کے داغوں والے آدمی کا نام مت سنگھ ہے۔ پرانا خرانٹ ہے۔ عورتوں اور نوعمر لڑکیوں کو گھر سے بھگا کر لے جانا اور پھر انہیں کسی اور کے ہاتھ بیچ ڈالنا اس کا خاص پیشہ ہے۔ وہ اس فن میں استاد ہے یہ نہ سمجھو کہ صورت خراب ہے تو عورتیں اس سے نفرت کرتی

ہوں گی۔ نہ معلوم اس میں کیا بھید ہے۔ تم نے دیکھا ہو گا کہ بعض آدمیوں کے ہاتھ پر بھینس بیٹھ جاتی ہے یعنی خواہ کتنی ہی اڑیل، ضدی۔ اور بدکتی ہو، جہاں اس نے تھن پر ہاتھ رکھا اور وہ رام ہو گئی۔ یہی حال مت سنگھ کا ہے ایسے مزے مزے میں لڑکیوں اور عورتوں کو پھسلاتا اور انھیں سبز باغ دکھاتا ہے کہ بس وہ اسی کی ہو رہتی ہیں۔ لیکن صرف اتنی سی بات نہیں ہے وہ دیگر فنون میں بھی ماہر ہے لڑنے بھڑنے میں بھی بہت شہرت حاصل ہے اسے۔ بلکہ اپنی اس صفت پر اسے ناز بھی بہت ہے۔ دیگر نیک کاموں مثلاً چوری ڈاکے وغیرہ میں بھی حصّہ لیا کرتا ہے۔ ۔ ۔ ۔"

پیارو نے آبخورے دھوڈالے تو ان تینوں میں سے ایک اُٹھا اور اس نے کونے میں پڑا ہوا ایک پُرانا ٹرنک تینوں چارپائیوں کے قریب فرش پر رکھ دیا اور وہ آبخورے ٹرنک کے اُوپر بغیر کسی قرینے کے دھر دیے گئے۔ —— پالی چونکہ انھیں بغور سے دیکھ رہا تھا۔ اس لیے جب وہ آدمی اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا تو اس نے جانچ لیا کہ وہ اکہرے بدن اور اُدھیڑ عمر کا شخص تھا۔ جرالا سنگھ نے کھسر پھسر جاری رکھی۔ ۔ ۔

" ۔ ۔ ۔ ۔ اور اس آدمی کا نام سادھو سنگھ ہے۔"

یہ نام سُن کر پالی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھُوٹنے لگی۔ نام سادھو سنگھ لیکن وہ صورت سے گرہ کٹ معلوم ہوتا ہے دُبلے پتلے پاؤں پھرتیلا جسم اور متجسس آنکھیں۔

پیارو جُوتیاں پھٹپھٹاتی چارپائی کی طرف بڑھی اور مت سنگھ کے ساتھ سٹ کر بڑے ٹھسے سے بیٹھ گئی۔ وہ اس انداز سے بیٹھی ہوئی بھی بڑی بھلی دکھائی دیتی تھی۔ اس کی موٹی آنکھوں کے نیچے قدرے بھونڈے پن سے پھیلا ہوا کاجل بُرا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس کے ہونٹ مسکراہٹ اور سنجیدگی کا نہایت حسین سنگم دکھائی دیتے تھے۔

باہر آندھی چلنے لگی تھی۔ چند لمحہ پیشتر جو سکوت طاری تھا۔ اب اس کی جگہ انتہائی

شور و غل نے لے لی تھی۔ چنانچہ جینتو کسی کام سے اندر آئی تو بولی:

"گرد ..... گرد ہی گرد۔ سورج ڈوبا نہیں اور باہر دیکھو تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کالی رات۔"

بوالا سنگھ نے پالی کی ران میں چٹکی بھر کر پوچھا۔

"کہو بیٹا! پسند ہے پیارو چاہو تو مل سکتی ہے۔"

پالی بھاری آواز میں ناک ہی ناک میں ہنسا

بوالا سنگھ نے اپنے مخصوص انداز میں گلوں سے نیچے لٹکے ہوئے گوشت کو جنبش دی۔

بڑی چلبلی اور حرام جادی ہے یہ عورت۔ معلوم ہے یہ لوگ کیا کرتے ہیں۔ مت سنگھ کسی اچھے گھرانے کے رنڈوے مرد پر ڈورے ڈال کر اس سے کچھ رقم لے کر پیارو کی اس کے ساتھ شادی کر دیتا ہے۔ تم جانتے ہی ہو باج لوگوں کا کسی ایب کی وجہ سے بیاہ نہیں ہوتا۔ ان کے گھر والوں کو بہو کا بہت چاؤ ہوتا ہے۔ وہ بہو کو گہنوں سے لاد دیتے ہیں۔ پھر ایک روز شام کو بکت پیارو کہتی ہے۔ میں جرا گھنے جاؤں گی۔ ایک بڑی بوڑھی اس کے ساتھ بھیج دی جاتی ہے کھیت میں پہنچ کر بڑھیا تو مینڈھ پر بیٹھتی ہے اور گہنوں سے لدی پھندی پیارو چپکے چپکے کھیت کے اندر ہی اندر چلتی ہوئی پرے چلی جاتی ہے اور وہاں مت سنگھ پہلے ہی سے ماجود ہوتا ہے اور وہ اسے اڑا کر لے آتا ہے۔"

پالی کو یہ ترکیب سن کر بڑی خوشی حاصل ہوئی اور اس نے کسی حد تک دانتوں کی نمائش بھی کی۔

پھر پالی نے تیسرے مرد کی طرف جو پہاڑ کی مانند پوری چارپائی جما بیٹھا تھا۔ اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"چاچا وہ کون ہے؟"

جوالا سنگھ نے ناک کے نتھنے میں انگلی ڈال کر ایک لمبا سا چوہا باہر نکالا اور پھر اسے چارپائی کی پٹی کے ساتھ چھوڑتے ہوئے کہنے لگا۔

"وہ جیل سنگھ ہے ..... تم نئے نئے آئے ہو اور اسے نہیں جانتے

اسس بکت اس کے مکابلے کا ڈاکو پنجاب بھر میں نہیں ہوگا۔ پُس (پولیس) کا اس نے ناک میں دم کر دیا ہے۔ اپنے جلیع (ضلع) میں ڈاکہ نہیں ڈالتا ہے۔ لیکن لائل پور گوجرانوالہ، گجرات، سرگودھا بگیرہ (وغیرہ) میں اس کی دھاک بیٹھی ہوئی ہے۔ لوگوں نے اس کا نام سن رکھا ہے پر بہت کم لوگ پہچانتے ہیں اسے۔ آج کھاس مہمان تو یہی ہے تمھارے باپ کے جاتے ہیں تو وہ چھوٹا ہی تھا۔ اس کی عمر تم سے کچھ سات برس جیادہ ہو گی۔ دیکھ لو کیسا دیو کا دیو ہے۔ . . . ہے بڑا نیک آدمی۔ ڈاکہ ڈالنے سے پہلے گوردوارے میں متھا ٹیکنے کے لئے جرور جاتا ہے۔ اسی لیے تو اسے ہر کام میں سپھلتا ہوتی ہے۔"

چنتو نے مصنوعی غصّے سے چلّا کر کہا۔

"یہ کیا دھیرے دھیرے کھسر پُسر کئے جا رہے ہو۔ بوتلیں تو نکالو۔ کہاں رکھی ہیں . . . "

جوالا سنگھ نے ہنس کر کہا۔

"دیکھو اب میں آرام سے بیٹھا ہوا ہوں۔ تم کھد ہی نکال لاؤ۔ ڈھارے کے نیچے اُپلوں میں دبی پڑی ہیں بوتلیں۔"

چنتو تھی ہنس مکھ اور باہمت عورت۔ لیکن سب کا بڑے آرام سے بیٹھے رہنا اور اسے اِدھر اُدھر بھاگنے پر مجبور کرنا اس کے دل کو بری طرح کھلتا تھا۔

خیر بوتلیں بھی ٹرنک پر رکھ دی گئیں۔

اب محفل میں زندگی کے آثار پیدا ہوئے۔ وہ اپنی اپنی جگہ پر پہلو بدل بدل کر لعابِ دہن نگلنے لگے۔

گھر کی کشید کی ہوئی ناجائز شراب کی تیزی اور نشے کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا اور پھر اس میں پانی وغیرہ ملائے بغیر حلق سے اتار لینا کچھ انہی لوگوں کا کام تھا۔

سادھو سنگھ نے بڑی متانت سے چالیس اونس کی بوتل کے منہ میں پھنسے ہوئے مضبوط کاک کو دانتوں میں دبا کر ایک جھٹکے سے کھینچا اور بھاق کی آواز سے کاک

باہر نکل آیا۔ تھوڑی شراب اس کے ہاتھ پر گر پڑی۔ وہ اسے پگڑی کے شملے سے پونچھنے لگا تو چنتو نے بڑھ کر اسکی طویل داڑھی کو مٹھی میں لے کر کہا۔

"بھلا یہ داڑھی کس کام کے لیے بڑھا رکھی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے اس کی داڑھی ہی سے ہاتھ پونچھ ڈالا۔

چنتو کی اس بات پر حاضرین کے لبوں پر مسکراہٹ پیدا ہوئی اور بعض کے دانتوں میں سے مختصر سی ہنسی بھی نکل پڑی۔

جب چنتو نے ایک بڑا دیگچہ بھی فرش پر لا رکھا تو مسالوں اور شراب کی ملی جلی خوشبو سے سب کے نتھنے مہک اٹھے۔ انھوں نے قمیص شانوں سے گرادئے اور قدرے آگے کو جھک کر چارپائیاں ایک دوسرے کے قریب گھسیٹ لائے اور ساتھ بڑھا بڑھا کر شراب کے آبخورے تھامے اور پھر اسے حلق میں انڈیل کر باچھیں پونچھنے اور چٹخارے لینے لگے۔

ایک ایک آبخورہ چڑھا لینے کے بعد حاضرین میں سے ہر ایک کے لبوں پر فراخ دلانہ مسکراہٹ پیدا ہوئی اور انھوں نے ایک دوسرے سے جان پہچان کرنے کی غرض سے پہلے کی نسبت زیادہ توجہ سے دیکھنا شروع کر دیا۔

جیل سنگھ کے کھوجوں سے چارخانے والا کھیس کھسک کر اس کی کمر کے گرد لپٹ کر رہ گیا تھا۔ اس کی عمر تیس برس سے زیادہ کسی صورت میں بھی نہ ہو سکتی تھی۔ اس کی داڑھی چھدری چھوٹی اور خوش وضع تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ سکھی اصولوں پر سختی سے پابند تھا۔ اس کے بال بہت باریک اور ہلکے تھے صورت بھی بری نہ تھی۔ لیکن بدن دہرا تھا۔ بہت چوڑے کاندھے، ابھرا ہوا سینہ موٹی گردن اور بیٹھی ہوئی آواز تھی۔ اس کے بڑے بڑے ہاتھوں کی لمبی اور بھرپور انگلیاں پھیلی رہتی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ آپس میں مل نہیں سکتی تھیں۔ جڑ کی طرف پہلے جوڑ کے نیچے نیچے اس نے انگلیوں پر باریک سی کی ڈوری خوب کس کر لپیٹ رکھی تھی اس طرح غالباً ہاتھ کی گرفت بہت سخت ہوتی تھی۔ جو کوئی ایک مرتبہ ان انگلیوں کی لپیٹ میں آ جاتا مشکل ہی سے چھٹکارا پاتا۔

پہلا آبخورہ ختم کرنے کے بعد جیل سنگھ نے شراب سے تر مونچھوں پر ہاتھ پھیر کر انھیں نیچے جھکایا اور پھر اُنھیں زور سے چوس کر آزاد چھوڑ دیا۔

ایسے موقعہ پر چنتو بھی چُوکنے والی نہیں تھی۔ وہ بھی کُہنی آلے میں ٹیک کر اور دھڑ کا سارا بوجھ اسی پر ڈال کر ایک آبخورہ چڑھا گئی اور پیارو کو چپ چاپ بیٹھے دیکھ کر اس سے نہ رہا گیا۔

"اری پیارو۔ ۔ ۔ ۔"

پیارو نے چُپ چاپ اس کی طرف دیکھا اور نازک اُنگلیوں سے نتھنے پر چمکتی ہوئی کیل کو ٹٹولنے لگی۔

"ہو پیارو۔ ۔ ۔ تم بھی تو پیو ایک آدھ کٹھّا۔"

پیارو نے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑی ادا سے ناک چڑھا کر کہا۔

"نا ہم نہیں پیتے۔"

چنتو نے سینہ پر ہاتھ رکھ کر زور کی ہچکی لی۔

"اچھا جی؟ —— وہ کیوں؟"

"ہمیں اچھی نہیں لگتی۔"

اسی اثنا میں چنتو نے ایک آبخورہ شراب سے بھر دیا اور اسے چھلکاتی ہوئی پیارو کے قریب چلی گئی۔

"تو میری کٹّو! ذرا چکھ کر تو دیکھو۔"

پیارو نے پھر ناک چڑھائی اور بڑھتے ہوئے آبخورے کو دور ہی سے روکتے ہوئے بولی:

"بس جی بس ہمیں تو اُبکائی آنے لگتی ہے۔"

چنتو کا ہاتھ رک گیا۔ اس کا منہ قدرے کھلا ہوا تھا۔ وہ لمحہ بھر کھوئی کھوئی نظروں سے پیارو کی طرف دیکھتی رہی۔

"ہے۔ ۔ ۔ ۔ جب اور سب پاپڑ بیل چکی ہو تو پھر اس میں ایسا حرج ہی کیا ہے؟"

ایسے موقع پر بھلا پیارو منہ توڑ جواب دیے بغیر کہاں رہ سکتی تھی۔

"اجی یہ ایک پاٹڑ تمہارے بیلنے کے لیے چھوڑ دیا ہم نے۔"

پیارو کی حاضر جوابی پر سب مرد قہقہے لگا کر ہنس پڑے جیسے کوئی سیڑھیوں پر سے متعدد خالی کنستر لڑھکا دے۔

جوالا سنگھ نے ہاتھ جھٹک کر داد دیتے ہوئے کہا۔

"آہا پیارو! قربان جائیے کیا بات کہی ہے۔"

ہمت سنگھ نے پیارو کی کمر بازو کے حلقے میں لینے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا:

"پیارو، پیارو ہی ہے۔"

اس پر سادھو سنگھ نے ترنگ میں آ کر کہا:

"پر ہمت سنگھ تم بھی بس ہمت سنگھ ہی ہو۔ ۔ ۔ ۔ کوئی ہے تمہارا ثانی؟"

ہمت سنگھ نے دوسرے آبخورے کا کچھ حصہ خالی کرنے کے بعد سادھو سنگھ کی پیٹھ پر ہاتھ مارا۔

"اور سادھو سنگھ تم بھی بس سادھو سنگھ ہی ہو۔" یہ کہہ کر اس نے چاروں طرف بڑی داد طلب نگاہوں سے دیکھا جیسے اس نے بڑے معرکے کی بات کہہ دی ہو۔"

یار اپنا سادھو سنگھ بھی بڑا لگ لگ ہے۔"

جوالا سنگھ نے سر کے چھوٹے سے جوڑے کو چھو کر کہا۔

"اب تو سادھو سنگھ عیش کرتا ہے پیتا ہے اور چین کی بنسری بجاتا ہے۔"

جنتو نے دیگچے کا ڈھکنا اوپر اٹھایا۔ بھاپ کا بادل ایک بھبک کے ساتھ باہر نکلا اور کچھ دیر تک تو جنتو کو یہ بھی نظر نہ آیا کہ دیگچے میں مہان پرشاد (گوشت) ہے بھی یا نہیں جب بھاپ کم ہوئی تو اس نے کڑچھے سے بڑی بڑی بوٹیاں ایک طویل و عریض تھال میں ڈالنی شروع کر دیں۔

ہر مرغ کے صرف دو ٹکڑے کیے گئے تھے۔ پیٹھ اور ٹانگیں ایک طرف اور سینہ

اور بازو دوسری طرف۔ شوربہ بہت گاڑھا تھا جب وہ بوٹیاں نوچتے تو شوربے کی بوندیں ٹپک ٹپک کران کی داڑھیوں پر گرتیں۔ اور پھر وہیں بالوں میں پھنس کر رہ جاتیں۔ وہ شراب پی رہے تھے اور زور زور سے باتیں کئے جا رہے تھے۔

اب پالی کو بھی لطف محسوس ہونے لگا تھا۔ کچوری سے گالوں والی پیارو سے بھی دو تین مرتبہ آنکھ لڑ چکی تھی۔ اس نے سوچا کہ اچھا ہی ہوا جو وہ آج ادھر چلا آیا۔ ورنہ اس وقت وینو کی دکان پر کیا دھرا ہے اور پھر باہر آندھی کے بعد بڑے زور کی بارش بھی ہونے لگی تھی۔ بھلا کسی کو کیا معلوم کہ وہ اس وقت کہاں بیٹھا ہے۔ راز افشا ہو جانے کا کوئی خدشہ نہیں تھا۔ اس قسم کے خیالات سے پالی کے دل کو از حد اطمینان محسوس ہوا اور وہ ٹانگیں سمیٹ کر سنبھل کر چارپائی کے اوپر ہو بیٹھا۔

اب آپس میں ادھر اُدھر کی بے تکی باتیں ہونے لگیں۔ کہاں تو ان میں سے ہر ایک چپ چاپ اپنی ہی دھن میں مگن بیٹھا تھا۔ اور کہاں اب جو باتیں کرنے پر آئے تو ایک دوسرے کی بات سننے کا یارا نہ رہا۔

دفعتاً مت سنگھ کھیس لہراتا ہوا اٹھا اور لمبے لمبے پر پھڑ پھڑاتے ہوئے گدھ کی طرح جنتو کی طرف بڑھا اور لڑکھڑاتی زبان میں بولا:

"میں شراب نہیں پیوں گا۔"

پالی نے جانچا کہ مت سنگھ ایک قد آور مضبوط ہاتھ پاؤں کا شخص ہے داغوں بھرے چہرے اور سرخ آنکھوں کی وجہ سے وہ اور بھی خوفناک دکھائی دیتا تھا۔

جنتو کا دماغ بھی اس وقت عرش پر تھا۔ اونچے بانس کی طرح لہرا کر بولی:

"نہیں پیو گے شراب؟"

"نہیں۔"

پھر مت سنگھ نے ریچھ کی طرف نفی میں سر زور زور سے اِدھر اُدھر ہلایا۔ سر کے ساتھ اس کا دھڑ بھی ہل گیا۔

خاص شرابیوں کے سے غنصانہ انداز میں جنتو اس پر جھکی اور آنکھوں کی پتلیاں
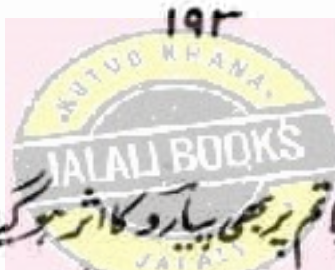
گھما کر پوچھنے لگی:

"کیوں نہیں پیو گے؟ کیا تم پر بھی پیارو کا اثر ہو گیا ہے؟"

"نہیں میں گھُٹے (آبجورے) میں نہیں پیوں گا۔"

اس پر چنتو نے اپنی لڑکھڑاتی ہوئی ٹانگوں پر جسم کا توازن ٹھیک رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا:

"تو کاہے میں پیو گے؟"

"اوک سے پئے گا"۔ جوالا سنگھ نے لقمہ دیا۔

"ناہیں"۔ مت سنگھ نے پھر زور زور سے سر ہلا دیا۔

مت سنگھ جو ناچ کھڑا ہوا تو میں اور گرما گرمی پیدا ہو گئی۔ اس دوران میں بائی کو محسوس ہوا کہ پیارو اس کی جانب میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھ رہی ہے۔

جیل سنگھ ہنس کر بھاری آواز میں بولا۔

"اوک سے نہیں وہ چھتر (جوتے) میں پئے گا۔"

"ناہیں"۔ مت سنگھ نے پھر زور سے سر ہلا دیا۔

چنتو لڑکھڑا کر پہلے تو بے اختیار پیچھے کی جانب ہٹی اور پھر ایک جھٹکے کے ساتھ زور سے آگے بڑھی اور مت سنگھ کے سینہ پر انگلی رکھ کر بولی: "تو پھر تم کاہے میں پیو گے؟"

مت سنگھ پہلے تو لمحہ بھر سُرخ آنکھوں سے چنتو کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے دفعتاً ہاتھ بڑھا کر بوتل اُس کے ہاتھ سے چھین لی اور اس سے منہ لگا کر غٹا غٹ چڑھا گیا۔ بوتل خالی ہو گئی تو اُس نے اسے منہ سے پرے کر کے اوپر اُٹھا لیا اور اس میں سے ٹپکنے والی آخری بوند کے نیچے بھی اپنی زبان بڑھا دی...... پھر وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے پیچھے کی طرف ہٹا۔ یہاں تک کہ اس کی پیٹھ گھڑونجی پر جا کر ٹک گئی اور وہ سر ہلا ہلا کر بڑی درد ناک اور غیر مسلسل آواز میں وارث شاہ کی ہیر گانے لگا۔

"اساں دت نہ آن کے کھیڈنا ای......"

تھوڑی دیر تک وہ گاتا رہا۔ پھر اس کی آواز محفل در دمیں ڈوب کر رہ گئی بالآخر اُس نے سست نظروں سے حاضرین کی طرف دیکھا اور پھر دونوں بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹے
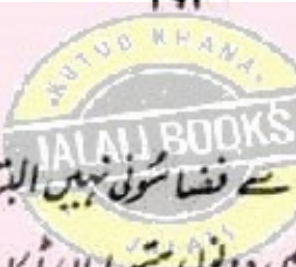
اور سر جھکا کر بازوؤں میں چھپا لیا۔

اس کے خاموش ہو جانے سے فضا سُونی نہیں البتہ سنجیدہ ضرور ہو گئی تھی۔ جنتو بھی غٹ ہو گئی تھی۔ وہ بڑے مُسلے میں دونوں ہتھیلیاں ٹکائے اس انداز سے کھڑی تھی جیسے اسے نیچے گر پڑنے کا خطرہ لاحق ہو۔

باقی چاروں کے حواس قائم تھے۔ وہ آپس میں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے جوالا سنگھ کو اپنی بے تحاشہ اُگی ہوئی داڑھی میں سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ اس نے فوراً تین چار انگلیاں چور کی تلاش میں داخل کرتے ہوئے ہنس کر گم سُم مت سنگھ کی طرف دیکھا

"جب ہم چھوٹے ہوتے تھے تو مت سنگھ، میں اور گاؤں کے دیگر لڑکے مکّن میٹی (آنکھ مچولی) کھیلا کرتے تھے۔ ۔ ۔ ۔ یہ بھی جوانی کے شروع ہی میں گاؤں سے بھاگ گیا اور اگر سچ پوچھو تو ایک طرح سے اب بھی بھاگا ہوا ہے۔ کیا ہوا جو کبھی کبھار آن کر گاؤں والوں کو مُنہ دکھا گئے"

جیل سنگھ نے ابرو سے پالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "یہ کون ہے؟"

"ارے! اس کی بات تو کی تھی تم سے ایک دفعہ۔ جانتے نہیں یہ سنتا سنگھ کا لڑکا ہے پالا سنگھ۔ ۔ ۔ سنتا سنگھ۔ جانتے تو ہو اس کا نام"

"ہو ہو بھلا سنتا سنگھ کا نام کس نے نہیں سُنا۔ اچھا آج کل کیا کرتا ہے یہ چھوکرا؟"

جیل سنگھ عمر میں پالی سے بڑا تھا۔ اس کا ڈیل ڈول بھی زبردست تھا لیکن پالی کو اس کا اندازِ گفتگو پسند نہیں آیا۔ وہ اس کا ذکر اس انداز سے کرتا تھا جیسے وہ اس کے سامنے کل کا بچہ ہو۔ اس کا حلق کچھ خشک سا ہونے لگا۔ وہ چارپائی کی پٹی پر ہاتھوں کا دباؤ ڈال کر اُٹھنے لگا تو جوالا سنگھ نے پوچھا:

"اُٹھتے کیوں ہو۔ ۔ ۔ خیر تو ہے۔ ۔ ۔ ؟"

"پیاس لگی ہے جرا پانی پیوں گا۔"

"میں لائے دیتی ہوں" پیارو نے جلدی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ اس نے شراب نہیں پی تھی۔ چنانچہ گھڑونجی کی طرف چلی تو پالی کی نگاہوں نے اس کا تعاقب کیا۔
جوالا سنگھ اور جیل سنگھ باتوں میں معروف تھے مت سنگھ نے کسی اور کے جانے بغیر سر اُوپر اٹھایا اور خوبناک نظروں سے پالی کی طرف دیکھنے لگا۔ پالی کی نظریں پیارو کی نگاہوں کی متلاشی تھیں۔ چھنتے میں پانی انڈیلتے وقت پیارو نے گھوم کر دیکھا اور بے خبری میں گھڑا اس کے ہاتھ سے چھوٹا اور قلابازی کھا کر گھڑونجی سے فرش پر گرا۔ گرتے ہی ٹوٹ گیا اور سارے فرش پر جل تھل ہو گیا۔
پالی اس کی مدد کرنے کے لیے جلدی سے اُٹھ کر آگے بڑھا تو دفعتاً مت سنگھ نے ان دونوں کے درمیان حائل ہو کر اسے کہنی کے ٹھوکے سے بڑے زور کے ساتھ پیچھے دھکیل دیا اور نشے میں ڈوبی آواز میں بولا:
"سردار جی! جوا ہوش کی دوا کرو!"
پالی پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ مت سنگھ کے تیور بدلے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ معلوم نشے کی ترنگ میں اسے پالی پر کیا شک گزرا۔ وہ قدم بقدم بڑھتا ہوا پالی کے قریب پہنچا۔ پالی کو لمحہ لمحہ اس کا داغوں بھرا چہرہ اپنی آنکھوں کے قریب آتا ہوا دکھائی دیا۔ یہاں تک کہ اسے بے شمار داغوں سے بھری ہوئی ناک دکھائی دینے لگی اور پھر زناٹے کا ایک تھپڑ اس کے منہ پر پڑا اور اس کی پگڑی پرے جا گری ——— پالی نے لمحہ بھر کو چپ چاپ اس کی طرف دیکھا اور پھر دھیرے سے کہا۔ "میں لڑائی بھڑائی پسند نہیں کرتا۔ اب تم اپنی جگہ پر بیٹھ جاؤ۔" لیکن مت سنگھ کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا تھا۔ اس کا پنجہ اس کے گریبان پر کس گیا۔ جوالا سنگھ بیچ بچاؤ کرنے کے لیے ان کے قریب پہنچا تو پالی نے نرمی سے اسے پیچھے ہٹا دیا۔ مت سنگھ نے ایک اور تھپڑ پالی کے منہ پر رسید کیا اور پھر دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے اس کی گردن دبانے لگا۔
اس پر پالی نے مت سنگھ کی ٹھوڑی کے نیچے ہتھیلی رکھ کر زور سے پیچھے کی طرف دھکیلا اور پھر جبڑے پر جو گھونسا رسید کیا تو وہ دروازے سے جا ٹکرایا۔ دروازہ کھل گیا اور وہ آدھا باہر بارش میں اور آدھا اندر ڈھیر ہو گیا ——— پنتو اسے اٹھانے

کے لیے بڑھی تو پالی نے کہا۔" چنتو۔ ادھر آؤ پہلے میرے کُرتے پر بٹن ٹانگ دو۔"
چنتو اس کی طرف چلی آئی۔

سب دم بخود بیٹھے تھے۔ مت سنگھ کے مسوڑھوں سے خون بہہ بہہ کر بارش کے گدلے
پانی میں حل ہوتا رہا اور اس وقت جوالا سنگھ اور جیل سنگھ نے ایک دوسرے کی طرف
پُرمعنی نظروں سے دیکھا۔

۸
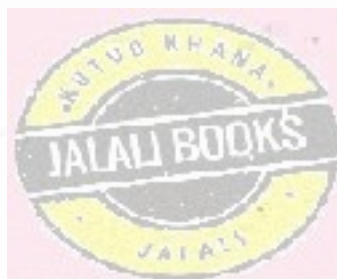
دیوالی قریب آئی تو ان کے گھروں میں جو دیوالی دیکھنے کے لیے امرتسر جانے والے تھے، بڑی چہل پہل دکھائی دینے لگی۔ دو روز پہلے صبح کے وقت سنداں نرنجن سنگھ کے گھر کے صحن میں جا کھڑی ہوئی۔ سرنوں کی ماں اس وقت چوکے میں بیٹھی تھی۔ سنداں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔

"آؤ بہن! دو دن سے شکل تک نہیں دکھائی۔"

"سکل کیا دکھائیں، میں ٹھہری بیکار اور تم . . . ."

جنداں نے آنکھوں پر ہاتھ کا سایہ کر کے سنداں کی طرف دیکھا اور قدرے دکھی لہجے میں کہا۔

"اری کہاں کام دام کیا۔"

"لو اور سنو جب دیکھو کام۔ جب دیکھو کام۔"

جنداں نے مونڈا آگے دھکیلتے ہوئے کہا۔

"کوئی نبٹتا تو نہیں نا۔ تمھیں تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ میں بڑے کام کرتی ہوں لیکن یہاں یہ حال ہے کہ کام بس ادھورے ہی پڑے رہتے ہیں۔ بڑی پریشان رہتی ہوں۔"

"میں کہوں پریشانی کی کیا بات ہے۔ اب چھوڑو دنیا داری کے جھنجھٹ اپنا پیڑھی پر بیٹھ کر واہگورو واہگورو کیا کرو۔"

یہ جنداں کی دکھتی رگ تھی۔ اس نے لوگوں کی زبانی سنا تھا کہ اب چونکہ روپیہ پیسہ زیادہ ہو گیا ہے۔ اس لیے اس کا بوجھ بھی دن بدن بڑھتا جا رہا تھا۔ خواہ سنداں نے یہ بات بھولپن ہی میں کہہ دی ہو لیکن جنداں نے اس کی چبھن دل میں بری طرح محسوس کی۔ تاہم اس نے دلی کیفیت کا اظہار نہیں ہونے دیا۔

" واہگورو واہگورو تو اٹھتے بیٹھتے منہ سے نکلتا ہے۔ سچ پوچھو بہن واہگورو بغیر کوئی سہارا بھی کسی کا۔ ۔ ۔ "

اس پر سنداں نے بڑی پہنچی ہوئی بھگتنی کی طرح ہاتھ کی پانچوں انگلیاں نفی کے طور پر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

" نا بہن نا۔ ۔ ۔ ۔ باہگورو بگیر کوئی سہارا نہیں ——— تیرا بھانا میٹھا لاگے ۔ ۔ ۔ ۔ پالی کا باپو بھی یہی کہا کرتا تھا۔ ۔ ۔ "

پالی کے باپو کے نام کا حوالہ تو سنداں نے اس طرح دیا جیسے وہ کوئی بڑا مہاتما ہو گزرا ہو۔ اس خیال سے جنداں کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی جسے زبردستی دباتے ہوئے اس نے کہنا شروع کیا:

" بہن! تم مزے میں ہو گھر میں بہو کام کرتی ہے۔ ۔ ۔ ۔ سارا سارا دن۔ ۔ ۔ "

جنداں کہنے تو لگی تھی کہ سارا سارا دن بیکار گھومتی ہو۔ لیکن دفعتاً یہ الفاظ اس کے ہونٹوں تک آتے آتے رہ گئے اور وہ بات کا پہلو بدل گئی۔

" ۔ ۔ ۔ سارا سارا دن۔ ۔ ۔ ۔ ۔ باہگورو نام کا جاپ کرتی رہتی ہو۔ ۔ "

سنداں نے جنداں کی بات کا سچ مچ یقین کر لیا۔ بڑی گمبھیرتا سے بولی:

" باس جی۔ ۔ ۔ ۔ اب کیا معلوم ایک سانس آئے دوسرا نہ آئے۔ پالی کے باپو نے بھی (پھانسی پانے کے لیے) جیل جانے سے پہلے مجھے اس بات کی پکی کر دی تھی۔ کہنے لگا۔ بھاگواں! میں تو ہمیشہ یہی مت (نصیحت) دیتا آیا ہوں اور اب بھی کہتا ہوں کہ باہگورو کا سمرن کیا کر۔ ۔ ۔ اور میں نے بھی اس کی بات پلّے سے باندھ لی۔ ۔ ۔ اور نہیں بہن یہ سب کچھ۔ ۔ ۔ یہ مکان یہ کھیت، یہ روپیہ (جو تم نے بٹورا ہے) اور یہ گہنے (جو تم نے بنوائے ہیں) سب کچھ اسی دنیا میں تو چھوڑ جانا ہے۔"

جنداں نے بھگتی رس میں ڈوبی لمبی چوڑی تقریر سن کر سنداں کے مگرمچھ نما چہرے کی طرف دیکھا اور ایک ہلکی سی آہ بھر کر بولی:

"بہن تم دھن (دھنیہ) ہو۔ دھن ہو تم جو روز واہگورو کی طرف دھیان لگاتی ہو۔۔"

اسے اس قدر مطمئن لہجے میں ہدیہ مبارکباد پیش کرتے دیکھ کر سنداں کے دل کو تسکین نہ ہوئی۔ اس کے دل میں بھی بڑی بھاری خواہش پیدا ہوئی کہ اس کی منہ بولی بہن بھی واہگورو کی طرف دھیان دے۔ لیکن کس طرح؟ یہ بات جلدی سے اس کی سمجھ میں نہ آسکی۔

"لو بہن ایک پراٹھا ہی کھالو" جنداں نے رکابی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا

"نا بہن! ابھی کھا کے چلی آرہی ہوں۔۔۔ سنداں نے لعابِ دہن نگلتے ہوئے جواب دیا۔

پھر اس نے کن انکھیوں سے پراٹھے کی طرف دیکھا جو اس وقت مکھن میں گڑ گچ ہو رہا تھا۔ اُدھر جنداں نے پراٹھا الٹنے کے لئے منہ پھیرا۔ ادھر اس نے ہاتھ بڑھا کر رکابی اپنے آگے کھینچ لی۔ وہ کھانے پینے کی شروع ہی سے بہت شوقین تھی۔ ان باتوں میں شرم کرنا وہ محض حماقت سمجھتی تھی۔ پہلے جو دل بھاتا کھاتی لیکن اب بال بچوں والے گھر میں اُسے بڑھیا سمجھ کر زیادہ خاطرداری نہیں کی جاتی تھی۔ اس لیے اتنا مرے دار پراٹھا نظر انداز کر کے وہ ناشکرے پن کا گناہ سر پہ لینے کو تیار نہیں تھی۔ جب جنداں نے گھوم کر اس کی طرف دیکھا تو اس کے قول اور فعل میں یہ تضاد پا کر اسے بھی حیرت نہیں ہوئی۔ وہ یوں بھی سنداں کی عادت سے واقف تھی اور پھر وہ دوسروں کی کمزوریاں نظر انداز کر دیتی تھی۔

سنداں نے اسے اپنی طرف متوجہ پا کر قدرے ناک چڑھائی اور انگلی سے اشارہ کرتی ہوئی پوچھنے لگی:

"یہ کیا ہے؟"

"ڈیلوں کا اچار"

"اچھا۔۔۔ اچھا"

یہ کہہ کر گویا اس نے پراٹھا کھانے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھا۔ دو چار نوالے کھا کر جو زبان نے پراٹھے کی نرمی اور خوشبو کا مزا پایا تو وہ پھر جنداں کی بھلائی کی باتیں سوچنے لگی۔

"میں کہوں —— جنداں! اب تم ایک اور بہو لا دو نا۔ گھر سے دو بہوئیں تو آ ہی چکی ہیں۔"

یہ جنداں کا محبوب مضمون تھا۔ اس کا چہرہ مسرت سے کھل اٹھا:

"ہاں! —— کوئی بہو ڈھونڈ دو نا ہمارے لیے۔"

"لو بھلا تمھیں بہوؤں کا گھاٹا ہے کیا؟"

"گھاٹا تو نہیں پر تم سمجھو نا۔ گھر گھاٹ بھی تو دیکھنا ہوا۔ ساری عمر کا سمبندھ ہوتا ہے۔"

یہ باریک بیتی جنداں کی سمجھ میں بالکل نہ آئی۔ اس نے آنچل سنبھال کر جواب دیا۔

"اری بہن! بواہ ہونا چاہیے۔ سمبندھ تو اپنے آپ ہی ہو جاتا ہے... ساری عمر کا۔"

جو بات سنداں نے بڑی معرکے کی سمجھ کر کہی تھی۔ جنداں کو پسند نہ آئی۔ خیر اس نے اس کے الفاظ کو سُنا اَن سُنا کر کے کہا:

"سنداں بہن! اسی وجہ سے سرتوں کا معاملہ رکا پڑا ہے ——
بڑے بھائیوں کی شادی ہو جائے تو بہن کی بھی ہو —— ہے نا —— یُوں تو بہن کی پہلے ہونے میں بھی کیا حرج ہے۔"

سنداں سرتوں کو اپنا ہی لال سمجھے بیٹھی تھی۔ مناسب موقع جان کر اس نے جنداں کو بھی کنایتہً یہ بات سُنا دی۔

"سرتوں کی بات کیا کرتی ہو۔ اسے کس بات کا گھاٹا ہے۔ وہ تو میری بیٹی ہے۔"

کسی زمانے میں جنداں کا بھی یہی خیال تھا۔ لیکن جب رفتہ رفتہ ان کے پاس روپیہ آنے لگا تو میاں بیوی نے از سرِ نو اس مسئلہ پر غور کرنا شروع کیا۔ پھر انھیں

اس بات کا پتہ چلا کر پالی کلکتے میں خوب روپیہ کما رہا تھا۔ اس نے خود بھی گاؤں میں واپس آتے ہی زمین خریدنے کا ذکر بھی کر دیا تھا۔ لیکن اتنے مہینے گزر گئے زمین خریدنے کی نوبت نہ آئی۔ اب بنداں کے دل میں شکوک پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ بہر صورت اس نے نہ تو ہامی بھری اور نہ جنداں کی بات کی تردید ہی کی۔

جب ایک مرتبہ سرتوں کا ذکر چھڑ ہی گیا تو پھر سنداں سے نہ رہا گیا۔

"میں کہوں سرتی رانی ہے کہاں . . . دکھائی نہیں دی۔"

"پڑی سوتی ہو گی۔"

"کیا ابھی تک سوئی پڑی ہے۔"

"بچاری بہت کام کرتی ہے رات کو۔ سب لوگ سو جاتے ہیں تب جا کر گھر کے کاموں سے فرصت پاتی ہے . . . لو اُترتی آ رہی ہے۔"

سنداں نے سر اُٹھا کر دیکھا۔ تیز دھوپ میں سرتوں کی آنکھیں بھی اچھی طرح نہ کھلی تھیں۔ وہ چندھیائی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی سیڑھیوں پر سے اُتر رہی تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے چندریا کا ایک سرا شانے پر تھا دوسرا پیچھے گھسٹتا چلا آ رہا تھا۔ نیچے کی جانب جھولتا ہوا رنگین ازار بند غالباً کچھ ڈھیلا ہو گیا۔ اس لیے پاؤں کے نیچے شلوار کے پائنچوں میں بار بار پھنستے تھے۔

ماں نے یہ حال دیکھا تو قدرے تلخ لہجے میں کہا:

"بیٹا سو کر اُٹھتی ہے تو ذرا ازار بند کس کر باندھ لیا کر۔ جو کبھی پاؤں پائنچے میں پھنس گیا تو دھڑام سے منہ کے بل گر پڑو گی۔"

اس پر سرتوں نے بھی منہ چھلا کر کہا۔

"بے بے! میں تم سے ہر روز کہتی ہوں مجھے جگا دیا کرو۔ لیکن تم مجھے نہیں جگاتیں۔ جب دھوپ چڑھ آئے تو مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

ماں نے سنداں کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

"ہے نہ لاڈو رانی! بھلا اس سے کوئی پوچھے کہ تو صبح اُٹھ کر کیا کرے گی۔ جب رات کو اتنی دیر تک جاگنا پڑتا ہے تو صبح خود ہی دیر سے اُٹھے گی۔"

سنداں نے سرنوں کو نظروں ہی نظروں میں بہو کی حیثیت سے جانچتے ہوئے کہا۔

"عمر بھی تو ہے سونے کی۔ ہائے اس عمر کی نیند!!"

"عمر تو خیر ہی ۔ ۔ ۔ ۔ پر عادتیں بھی تو بچوں کی سی ہیں، جب دیکھو ہنسے جاتی ہے ۔ ۔ ۔"

اتنے میں سرنوں نیچے اُتر آئی اور ہنستی ہوئی سنداں کے قریب پہنچی۔ سنداں نے اس کے گداز جسم کو بازو میں سمیٹ کر بھینچا اور پھر اس کے رُخساروں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ جنداں سے مخاطب ہوئی۔

"دیکھو بھی ہماری بیٹا کو کچھ مت کہا کرو۔ تمہیں کیا مالم وہ کیوں ہنستی ہے، دانت دیکھو تو کیا دودھ کی طرح سپھید ہیں!"

اس پر سرنوں نے ہونٹ بھینچ بھینچ کر دانت چھپانے کی کوشش کی لیکن وہ بے اختیار نمایاں ہوتے تھے۔ بالآخر بلی کی طرح سمٹ کر اس نے اپنا چہرہ سنداں کے بڑے بڑے پستانوں میں چھپایا۔

سرنوں کی ماں نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا۔

"دیکھو نا جھینپ رہی ہے۔ بھلا کوئی پوچھے کہ یہ شرمانے کا کونسا موقعہ ہے۔ اسی تائی کے ساتھ کوئی ادھر ادھر کی بات کر اتنی بڑی ہو گئی ہے۔ لیکن سمجھ کوڑی بھر نہیں۔۔۔۔۔"

سرنوں نے بڑی کوشش کے بعد سر اٹھایا۔ چہرے پر ابھی تک شرم کی ہلکی سی سُرخی اور آنکھوں میں نمی سی تھی۔ آخر اُس نے بات کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

"تائی اب کے دیوالی پر تو چلو گی نا امرت سر؟"

سنداں کو جیسے کوئی بھولی بسری بات یاد آ گئی ہو۔ فوراً جنداں کی طرف مخاطب ہو کر بولی۔

"ہاں خوب یاد آیا۔۔۔۔۔ کیا کھیال ہے جنداں۔ امبرسر چلو گی یا نہیں؟"

بھلا جنداں اپنی گورو بھگتی کے جذبے کے اظہار کا یہ سنہرا موقعہ ہاتھ سے کیوں جانے دیتی۔

"ہاں بہن چلیں گے کیوں نہیں۔ ہم سبھی چلیں گے ساتھ ساتھ ۔۔۔۔ سرنوں کا باپو گھر

پر رہے گا۔ ہم سب چلیں گے اور تم لوگ بھی ہمارے ساتھ ہی چلنا۔"

"ہاں ہاں ضرور چلیں گے۔ لیکن گھر چھوڑ جائیں گے۔ اب کے وہ بک جھک ضرور کرے گا پارسال بھی تو اُسے نہیں لے گئے تھے۔۔۔۔۔ پر بھئی پالی کو گھر پر کیسے چھوڑوں اس بچارے نے امبرسر کی دیوالی پہلے کبھی دیکھی ہی نہیں۔۔۔۔۔ اسے تو شہر امبرسر بھی طرح جانے نہیں۔۔۔۔۔۔ جب پاس آیا نانا لے گئے سے تو بھی امبرسر بہت تھوڑی دیر رکا۔ بکت کم تھا۔۔۔۔۔ شہر کیسے دیکھتا۔ وہ سہر جانے کو کہتا رہا۔ میں نے نہیں جانے دیا۔ میں نے کہا بس دیبالی پر ہی چلیں گے۔ ایک پنتھ دو کاج۔۔۔۔"

سرنوں نے شریر چمکیلی آنکھوں سے سنداں کی طرف دیکھا۔

"تائی: تم نے پالی کو اسی ڈر کے مارے شہر نہیں بھیجا ہو گا کہ پہلے کی طرح کہیں پھر کالے کیتے از بھاگ جائے۔"

سنداں نے پیار سے اس کے گال پر ہلکی سی چپت مارتے ہوئے کہا۔

"دیکھ لو لاڈو رانی تو اب ہم سے بھی مجاخ کرنے لگی ہے۔"

لیکن جنداں اور ہی نصیحت کرنے لگی۔

"سرتی بیٹا! پالی مت کہو اب بھیّا کہا کرو اُسے۔"

اس کے بعد کچھ دیر امرت سر جانے کے لئے دیگر تفصیلات پر غور ہوتا رہا۔ پھر جنداں اُٹھ کر گھر چلی آئی۔

ایک دو روز تو بڑی زبردست تیاریاں ہونے لگیں۔ سرنوں، تاباں گاؤں کی دیگر لڑکیاں اور نوجوان عورتیں گاؤں سے کچھ پرے پیر جی کی قبر کے قریب صاف پانی کے جوہڑ پر کپڑے دھونے کے لیے گئیں۔ سارا دن اسی جگہ گزار دیا۔ ہنسی مذاق کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ کپڑے بھی صاف ہوتے رہے، اور نہانا دھونا بھی ہوتا رہتا تھا۔ تاباں، رکھی، آشاں، کرتارو وغیرہ تو خاصا تیر لیتی تھیں۔ البتہ سرنوں کو پانی سے ڈر لگتا تھا اگرچہ تھوڑا بہت تیر لیتی تھی لیکن آٹھ دس ہاتھ مارنے کے بعد آپ ہی آپ گھبرا جاتی "میں ڈوبی۔۔۔ میں ڈوبی۔۔۔"

اس پر اس کی کوئی سہیلی اسے چڑا کر کہتی۔

"اری سرنوں! ڈوبنے سے پہلے ہی کیوں چلانے لگتی ہے۔ پہلے ڈوب لیا

کر پھر چلا آیا کر۔ ۔ ۔"

سرنوں کی سمجھ میں یہ بات کبھی نہ آسکی کہ آخر انسان ڈوبنے کے بعد کس طرح چلا سکتا ہے۔

لڑکیوں اور عورتوں نے دوپٹے رنگ لیے تو چھیل چھبیلے نوجوانوں نے اپنی پگڑیاں رنگ ڈالیں۔ رنگ کے ساتھ ساتھ کلف اور ابرق کے ٹکڑوں کے باعث نئی بہار نظر آنے لگی۔

غرض دیوالی سے دو روز پہلے خوب چہل پہل نظر آنے لگی۔ آخر دیوالی کے روز لوگ باگ تیار ہو کر منہ اندھیرے ہی ناشتہ کر کے اسٹیشن کی طرف چل دیئے۔ گاؤں کے قریب تو انھوں نے اسٹیشن بننے ہی نہ دیا تھا۔ اب کوسوں دور اسٹیشن تھا۔ مرد یا تو پیدل چلتے یا گھوڑا، اونٹ، گاڑی وغیرہ استعمال کرتے۔

گاؤں کے چھوٹے سے قافلے میں چھکڑے بھی شامل تھے۔ گھوڑیاں، سانڈنیاں اور ریڑھیاں وغیرہ ہر قسم کی سواریاں موجود تھیں۔ بعض من چلے پیدل ہی پکے چلے جا رہے تھے۔

جنداں اور سنداں کے خاندان کے افراد تو پہلے ہی سے ایک ساتھ جانے کا پروگرام بنا چکے تھے۔ انھوں نے دو چھکڑوں کا انتظام کیا تھا۔ گھر کی گھوڑیاں تھیں۔ سرنوں کا ایک بھائی گھوڑی پر سوار تھا۔ دوسرا چھکڑے پر بیٹھا تھا اور تیسرا ریڑھی پر، چھکڑوں کے بیل ہانکنے اور پھر اسٹیشن سے چھکڑے واپس گاؤں کو لے جانے کے لیے لہنا سنگھ اور نرنجن سنگھ کا ایک نوکر مقرر ہوئے تھے۔ چھکڑوں کی سواریوں کی تقسیم یوں کی گئی تھی کہ ایک چھکڑے پر تو بزرگ یعنی جنداں، سنداں نرنجن سنگھ کا ایک بھائی، جنداں کی بڑی بھاوج وغیرہ سوار تھیں اور دوسرے چھکڑے پر سرنوں، تاباں، سرنوں کا بھائی کرت سنگھ، پالا سنگھ، جنداں کی چھوٹی بھاوج اور اس کی بارہ سالہ بہن اور چند بچے وغیرہ بیٹھے تھے۔ در حقیقت یہ تقسیم تاباں نے پالی کی سازش پر کی تھی۔

صبح کا وقت تھا۔ دھوپ ابھی تیز نہیں ہوئی تھی۔ موسم بھی خوشگوار تھا۔ سردی

کی آمد آمد تھی۔ سب کے دلوں میں دیوالی دیکھنے کا چاؤ۔ سال بھر میں دو یا تین مرتبہ ہی تو گھر سے باہر نکلنا نصیب ہوتا تھا۔ اس لیے سبھی کے دلوں میں اُمنگوں کے دریا اُمڈے آتے تھے۔

دونوں چھکڑے آگے پیچھے دوڑے چلے جا رہے تھے۔ لیکن دونوں کی فضا میں زمین اور آسمان کا فرق تھا۔ بزرگوں کے چھکڑے کی فضا سنجیدہ تھی۔ گو اپنے لڑکوں بالوں کو خوش دیکھ کر دل میں وہ بھی بہت خوش تھے۔ لیکن بظاہر اپنی ہی باتوں میں مگن تھے۔ نوجوانوں کے چھکڑے میں تو بات بے بات پر قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ پالی دل ہی دل میں اپنی بھابی کا بہت شکر گزار تھا اُسے یہ اُمید نہیں تھی کہ کبھی ایسا موقعہ بھی آئے گا۔ جب وہ سرنوں کے ساتھ ایک ہی چھکڑے میں سوار ہوگا اور دھچکے لگنے پر ان کے گھٹنے ایک دوسرے سے بھڑ جایا کریں گے

راستہ کچّا اور ناہموار تھا۔ دب گھاس پر شبنم کے قطرے ابھی تک چمک رہے تھے۔ بھڑبیریاں اور مدار کے پیڑ پہلے چھکڑوں کے قریب پہنچ کر دفعتاً پرے کو بھاگتے ہوئے معلوم ہوتے ببول کی کانٹے دار شاخوں پر بھولی بھالی فاختائیں سراسیمگی سے اس قافلے کی اُڑائی ہوئی گرد کو تک رہی تھیں۔ لیکن اس وقت پالی کا دھیان ان چیزوں کی طرف نہیں تھا۔ وہ اس وقت سرنوں کی طرف متوجہ تھا۔ تاباں نے اُسے خبردار کر دیا تھا کہ وہ سرنوں کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نہ دیکھے تاکہ کسی اور کو کچھ اور شبہ نہ ہو جائے۔ لیکن پالی نے باتوں باتوں میں ایسا سماں باندھ دیا تھا کہ کسی کو اور کوئی ہوش ہی نہ رہی تھی۔

سرنوں بہت خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے پرانے فیشن کے کپڑے کا لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ لیکن اس کے حسن پر سب کچھ کھُل رہا تھا۔ خصوصاً اس کی اودے رنگ کی اوڑھنی تو غضب ڈھا رہی تھی۔ اس سے اس کا چہرہ اور دمک اٹھا تھا۔ اوڑھنی پر لگے ہوئے ابرق کے چند باریک ٹکڑے اس کی پیشانی اور کمان سی ابروؤں میں آن پھنسے تھے۔ جس سے اس کے حسن کو اور بھی چار چاند لگ گئے تھے۔

دوسروں کے دلوں کو موہ لینے والی باتیں کرنے میں تو یوں بھی پالی کو مہارت حاصل تھی۔ لیکن آج کے روز تو وہ بہت خوش تھا۔ اس شام کے بعد جب کہ پالی نے سرنوں کو چھیڑا تھا۔ اسے اس سے کھل کر باتیں کرنے کا موقعہ نہ مل سکا تھا۔ اسے اس بات کا یقین تو آ گیا تھا کہ سرنوں اس سے خفا نہیں ہوئی۔ تاہم چند روز تک تو وہ خود ہی اس کے روبرو جانے سے کترا تا رہا اور پھر جب کبھی سامنا ہوا بھی تو کھل مل کر باتیں کرنے کا موقعہ نہ ملا لیکن اب وہ چند گھنٹوں کے لیے بالکل آزاد تھے بلکہ اسے یقین تھا کہ بھابی کی برکت سے امرت سر میں بھی کھل کر بات چیت کرنے کے موقعے میسر آتے رہیں گے۔ اس لیے اس نے سفر کے آغاز ہی میں سرنوں کا دل مٹھی میں لینے کی مہم جاری کر دی۔

باتوں باتوں میں سادھوؤں، سنتوں اور بھگتوں کے قصے شروع ہو گئے۔

پالی نے کہا۔

"یہ ٹھیک ہے کہ آج (بعض) سنت تو ڈاکیے پرمیشر تک پہنچے ہوتے ہیں۔ لیکن اب تو کل جگ کا جمانہ ہے۔ اب کئی سنت ایسے ہیں کہ مہاتما بن کر دوسروں کو لوٹ لیتے ہیں بس رام رام جپنا اور پرایا مال اپنا۔"

تاباں اس بات پر بڑے زور سے ہنس پڑی۔ عموماً ہنسنے میں وہی پہل کرتی تھی اور باقی لوگ بھی اسی کی پیروی کرتے۔

پالی کی اس بات پر سرنوں کے بھائی نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ پالی کی بابت اس کی رائے ہر آن بہتر ہوتی جا رہی تھی۔ پالی نے داڑھی میں انگلیاں پھیر کر معلوم کیا کہ کہیں اس میں کوئی تنکا ونکا نہ پھنسا ہوا ہو اور پھر ہنس کر بولا۔

"ایک دفعے کی بات ہے کہ چوروں کے ایک ٹولے نے ایک امیر آدمی کا گھر تاڑا۔"

اس پہ بارہ سالہ لڑکی بولی:

"کیا دمودر سیٹھ کا گھر تاڑا تھا؟"

"دُر" تاباں نے نرمی سے ڈانٹا "بھلا یہاں دمودر سیٹھ کا کیا مطلب..."

دمودراں کے گاؤں کے سیٹھ تھے۔

"بس کوئی سیٹھ سمجھ لو........" پالی نے کہنا شروع کیا: "اچھا تو سیٹھ صاحب سادھوؤں اور سنتوں کی بڑی عزت کرتے تھے۔ جب ان چوروں کو معلوم ہوا تو انہوں نے یہ ترکیب سوچی کہ سنتوں کا بھیس بنا کر سیٹھ کے گھر پہنچ جائیں۔ وہاں گیان دھیان کا پاکھنڈ رچایا جائے اور پھر موقع پاتے ہی ان کا سب کچھ لے کر چلتے بنیں۔"

سرتوں سمیت سب لوگ بڑے انہماک سے اس کا قصہ سن رہے تھے۔

"بس جی! انہوں نے جھٹ سنتوں کا بھیس بدلا اور باگورو باگورو کرتے اور مالا کے منکے کھٹکاتے سیٹھ جی کے وہاں پہنچے۔ ادھر سیٹھ جی سمجھے کہ آج ان کے نصیب کھل گئے ہیں جو اتنے بڑے مہاتما ان کے ہاں آگئے ہیں۔"

اس بات پر سرتوں کے منہ سے چھرررر کی آواز کے ساتھ ہنسی نکل گئی۔

پالی کے ذہن میں بچپن کی یاد تازہ ہوگئی۔ جب اسی طرح سرتوں کے منہ سے بے اختیار ہنسی نکل جایا کرتی تھی۔

ایک طرف پالی کی کلف لگی رنگین پگڑی کے شملے ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اور دوسری جانب اس کے بڑے بڑے ہاتھ اوپر نیچے ہل رہے تھے۔ اب مزے لے لے کر اس نے بتایا کہ کیسے ڈاکوؤں نے سیٹھ کو لوٹا۔ لیکن پھر پکڑے گئے۔

سب لوگ اس کہانی سے بے حد محظوظ ہوئے۔

چھوٹی لڑکی نے پوچھا۔

"اچھا تو پھر وہ صندوق دھکیل کر لے گئے ہوں گے۔"

"ہاں اور کیا۔"

اس طرح باتیں کرتے اور ہنستے کھیلتے وقت گزرتا گیا اور سفر طے ہوتا گیا۔ راستے میں ہر بستی سے چند لوگ ان کے ہمراہ چل دیتے تھے۔ چنانچہ اسٹیشن تک پہنچتے پہنچتے یہ قافلہ کافی بڑا ہو گیا۔

آخر وہ اسٹیشن پر پہنچ ہی گئے۔ لمبے سفر اور ناہموار راستے کی وجہ سے ہچکولے کھا کھا کر عورتوں کے جوڑ جوڑ میں درد ہونے لگا تھا۔ البتہ نوجوان خوش و خرم دکھائی دیتے تھے۔

چھوٹا سا اسٹیشن تھا۔ یہاں پلیٹ فارم بھی نہیں تھا۔ چنانچہ لوگ جنگلے کے قریب بجری پر اپنی ٹولیاں بنا کر بیٹھ گئے۔ بابو کی زبانی معلوم ہوا کہ ابھی گاڑی آنے میں دیر ہے۔ ادھر لڑکے لڑکیوں کو بھی بھوک لگ آئی تھی۔ قریب ہی ڈھلان پر دستی نل لگا ہوا تھا۔ سرنوں منہ دھونے کے لیے اُدھر گئی۔ تو پالی بھی کمنڈل اُٹھا کر پانی بھرنے کے بہانے ساتھ چل دیا۔ تاباں کو پالی کی یہ حرکت پسند نہیں آئی لیکن اس افراتفری میں کسی نے اس طرف دھیان ہی نہیں دیا۔

سرنوں اپنے خیال میں مگن نل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ پالی اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ نل پر کافی بھیڑ تھی۔ بیچاری سرنوں کچھ دیر تک چُپ چاپ کھڑی رہی۔ جونہی ہاتھ بڑھاتی کوئی اور آدمی نل کی ہتھی پکڑ لیتا۔ آخر پالی نے پیچھے سے کہا۔

"لاؤ سرنوں میں ہتھی چلاتا ہوں۔ تم منہ ہاتھ دھو ڈالو۔"

سرنوں نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ وہ ایک لمحہ کے لیے جھجکی۔ پھر جب پالی نے سب لوگوں کو پیچھے ہٹا کر نل کا دستہ ہلانا شروع کیا۔ تو اُس نے بھی پانی کے دھارے کی طرف ہاتھ بڑھا دیئے۔ منہ ہاتھ دھو کر اس نے پانی پینے کا ارادہ کیا۔ پالی نے بہت آہستہ آہستہ دستی ہلائی تاکہ پانی کی دھار پتلی ہو جائے۔

پانی سے تر سرنوں کا چہرہ جیسے شبنم میں ڈوبا ہوا گلاب۔ پالا سنگھ کو بہت بھلا دکھائی دیا۔ کاش وہ کبھی اسے سمیٹ کر اپنے بازوؤں میں لے سکے اور اس کے رُخساروں، ہونٹوں، آنکھوں، ٹھوڑی پر پے در پے بوسے دے سکے۔

جب کبھی پالی اس طرح نظریں گاڑ کر سرنوں کی طرف دیکھنے لگتا تھا۔ وہ بے چین ہو جاتی تھی۔ لیکن اس وقت اس کا دھیان پالی کی طرف نہیں تھا۔ پانی پی کر اُس نے پالی کی طرف شکر گزار نظروں سے دیکھا۔ وہ ہنس پڑا اور اس نے پانی کا کمنڈل اُس کے ہاتھ میں دے کر چلتا کیا۔ تاکہ وہ لوگ انہیں ساتھ ساتھ آتے نہ دیکھ پائیں اور پھر اپنی ٹانگوں اور گھٹنوں کی گرد دھونے لگا۔

ابھی انہوں نے پورے طور پر کھانا بھی نہیں کھایا تھا کہ ایک دم سگنل ڈاؤن ہو گیا۔

"سگنل ڈاؤن ہو گیا" کی صدائیں سنائی دینے لگیں۔

وہ سب جھٹ پٹ اپنی اپنی گٹھڑیاں پوٹلیاں باندھ کر تیار ہو گئے۔ بڑا سامان تو کسی کے پاس بھی نہیں تھا۔ یہی چھوٹی موٹی گٹھڑیاں ضرور موجود تھیں۔

بالآخر جب گاڑی نمودار ہوئی تو لوگوں نے دیکھا کہ ریل کے ڈبوں کے دروازوں کے باہر اور چھتوں پر بلکہ انجن کے آگے اور پہلوؤں پر بھی آدمی ہی آدمی دکھائی دیتے تھے۔ وہ سب امرت سر جانے والی سواریاں تھیں۔

جب گاڑی قریب پہنچی تو "جو بولے سو نہال ست سری اکال" کے نعروں سے فضا گونج رہی تھی۔

نئے چڑھنے والے حیران تھے۔ وہ گاڑی کے اندر کیوں کر داخل ہوں۔ جنداں نے زنانہ ڈبہ تاڑ لیا۔ لیکن اس کے دروازے پر بھی مرد ایسے چپکے ہوئے تھے جیسے چھتے پر بھڑ۔ سنداں نے بھاری آواز میں ان مردوں کو کہا کہ عورتوں کے لیے راستہ تو چھوڑ دو۔ اس نے دو تین کی ٹانگیں بھی کھینچ لیں۔ لیکن وہاں کون سنتا تھا۔ اس ہڑبونگ میں پالی کو بھی ساتھ والوں کا کچھ پتہ نہ چلا۔ وہ اونٹ کی طرح گردن اٹھائے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ وہ پریشان تھا۔ کیونکہ گاڑی وہاں چھ منٹ کے لیے ٹھہرتی تھی۔ دفعتاً اس نے دیکھا کہ اس کی ماں زنانہ ڈبے کی کھڑکی ہی میں سے دھنس رہی ہے اس کا اگلا دھڑ اندر چلا گیا تھا۔ ٹانگیں باہر لٹک رہی تھیں۔ وہ بھاگ کر گیا اور اسے اندر دھکیل دیا۔ سنداں نے اندر پہنچتے ہی گھوم کر جنداں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"آجاؤ بہن! ادھر ہی سے آجاؤ گاڑی چلنے والی ہے۔"

جنداں نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہائے بچے بھی تو ہیں۔"

"تم تو آؤ۔"

جنداں نے ہاتھ بڑھا دیا۔ نیچے سے پالی نے سہارا دیا اور وہ گاڑی کے اندر پہنچ گئی۔ ڈبے کے اندر بیٹھی ہوئی عورتیں ان کے اس بے ہودہ پن پر بگڑ اٹھیں۔ سنداں نے سر دست ان سے جھگڑے کے لیے جنداں کو آگے کر دیا اور خود باقی عورتوں کو اُدھر

کھینچنے لگی۔ پالی اور سرونؔ کے بھائی نیچے سے سہارا دے دے کر انہیں اوپر اٹھاتے رہے۔ خوش قسمتی سے سرونؔ، پالی کے حصے میں آئی۔ سلکی سلوار میں ملبوس اس کی گداز رانوں کے لمس سے پالی کے ہاتھوں میں ناقابلِ بیان لرزش پیدا ہو گئی۔ اتنے میں گاڑی چل دی۔ خیر سب کی سب عورتیں بخیر و عافیت ڈبے کے اندر پہنچ گئی تھیں۔ سرونؔ کے دونوں بھائی بھی گاڑی کے ساتھ لٹک گئے۔ پالی نے جلدی سے اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی۔ اس کی پگڑی اتر گئی تھی جسے اس نے بغل میں داب رکھا تھا۔ ہر ڈبے کے آگے آدمی لٹکے ہوئے تھے۔ گاڑی کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی۔ ایک مرتبہ تو پالی کو خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں وہ گاڑی سے نہ رہ جائے۔ لیکن دفعتاً اسے گارڈ کے ڈبے کے آگے خالی جگہ دکھائی دی اور وہ اُچک کر اس پر سوار ہو گیا۔

اس روز کا سفر تکلیف دہ ضرور تھا۔ لیکن چونکہ ان لوگوں کو گھر سے نکلنے کا اتفاق بہت کم ہوتا تھا۔ اس لئے اتنی رونق اور بھانت بھانت کی بولیوں میں انہوں نے جسمانی تکلیف کا احساس کیا ہی نہیں۔

گاڑی کا یہ حال تھا کہ باوجود اندر، باہر، چھت اور انجن پر سواریاں ہی سواریاں نظر آتی تھیں لیکن سوار ہونے والوں میں سے کم از کم ستر فی صدی ایسے لوگ تھے جنہوں نے ٹکٹ نہیں خریدے تھے۔ اُجڈ اور جوشیلے لوگوں کے دلوں میں کسی اُصول اور قانون کا پاس نہ تھا۔ اردگرد کے گاؤں کے لوگ جو اسٹیشن پر پہنچ سکے تھے۔ وہ راستے ہی میں پٹڑی کے قریب کھڑے ہو گئے تھے۔ انہیں دیکھ کر فوراً زنجیر کھینچ کر گاڑی کھڑی کر لی جاتی تاکہ وہ بھی سوار ہو جائیں۔ گارڈ یہ معاملہ دیکھ کر الگ سر پیٹے ڈالتا تھا۔ لیکن ہجوم کے سامنے کیا چل سکتی تھی۔

اس طرح لوگ شور کرتے اور اودھم مچاتے منزلِ مقصود تک جا پہنچے۔ پھاٹک پر بابو ٹکٹ وصول کرنے کے لیے کھڑا تھا۔ بھلا یہاں کسی کی جیب میں ٹکٹ ہو بھی۔ بابو راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ دو چار منچلوں نے ہلکے پھلکے بابو کو اٹھا کر کندھوں پر بٹھایا اور نعرے لگاتے ہوئے آگے کو چل دیئے۔

ایک لمبے تڑنگے آدمی نے چار فٹ لمبی کرپان ہوا میں لہراتے ہوئے ہانک لگائی۔

"بے ٹکٹ بابو کی۔"

سب نے چلا کر کہا۔

"تب جے۔"

جب لوگوں نے دیکھا کہ ٹکٹ بابو پھاٹک پر نہیں تو وہ گرتے پڑتے اسٹیشن سے باہر اس طرح آئے جیسے نہر کا بند ٹوٹ جانے پر پانی بہہ نکلتا ہے۔ ہر طرف انسانی سروں کا ہجوم تھا۔ پگڑیاں، شملے، داڑھیاں، کرپانیں اور آوازے۔

"اوئے کاہن سنگھا!"

"ایدھر اوئے ایدھر۔"

"وسے شنگار سے دسے بابو۔"

بچے پاؤں تلے کچلے گئے۔ ساتھی ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ کسی کی گٹھڑی گم تو کسی کی پگڑی غائب۔ کسی نے گھونسہ مارا تو کسی نے میان سے کرپان کھینچ لی۔ اس قدر سخت بھیڑ اور ہڑبونگ میں اگر کوئی بدقسمت عورت کا رشتے داروں سے ساتھ چھوٹ گیا تو لفنگے جو ایسے موقعوں پر آتے ہی اسی غرض سے ہیں انہیں کھدیڑتے ہوئے اور پرے لے جاتے۔

پالی نے اس موقعہ پر نئی ترکیب سوچی۔ جتنے مرد ساتھ تھے انہوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ کر عورتوں کو اپنے حلقے کے اندر لے لیا۔ اس حالت میں بھی مارے دھکوں کے سب کا برا حال ہو گیا۔ لیکن کم از کم اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ ان میں سے کوئی گم نہیں ہوا۔ بھیڑ میں سے نکل کر پالی نے دوبارہ چھوٹے بڑے افراد کو ایک ایک کر کے گنا اور ہنس کر بولا۔

"اب اسی جگہ گن لو۔ اگر گم ہوا ہو تو بتاؤ اب تو ڈھونڈ بھی لیں گے یہ نہ ہو کہ بعد میں یاد آئے۔ اُس بکت تلاش بہت مشکل ہو گی۔"

پالی نے سب کو گن کر اپنے دل کا اطمینان کر لیا تھا۔ لیکن محض انہیں چھیڑنے کی غرض سے یہ شوشہ چھوڑ دیا۔ بیچاری عورتیں گھبرائی ہوئی تھیں۔ وہ بار بار سب کو گن رہی تھیں۔ ان کے ہوش بھی کچھ ایسے گم ہو رہے تھے کہ ٹھیک طور پر گنا ہی نہ جاتا تھا۔

سب لوگ تھکے ہارے سری دربار صاحب کے قریب بنی ہوئی گورو رام داس کی سرائے میں پہنچے۔ معلوم ہوا کہ کوئی کمرہ بھی خالی نہیں۔ بلکہ بڑے ہال میں الماری تک نہ مل سکی۔ سب لوگ برآمدے کے ایک کنارے پر ہی ڈھیر ہو گئے۔ جسم چور چور ہو رہے تھے۔ عورتوں کے سر پر نہ ٹھکانے سے دوپٹہ دھرا تھا۔ پسینے کا یہ حال تھا کہ انہیں سواروں کے پائنچے اوپر گھٹنوں تک کھینچ کر پنڈلیوں کی نمائش کرنی پڑی۔

پالا سنگھ نہ ملنے پر بہت جھلا رہا تھا۔ اس کے ہوتے ہوئے سب کو اس قدر تکلیف ہو۔ یہ وہ برداشت نہ کر سکتا تھا اور کسی میں تو اتنی ہمت بھی نہ رہی تھی کہ اُٹھ کر گھوم پھر سکے۔ البتہ پالی ایک مرتبہ پھر منیجر کی کھڑکی کے پاس پہنچ کر اُس سے جھگڑنے لگا:

"مینی جر صاحب۔"

منیجر پہلے ہی بہت پریشان تھا۔ اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"اجی مینی جر صاب! ہماری بھی سُنئے۔"

منیجر نے عینک سنبھالتے ہوئے کہا:

"ہاں جی آپ بھی سنایئے۔ کیا سُنانا چاہتے ہیں۔"

پالی کو منیجر کا اندازِ گفت گو قطعاً پسند نہ آیا۔ اُس نے غصہ پی کر کہا۔

"ہمارے ساتھ بہت سی عورتیں ہیں۔ ہمیں ضرور کمرا ملنا چاہیئے۔"

منیجر چیخ اُٹھا۔

"بھائی جی! عورتیں تو سبھی کے ساتھ ہیں...."

منیجر خاصا اُجڈ آدمی معلوم ہوتا تھا۔ درحقیقت وہ اس قابل نہیں تھا کہ عوام کی ایسی اہم خدمت انجام دے سکے۔

پالی دل ہی دل میں اُبالے کھا رہا تھا۔ وہ مُنہ سے کچھ نہ بولا۔ لیکن قہر آلود نگاہوں سے منیجر کی طرف اس انداز سے دیکھ رہا تھا جیسے اسے کھا ہی جائے گا۔ منیجر بیچارے کا بھی کچھ قصور نہیں تھا۔ لیکن اس کے دل میں تحمل تو ضرور ہونا چاہیئے تھا۔ اُس نے چُپ رہنے کی بجائے گرم ہو کر کہا:

"اب کھڑکی کے آگے سے تو ہٹ جاؤ۔ میں کیا کروں جو تمہاری عورتیں ساتھ ہیں...... اور یہ گھور گھور کر دیکھتے ہو۔ یہ رعب کہیں اور جھاڑنا۔"

پالی نے کھڑکی کی سلاخیں مضبوطی سے پکڑ لیں۔

"جرا باہر آؤ نا۔"

"باہر کیا کرو گے میرا۔"

"جرا آؤ نا۔ بتاؤں تمہیں۔"

ابھی یہ تو تو میں میں جاری تھی کہ اتنے میں سرتوں کا بھائی بھاگا بھاگا آیا۔

"پالی! پالی!! آؤ بھئی کمرہ مل گیا ہے۔"

پالی حیران تھا کہ منیجر سے تو اس کا اسی بات پر جھگڑا ہو رہا تھا۔ انہیں کمرہ کہاں سے مل گیا ہے۔

سرتوں کا بھائی یہ بات کہہ کر فوراً واپس چل دیا۔ لمحہ بھر تو پالی جہاں کا تہاں کھڑا رہا۔ پھر اس نے لپک کر اسے جا لیا۔

"کمرہ کیسے مل گیا۔"

"ہمارے واقف (واقف) ہیں ایک۔ بس انہوں نے ہی بندوبست کر دیا ہے۔"

"مینی جر کہتا ہے کوئی کمرہ کھالی نہیں۔ تم کہتے ہو کمرہ مل گیا ہے۔"

"ارے بھائی ہم انہی کے ہاں ٹھہریں گے۔"

"کن کے ہاں۔"

"اب تم کیا جانو...... تم انہیں جانتے نہیں۔ ایک ہے پرتھی پال سنگھ......"

"وہ سیٹھین پرتھی پال سنگھ۔"

"ہاں...... ان کے گھر کے لوگ بھی اسی جگہ ٹھہرے ہوئے ہیں...... آج کل وہ چھٹی پر آیا ہوا ہے نا۔ اس کی ماں ابھی ہمیں جانتی ہے۔ اسے جب معلوم ہوا کہ ہمیں کوئی کمرہ نہیں مل رہا تو سب کو اپنے کمرے میں لے گئی اب تو مجا رہے گا......"

لیکن پاکی کے لیے اس میں لطف کی کوئی بات نہیں تھی۔ اُسے پرتھی پال سنگھ کے نام ہی سے چڑ ہو گئی تھی۔ لیکن اس میں گھر والوں کا کیا قصور تھا۔ اگر وہ ان کے لیے کمرے کا انتظام کر دیتا تو وہ کاہے کو ان کے ہاں جاتے۔ خیر اب جو ہونا تھا سو ہو چکا پاکی سر جھکائے ان کے کمرے کے قریب جا پہنچا۔

کمرے کے دروازے پر ہی اسے ایک خوش پوش نوجوان دکھائی دیا۔ اُس نے قرینے سے پہچان لیا کہ وہی پرتھی پال سنگھ ہے...... کافی عرصے سے وہ اس کا نام سُنتا آیا تھا۔ اب موقعہ جو ملا تو اس نے سر سے پاؤں تک اسے متجسّس نظروں سے دیکھا۔

پرتھی پال سنگھ کا قد اسی کی طرح خوب لمبا تھا۔ جلد کا رنگ اس کی نسبت بہت صاف تھا۔ داڑھی کے بال ہلکے بھورے رنگ کے تھے۔ غالباً اسی وجہ سے اس کا رنگ خاصا گورا دکھائی دیتا تھا۔ اس کے حُسن کی جو تعریف اُس نے سُنی تھی۔ وہ یقیناً غلط نہیں تھی۔ خد و خال واقعی بہت موزوں تھے۔ آنکھیں بڑی بڑی، ہونٹ ترشے ہوئے، داڑھی بیٹھی ہوئی، سر کے بال بہت صاف اور ملائم دکھائی دیتے تھے۔ اس وقت وہ ننگے سر کھڑا تھا۔ بندھی بندھائی پگڑی اس کے ہاتھ میں تھی۔ شاید ابھی ابھی باہر سے آیا تھا۔ سکھ فوجیوں کی طرح وہ دوہری پگڑی باندھا کرتا تھا۔ بندھی ہوئی پگڑی سے ہی یہ بات ظاہر تھی کہ اس کا انداز دیہاتیوں سے بالکل علیحدہ تھا۔ اس کے گریبان کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ ٹوِیل کی سفید قمیض اور خاکی پتلون اسے بہت سجتی تھی۔

جب پرتھی پال سنگھ کا پاکی سے تعارف کرایا گیا تو اس نے سر کو قدرے جنبش دی اور بڑے اخلاق سے ہنس کر مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ پاکی نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ لمحہ بھر کو ان کی نظریں ملیں۔ پاکی کو اس کی زبردست شخصیت کا احساس تو ہوا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اُس نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس کے حریف کے ہاتھوں کی ہڈیاں زیادہ مضبوط نہیں اور جلد بھی نہایت ملائم ہے۔

کمرے کے اندر بہت سے لوگ ایسے بھی بیٹھے تھے۔ جنہیں دیکھنے کا پاکی کو پہلے کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد عورتوں کی کائیں کائیں پھر شروع ہو گئی۔ چھوٹا سا

کمرہ تھا۔ روشن دان تھا نہیں۔ صرف ایک کھڑکی تھی۔ اس لیے روشنی بہت کم تھی۔ دُھندلی روشنی میں بیٹھی ہوئی عورتیں دُنیا کی ہر شے سے بے خبر باتوں میں مشغول تھیں۔ پالی کونے میں بچھی ہوئی ایک ٹوٹی سی کُرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں سرنوں کو تلاش کر رہی تھیں۔

اس وقت وہ کمرے کے تاریک ترین کونے میں بیٹھی تھی۔ اسے کچھ اندازہ نہ لگ سکا کہ اس وقت اس کے چہرے کی کیفیت کیا ہے یا وہ کس طرف دیکھ رہی ہے پرتھی پال سنگھ ابھی تک دروازے میں کھڑا تھا۔ ننگے سر پر اس کے مہین اور ملائم بالوں کا بڑا سا جوڑا ایک طرف کو ڈھلک گیا تھا۔ واقعی وہ نہ صرف حسین تھا بلکہ اس کی صورت سے بھی افسرانہ شان ٹپکتی تھی۔ پالی مرعوب نہ ہوا تھا۔ فوجی وردیوں کا اس کے دل پر کوئی رُعب طاری نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے دیکھتے دیکھتے پرتھی پال نے دروازے سے گزرنے والے چند مردوں اور عورتوں سے بات چیت کی۔ اس کا ایک خاص انداز سے سر ایک طرف کو جھکانا، اس کا بڑے بھولپن سے آنکھیں جھپکانا، مدھم آواز میں میٹھی میٹھی باتیں کرنا، گاہے بگاہے ملائم سی ہنسی ہنسنا، دیکھنے والے کو یہ سب کچھ بہت بھلا معلوم ہوتا تھا۔ لیکن پالا سنگھ گردن اکڑائے قدرے رعونت سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اسے اس کی ہر حرکت میں بناوٹ اور مسکراہٹ میں زہر گھلا دکھائی دیتا تھا۔ نہ معلوم اس کا اندازہ درست تھا یا محض اپنا خیالی حریف بنا لینے کے باعث وہ اس سے بدظن ہو گیا تھا۔

پرتھی پال سنگھ دروازے سے ہٹ کر کمرے کے اندر چلا گیا۔ جنداں نے اسے قریب کی چارپائی پر بیٹھے ہوئے دیکھ کر کہا:

”بیٹا پرتھی پال! تم کب آئے؟“

”جی بس تین چار دن ہی ہوئے ہیں۔“

”ابھی رہو گے نا یہاں پر؟“

”جی ہاں دو چار دن رہوں گا، پھر واپس چلا جاؤں گا۔ دس دن کی چھٹی پر آیا تھا سوچا چلو سری امرتسر کی دیوالی ہی دیکھتے چلیں ...... یہاں آ کر معلوم ہوا کہ اصلی دیوالی کل رات منائی جائے گی۔ اب پچھتا رہا ہوں کہ مفت میں

ایک روز پہلے چلا آیا۔ پر بے بے نے گھر پر مجھے کچھ بتایا ہی نہیں۔"

"کیا حرج ہے بیٹا! کل کا دن گھوم پھر کر دربار صاحب کے درشن کرنا۔ روز روز کون آتا ہے۔ اچھا ہے اسی طرح کبھی کبھار کسی نہ کسی بہانے سے رونق میلہ ہو جاتا ہے۔"

"جی" یہ کہہ کر پرتھی پال سنگھ نے سر جھکا لیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ جنداں اس سے بات چیت جاری رکھنا چاہتی تھی اور کچھ نہیں سوجھا تو کہنے لگی۔

"تمہیں اتنے دن ہو گئے آئے ہوئے کو۔ بھلا ہم سے کیوں نہ ملے۔ بہن تم ہی نے بھیج دیا ہوتا بیٹے کو۔"

"شرماتا ہے۔ میں تو ہمیشہ کہتی رہتی ہوں کہ کم از کم پیار محبت والی جگہ تو آیا جایا کر۔"

پرتھی کی ماں نے جواب دیا۔

پالی کو ان سب باتوں سے سخت کوفت ہو رہی تھی۔ باقی لوگ تو اُن سے ملاقات ہو جانے پر خوش تھے کہ سر چھپانے کو کمرہ تو مل گیا۔ لیکن پالی سخت مایوس ہو رہا تھا بلکہ اس کی دانست میں تو رنگ میں بھنگ پڑ چکی تھی۔

شام ہو گئی۔ پھر رفتہ رفتہ تاریکی بڑھنے لگی۔ سب نے گورو کے لنگر کی روٹیاں کھائیں۔ پھر کمرے میں آکر بات چیت ہونے لگی۔ معاً جنداں نے سر اُٹھا کر کہا:

"بھلا کوئی ان سے پوچھے کہ تم بڑے بوڑھوں کی طرح کمرے کے اندر بیکار کیوں بیٹھے ہو۔ جاؤ دربار صاحب میں متھا ٹیک آؤ۔ اکال تخت میں شستر (ہتھیار) دکھائے جائیں گے۔ جاؤ انہیں دیکھو...... بھئی ہمارا کیا ہے۔ ہم تو ٹھہرے بوڑھے تھک گئے ہیں۔ اب کل ہی درشن بھی کریں گے۔ اور ماتھا بھی ٹیک آئیں گے ہاں اور کیا کریں۔"

چنانچہ تاباں، سرتوں، جنداں کی بھاوجیں، پرتھی پال سنگھ اور اُس کی بھابی، اور پالی جانے پر آمادہ ہو گئے۔ راستے میں پرتھی پال سنگھ، سرتوں کے بھائیوں اور پالی

سے اپنے مخصوص انداز میں باتیں کرتا رہا۔ لیکن یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں تھی کہ دراصل وہ ان سے بہت ہی مختلف تھا۔ اس لیے اس کی گفتگو تکلف کی حدود سے آگے نہ بڑھ سکی۔

موقعہ پا کر پالی نے اپنی بھابی کے کان میں چپکے سے کہہ بھی دیا۔

"بھابی یہ کم بخت نہ معلوم کہاں سے ٹپک پڑا۔ دیکھو تو بنا بنایا کھیل بگڑ گیا...."

"صبر تو کرو۔ یونہی آپے سے باہر ہوئے جاتے ہو۔"

پالی کی توقع کے خلاف تاباں نے بھی خشک سا جواب دیا۔ اس پر وہ کچھ مغموم ہو گیا۔

وہ لوگ سرائے سے ہی ننگے پاؤں چل رہے تھے۔ لوگ مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے کسی مقرر کی تقریر یا راگیوں کے جتھے کا کیرتن سُن رہے تھے۔ اور وہ سرسری نظروں سے اُن کی طرف دیکھتے ہوئے آگے بڑھتے گئے۔ یہاں تک کہ وہ متبرک تالاب کے کنارے پر پہنچ گئے۔

تالاب کے بیچوں بیچ سنہرے رنگ کی عمارت تھی۔ اس روز بھی تھوڑی بہت روشنی کی گئی تھی۔ وہ سنہری عمارت جسے ہر مندر صاحب یا دربار صاحب کہتے تھے سونے کے ڈلے کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ پالی کے سوا سب لوگ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے تالاب کے کنارے کنارے چلنے لگے۔ پالی کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ سب کے بڑھتے ہوئے پاؤں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پرتھی پال سنگھ کے پاؤں اس کی نسبت زیادہ اُجلے تھے۔ چھوٹے تھے اور ان کی انگلیوں کے ناخن بڑی صفائی سے کٹے ہوئے تھے۔ اس نے دیکھا کہ اُس کے اپنے پاؤں اور سروتی کے پاؤں میں کوئی مشترکہ بات نہیں تھی۔ البتہ پرتھی پال اور سروتی کے پاؤں میں مشابہت ضرور تھی۔

پالا سنگھ کی طبیعت واقعی بہت بدمزہ ہو گئی تھی۔ اگر وہ اکیلے ہوتے تو کس قدر لطف رہتا۔ اس وقت وہی محفل پر چھایا ہوتا جیسا کہ گاؤں سے لے کر اسٹیشن تک محض اس کی شخصیت سب کی توجہ کا مرکز بنی رہی۔ لیکن اب پرتھی پال سنگھ کے سامنے وہ آپ ہی آپ اپنی نظروں سے گرا جا رہا تھا۔ پرتھی پال سنگھ کا لباس اس کے چلنے کا انداز، گفتگو کرنے کا لہجہ اور آواز کی نرمی یعنی ہر چیز قطعاً اس کے برعکس

تھی ...... نمدار فرش پر پھولوں کی پنکھڑیوں کو پاؤں تلے کچلتے ہوئے وہ دربار صاحب کے اندر جانے والے پل پر ہو لیے۔

پرتھی پال سنگھ کو محسوس ہوا کہ سارے گروہ میں صرف ایک شخص کی طبیعت بجھی بجھی سی دکھائی دے رہی تھی۔ اُس نے بڑے غور سے ایک نظر پالی پر ڈالی۔ اُس نے محسوس کیا کہ وہ اصلی دیہاتی، اُجڈ، اڑیل اور مشکوک چال چلن کا نوجوان ہے۔ اس کے باوجود پرتھی پال سنگھ نے بڑے اخلاق اور اخلاص سے ہنس کر شیریں اور نرم لہجے میں پوچھا۔

"آپ تو بالکل خاموش ہیں؟"

پرتھی پال کے الفاظ میں برا لگنے کی کوئی بات نہیں تھی۔ پھر بھی پالی کو بہت سخت غصہ آیا۔ وہ اپنے غصے کو چھپا بھی نہ سکا۔ نہ اس نے چھپانے کی کوشش کی۔ اس کے سوال کے جواب میں اس کے چہرے پر ناپسندیدگی کے آثار پیدا ہوئے اور وہ زیرلب کچھ بڑبڑا کر رہ گیا۔

لیکن پرتھی پال سنگھ نے اس کا برا نہیں مانا۔ وہ اپنی معصوم اور دلفریب ہنسی ہنس کر دوسری طرف متوجہ ہو گیا۔

دربار صاحب کے اندر پہنچ کر سب نے گرو گرنتھ صاحب کے روبرو بڑی عقیدت سے متھا ٹیکا۔ لیکن پالی اس وقت پرماتما سے بھی بگڑا ہوا تھا۔ چنانچہ اس نے سر جھکایا ضرور لیکن پیشانی فرش پر لگنے سے پہلے ہی سر اوپر اٹھا لیا۔

دربار صاحب کے اندر کسی قسم کا شور نہیں تھا۔ گرنتھ صاحب کے اوپر پڑے ہوئے رنگین ریشمی رومال تھے۔ پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو، پیولوں کی ہلکی ہلکی جھنکار اور راگی جتھے کی مترنم لے گونج رہی تھی۔ پرتھی پال سنگھ نے ہنس کر ساتھیوں سے کہا:

"گورو کے گھر میں بھی کیا سکون اور امن ہے۔ ہر طرف آنند ہی آنند ہے۔ جی چاہتا ہے۔ یہیں گورو کے چرنوں میں پڑا رہے آدمی۔"

اس کی شیریں آواز سننے والوں کے کانوں میں شہد گھولتی رہی۔

"اچھا آیئے اب شستر دیکھنے چلیں۔"

اکال تخت پر پہنچ کر وہ بھیڑ میں گھس گئے۔ یہاں سکھ گوروؤں اور بزرگوں کے ہتھیاروں کی نمائش کی جاتی تھی۔ پالی کھسک کر گروہ سے علیحدہ ہوا اور ذرہ پرے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

آخر ہتھیاروں کی نمائش شروع ہوئی۔ ایک لمبا چوڑا سکھ جس کی لہراتی ہوئی سیاہ داڑھی اس کی ناف تک پہنچتی تھی۔ زمین سے بالشت بھر اونچے تخت پوش پر کھڑا ہو گیا ایک شخص کوئی ہتھیار جھاڑن سے پونچھ کر اس کی طرف بڑھاتا۔ وہ اسے ہاتھ میں لے کر کہتا:

"یہ سری صاحب (تلوار) سری گورو گوبند سنگھ جی مہاراج کی ہے۔"

"یہ اٹھارہ سیر کا کھنڈا سری گور ہر گوبند صاحب جی مہاراج کا ہے۔"

"یہ تیر دمیس پتا سری گورو گوبند سنگھ جی مہاراج کے ہیں۔ دیکھیئے اس کے پچھلے کونے پر سونا لگا ہوا ہے۔ یہ اس لیے لگایا گیا تھا کہ جو شخص حضور کے تیر کا نشانہ بنے اس سونے کی قیمت سے اس کے کفن دفن کا انتظام ہو سکے۔

"یہ سری صاحب سری گورو....."

پالی ایک گوشے میں کھڑا اپنے گروہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جہاں اس کی بھابی، سرنوں، اس کے بھائی پرتھی پال سنگھ و دیگر مرد اور عورتیں کھڑی تھیں۔ سرنوں اب بھی حسب عادت لپا لپا کر ہنس رہی تھی۔ وہ دونوں قریب قریب کھڑے تھے۔ پالی کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے بنائے گئے ہیں اور وہ خود محض ایک فالتو شخص ہو۔ پرتھی پال سر جھکا کر دلفریب انداز میں مسکراتے ہوئے نہ معلوم کیا کہتا کہ سننے والوں کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی۔ وہ سب اس کا بہت احترام کرتے تھے۔ اسے "بھٹین" سمجھتے تھے۔

رات کو جب سب لوگ سونے کے لیے عظیم الشان سرائے کی چھت پر پہنچے تو بمشکل عورتوں کے لیے چارپائیوں کا انتظام ہو سکا اور اب سارا انتظام بھی پرتھی پال کے سپرد کر دیا گیا۔ مردوں کو چارپائیاں نہیں ملیں، اس کے باوجود عورتیں آپس میں کہہ رہی تھیں: "بھلا ہو پرتھی پال کا۔ اگر وہ نہ ہوتا تو بھلا ایسی بھیڑ میں

چارپائی کہاں ملنی تھی "۔

"بھن اسے سب مانتے ہیں نا۔ نہ جانے سکتر کے پاس جاکر گر۔جی میں کیا گٹ پٹ کی کہ اس نے جھٹ چارپائیاں دے دیں "۔

"پٹھیٹن ہے نا پھٹیٹن!"

پالی یہ باتیں سُن سُن کر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ فوراً پرتھی پال کا ٹینٹوا جا دبوچے اور بٹیر کی طرح اس کی گردن مروڑ ڈالے۔

پرتھی پال سنگھ کے خاندان کے افراد کی چارپائیاں پرلے کونے پر بچھی تھیں خود پرتھی پال نے اپنے لیے بھی ایک بڑی سی چارپائی کا بندوبست کر لیا تھا۔ وہ اپنے اُجلے بستر پر بڑی تمکنت سے بیٹھا تھا۔ سرتوں کے خاندان کا رُجوع بھی انہی کی طرف تھا۔ اس طرف اس کی بھابی اور ماں کی چارپائیاں تھیں۔ بھابی کے بستر پر اس وقت دو بچے سوئے پڑے تھے۔ ابھی سب لوگ پرتھی پال کے گھر والوں سے بات چیت کرنے میں معروف تھے۔ پالی نے سب سے الگ چھت کے سرے پر بنے ہوئے سیمنٹ کے چبوترے پر اپنی میلی چادر بچھالی تھی۔ تکیے کا اس نے کبھی استعمال ہی نہ کیا تھا۔ بہت ہوا تو سر کے نیچے بازو رکھ لیا۔ اس کے کانوں میں سب کی باتوں اور قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں اور وہ تاروں کی مدھم روشنی میں چھت پر قدم قدم پر بچھے ہوئے بستروں پر بیٹھی یا لیٹی ہوئی عورتوں، مردوں اور بچوں کو بے معنی نظروں سے دیکھتا رہا۔

صُبح ہوئی تو موقع پا کر اُس نے بھابی سے اپنے شُبہ کا اظہار کیا۔ پہلے تو اُس نے ہنس کر ٹال دیا۔ لیکن پالی نے جب زور دے کر کہا کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ تو تاباں نے اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرنے کی کوشش کی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسے خود پرتھی پال سنگھ پسند تھا۔ پسند سے مراد یہ نہیں کہ اسے اس سے محبت تھی بلکہ وہ اس کی شخصیت سے بھی بہت متاثر نظر آتی تھی اور اسے وہ بہت نیک نوجوان دکھائی دیتا تھا۔ اسے پالی کی اس بات پر یقین نہ آیا کہ پرتھی پال کو سرتوں سے محبت ہو گئی ہے یا وہ اسے پھسلانا چاہتا ہے۔ اس نے پالی کو سمجھانے کے

لئے کہا۔

"پالی! تم یونہی جلتے ہو اس سے۔ وہ تو بس ہنس مکھ۔ سب سے ہنس ہنس کر باتیں کرتا ہے۔ تم نے اس کا کچھ اور ہی مطلب نکال لیا ہے۔"

پالی کے دل کا شبہ نہ گیا تو تاباں نے ہنس کر کہا: "اچھا تو آج رات تال (تالاب) کے کنارے بیٹھنا۔ میں اسے تمہارے پاس لے آؤں گی۔ اگر ہو سکا تو میں تھوڑی دیر کے لیے اسے تمہارے پاس اکیلی بھی چھوڑ دوں گی۔"

رات ہوئی تو سری دربار صاحب کی دیواروں اور چھت پر بجلی کے بے شمار ننھے ننھے قمقمے جگمگانے لگے۔ سنہرے درودیوار روشنی کی جگمگاہٹ سے ساری عمارت دہکتے ہوئے انگارے کے مانند دکھائی دیتی تھی۔

بھابی سے مشورہ کر کے وہ تالاب کے کنارے ایک خاص مقام پر جا بیٹھا اور سرُوں کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ ایک پل ایک برس سے کم نہیں تھا۔ پالی جانتا تھا کہ وہ نہیں آئے گی۔ اگر دھوکے سے آ بھی آگئی تو اُسے دُور ہی سے دیکھ کر واپس لوٹ جائے گی۔

لیکن اس کا خیال غلط نکلا۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے دیکھا کہ سرُوں، اسکی بھابی کے ساتھ ساتھ چلی آرہی تھی۔ اُس نے اُسے دور ہی سے دیکھ بھی لیا لیکن وہ بھاگی نہیں۔ قریب پہنچتے ہی تاباں نے آنچل لہرا کر کہا۔

"لو بھئی لے آئی ہوں تمہاری سرُوں کو......"

بھابی کی صاف گوئی پر پالی کا دل دھڑک اُٹھا۔ وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بھابی کے قول کی تردید کرنے ہی کو تھا کہ وہ بول اُٹھی:

"تو سرُوں! اب پُوچھ لو۔ کہتا تھا سرُوں مجھ سے خفا ہے۔ ٹھیک طرح بولتی نہیں۔ میں بھی نہیں بولوں گا...."

یہ کہتے کہتے وہ دھڑام سے اُس کے قریب بیٹھ گئی۔ ساتھ ہی سرُوں کو بھی بٹھالیا۔ سرُوں بیچاری نہ صرف شرمائی ہوئی تھی بلکہ وہ کچھ خوفزدہ بھی تھی۔ آنچل کا کونا مروڑتے ہوئے اُس نے دبی دبی نظروں سے پالی کی طرف دیکھا۔ اس کے
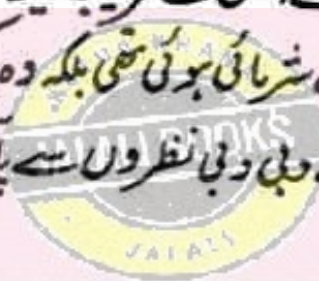
ہونٹ پھڑکے۔

"پاکی ..... بھیّا تم سے خفا تو نہیں ہوں۔ تم یونہی خفا ہو گئے ہو......"

"اے لو..... " تاباں نے ایک جانب دیکھ کر اس انداز سے کہا جیسے اُس نے کسی سہیلی کو دیکھ لیا ہو۔ "بھئی! میں ابھی آئی۔" یہ کہہ کر وہ تو چپت ہوئی۔ پاکی بیچارا خود گھبرا رہا تھا۔ وہ ان حالات کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ اس نے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں کچھ کہا۔ پھر ہر چہار جانب پھیلے ہوئے غبار نور میں سرون کی خوابناک آنکھوں کو چُپ چاپ دیکھنے لگا۔

سرون کو یہ معلوم ہوتے ہی کہ پاکی اس سے خفا نہیں بڑی خوشی حاصل ہوئی اور وہ پھر وہی سرون تھی اور وہی اس کی بے اختیار ہنسی۔

کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔

دفعتاً پاکی نے سنجیدہ بن کر کہا۔

"سرون! تم مجھے بہت یاد آتی ہو۔ تمہاری کوئی نشانی میرے پاس ہونی چاہیئے اور میری کوئی نشانی تمہارے پاس....."

اس پر سرون خاموش ہو گئی۔ تاباں واپس چلی آ رہی تھی۔ سرون چاہتی تو اس کا کچھ نہ کچھ جواب دے سکتی تھی لیکن اُس نے جواب میں غیر معمولی تاخیر کر دی۔

وہ دونوں تھوڑی دیر تک اس کے پاس بیٹھی گپ ہانکتی رہیں۔ پھر جب وہ اُٹھ کر چلی گئیں تو پاکی کے دل پر امید و بیم کی کیفیت طاری ہو گئی۔

ہر ہنگامے سے پرے اس کا ذہن بیکراں خلا میں کھو گیا۔ اس کی نظروں کے سامنے تالاب کا پانی تھا۔ جو اس وقت سیاہی مائل رنگ کا دکھائی دیتا تھا۔ اس کی تہ کا کچھ پتہ نہ تھا۔ سطح پُرسکون تھی۔ کبھی کبھی ہوا کے ہلکے جھونکے کے ساتھ کوئی بھولی بھٹکی لہر روشنی کی جھلملاہٹ اپنے کندھوں پر اُٹھائے لے آتی اور آنکھ جھپکتے میں گم ہو جاتی..... پھر وہی پُرسکون سطح اور ناقابلِ پیمائش گہرائیاں۔

پاکی کو اپنی دُھن میں اپنے اردگرد کا کچھ ہوش نہ تھا۔ یہاں تک کہ اسے ایک سیوادار نے کندھے سے جھنجھوڑ کر اٹھا دیا۔

اُس نے دیکھا چند آدمی شبد گاتے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ وہ گویا چوبیس گھنٹے

کی بانی کا ماحصل لے کر ہر مندر صاحب سے نکلے تھے اور تالاب کا چکر لگا رہے تھے ان کے آگے آگے اکہرے بدن کا سکھ اپنی گراری آواز میں "سوادان (خبردار) سوادان — کہتا چلا آرہا تھا۔

جب ارد گرد کے لوگوں نے ادب سے سر خم کئے اور ان گورسکھوں کے آگے دودھ کے پیالے رکھے تو پالی ان کی طرف دھیان دیئے بغیر ٹہلتا ہوا پرے نکل گیا۔

۹

دیوالی کے روز جو شک پالی کے دل میں پیدا ہوا وہ کسی نہ کسی صورت میں قائم رہا۔ مٹ نہ سکا۔

دن گزرتے گئے۔

پالا سنگھ کے معمول میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہی بیکاری کے دن، کھانا پینا، دوستوں کے جھگڑے، وہی گندے سے مذاق، بیہودہ گانے، اور ان سب چیزوں کے ساتھ دل میں ایک دبی دبی سی کسک۔ ایک خاموش آہ! گھن کی طرح اندر ہی اندر کھا جانے والی۔

عورت اس کے لیے کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ وہ کئی عورتوں سے تعلقات پیدا کر چکا تھا۔ اس نے عورت ذات سے کبھی زیادہ امیدیں نہیں باندھی تھیں۔ وہ عورت کو بس عورت ہی سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا۔ عورت بھرپور ہونی چاہیئے۔ اور یہ کہ عورت، مرد ہی کے لیے بنی ہے۔ دن بھر کی محنت اور زندگی کے جھمیلوں سے ٹکر لینے کے بعد تھک تھکا کر عورت کی آغوش کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔"

اس کی مضبوط انگلیوں کی پکڑ لوہے کے زنبور کی طرح سخت تھی۔ اس کے چنگل میں پھنسی ہوئی عورت بچ نہیں سکتی تھی۔ عورت ذات کے ساتھ اس کی پیار کی حرکتیں بھی کافی سخت ہوتی تھیں۔ وہ من پسند عورت کی کلائی مضبوطی سے پکڑ لیتا اور خود ایک جگہ جم کر کھڑا ہو جاتا۔ عورت کی کھینچا تانی، چھینا جھپٹی اور ہاتھ پاؤں مارنے کے

باوجود وہ کھونٹے کی طرح اپنی جگہ پر جما رہتا۔ ہنس ہنس کر اپنے دانتوں میں جڑی سونے کی میخوں کا مظاہرہ کرتا۔ اور آخر وہ بلکتی، بلبلاتی تڑپتی عورت کو بے بس کر دیتا........ لیکن سرفوں کے معاملے میں وہ بے بس تھا۔

گاؤں کی پانچ سات دوکانوں میں سے ایک دکان اس کے دوست خیراتی کی تھی۔ خیراتی بھی ایک ملنگ نوجوان تھا۔ اس کے گھر کی حالت اس ملنگ پن کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ وہ خود اکہرے بدن کا بدصورت انسان تھا۔ لیکن آواز بہت باریک اور سُریلی پائی تھی۔ گاؤں بھر میں صرف نواب ہی اس سے اچھا گا سکتا تھا۔ نواب کی آواز قدرے بھاری تھی۔ لیکن اس میں بے حد لوچ اور درد تھا۔

گھر والوں کے کہنے پر خیراتی نے دُکان کھول رکھی تھی۔ جس میں گاؤں کی دوسری دُکانوں کی ہر چیز موجود تھی۔ پر اس کا سودا کم ہی بکتا تھا کیوں کہ شربت اور عرق کئی برس کے پُرانے تھے۔ مصالحوں میں کیڑے، اچاروں میں چوہے یعنی ہر شے میں کوئی نہ کوئی خرابی موجود تھی۔ ہاں اگر کوئی چیز بکتی تھی۔ تو بڑ کا مربہ۔ نہ جانے اسے بڑ کا مربہ بنانے کی ترکیب کہاں سے ہاتھ لگ گئی تھی کہ شیرے میں ڈوبی ہوئی بڑیں چھوٹے افروٹ کے برابر پھول جاتی تھیں۔ ایسا مربہ تو شہر میں بھی نہیں ملتا تھا۔ ایک تو مربہ اتنا اچھا اس پر گاؤں کا اکلوتا حکیم علی اصغر جو اس کے گہرے دوستوں میں سے تھا۔ ہر مریض سے بڑ کا مربہ استعمال کرنے کو کہتا۔ بڑ کے مربے کے ساتھ چاندی کے ورقوں کی سفارش کی جاتی تھی۔ آس پاس کے دیہات میں علی اصغر کی حکمت چلتی تھی۔ نتیجہ یہ کہ خیراتی کی بڑیں خوب بکتیں جو مال طیار ہوتا فوراً بک جاتا۔ اس طرح گاہکوں کو بھی تازہ مال ملتا اگر کسی کے پاؤں میں موچ بھی آجاتی تو اس کی ٹکے کی بڑیں تو ضرور ہی بک جائیں گی۔

کبھی جی میں آتی تو وہ جلیبیاں اور پکوڑے تلنے لگتا۔ اس دن کافی پیسے کما لیتا۔ گاؤں میں پکوڑے یا چٹنی یا جلیبیاں کہاں کھانے کو ملتی ہیں۔ جس دن وہ کڑاہی آگ پر رکھتا گاؤں بھر میں خبر پھیل جاتی۔ ہر کوئی تھوڑے بہت پکوڑے وغیرہ خرید لیتا۔ بچے تو جلیبیوں اور پکوڑوں کے پیچھے باؤلے ہو جاتے۔ اگر پیسے نہ ملتے تو گیہوں لے آتے۔ گاؤں

والے جلیبیوں کو جلیب کہتے تھے۔ کڑاہی میں اٹھتی ہوئی مہک سونگھ کر تایا ہر پرشاد اور کرم دین ایسے بزرگ بھی حقے اٹھائے اور تہبند لہراتے پاس کے چبوترے پر پاؤں کے بل آن بیٹھتے۔ خوب مزے لے لے کر باتیں کرتے۔ جلدی جلدی کش لے کر نتھنوں سے دھواں اڑاتے اور نظریں جلیبیوں پر جمائے رکھتے۔

سردیوں میں لوہڑی سے پندرہ بیس دن پہلے ایک شام کو لوگوں نے دیکھا کہ خیراتی نے اپنی دکان کے سامنے بھٹی میں آگ جلا کر گھی کا کڑاہا چڑھا دیا ہے۔ راہ چلتے آدمی رک کر پوچھتے۔

"کیوں بھئی خیراتی! جلیب؟"

"آہو بھاجی" وہ جواب دیتا۔

پھر وہ لوگ وہیں پاس کے چبوتروں پر اکڑوں بیٹھ جاتے۔ جنگ کے کارن میدے کی بڑی کمی ہو گئی تھی۔ اس لیے اب کے کڑاہا بہت دنوں کے بعد چڑھایا گیا تھا۔ اس لیے تھوڑی ہی دیر میں بہت سے لوگ وہاں اکٹھے ہو گئے۔ خیراتی پور نکالتے ہی دونوں میں ڈال ڈال کر بانٹ دیتا۔ کسی سے کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ سب پیٹ بھر کر کھاتے اور پھر ان میں سے ہر ایک اپنی سمجھ اور اندازے سے جتنے دام دیتا وہ رکھ لیتا۔ کبھی کسی قسم کی بک بک جھک جھک نہ ہوتی۔ گھروں سے بچے بھی بھاگم بھاگ آن پہنچے۔ ان کا الگ شور اٹھا۔

بالی بھی آ نکلا۔ جب سے وہ گاؤں آیا تھا۔ اس کے لیے یہ پہلا موقع تھا۔ سب لوگ حقے گڑگڑاتے اور باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ خیراتی کی حرکتوں کو بھی دیکھ رہے تھے۔ ضرورت محسوس کرنے پر اپنے قیمتی مشورے بھی دے دیتے تھے۔

دیہاتی ماحول میں پلا ہوا خیراتی بھی بڑے آرام سے کام کر رہا تھا۔ اسے گاہکوں کی فکر نہ تھی۔ وہ پہلے ہی سے وہاں موجود تھے۔ اس لیے بھٹی میں موٹی سی لکڑی گھسیڑ کر وہ رک جاتا اور سر کھجانے لگتا۔ پھر کڑاہے میں گھی انڈیل کر اپنی چھوٹی سی بودی (چوٹی) کو مروڑنے لگتا یا کوئی دوسرا چھوٹا موٹا کام کرنے لگتا۔ ہر کوئی اس کی اس طرح کی حرکتوں کو چپ چاپ برداشت کرتا۔ حالانکہ ہر کسی کا جی چاہتا تھا کہ

جلدی سے جلدی کڑاہے سے جلیب نکلیں اور وہ کھائیں۔

یوں تو گاؤں کا ہر شوقین وہاں موجود تھا صرف کرم دین کی کمی تھی۔ مگا بو وہ اُدھر سے نکلا تو قدم رُک گئے۔ حقے کی نَے ہونٹوں سے الگ ہو گئی۔ اب وہ صرف ناک ہی سے نہیں بلکہ مُنہ سے بھی گھی میں تلی جا رہی جلیبیوں کی خوشبو سونگھنے لگا...... چلم کے ساتھ لٹکی ہوئی چمٹی جھولتی رہی...... اس کی نیچے کو گری ہوئی لمبی، بھیلی بھیلی مونچھوں میں لمحہ بھر کے لیے حرکت پیدا ہوئی۔

ایسے موقعہ پر ہر پرشاد کہاں چُوکنے والا تھا۔ فوراً آوازہ کسا۔

"بیٹھ بے بابا! کھڑے کھڑے کیا دیکھتا ہے۔ طیار ہو جائیں گے تو تجھے بھی مل جائیں گے......"

کرم دین نے مسکراہٹ دانتوں میں دبالی اور من ہی من میں ہر پرشاد کے حملے کا مناسب جواب سوچنے لگا۔

ہر پرشاد نے اسے چُپ چاپ ایک جگہ جمے دیکھا تو ساتھ والے کو کہنی سے ٹھوکا دیتے ہوئے بولا: "دیکھو اب بابا! اس جگہ سے ہل نہیں سکے گا۔"

کرم دین جلد جلد کش کھینچ کر دھواں چھوڑنے لگا۔ اس وقت نہ جانے کیوں اسے کوئی بات نہ سُوجھ رہی تھی۔ ہر پرشاد نے چوٹ پر چوٹ جاری رکھی۔

"بابا بھلا جلیب دیکھے اور پھر چل دے؟..... ارے توبہ!"

کرم دین نے ڈھیٹ بن کر ایک چبوترے پر ڈیرہ جماتے ہوئے جواب دیا: "اور بیٹا! تم جو صُبح سے یہاں بیٹھے ہو؟"

ہر پرشاد نے سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے لوگوں سے کہنا شروع کیا۔

"بچپن میں بھی اس کی ایسی ہی عادتیں تھیں۔ لو اب تمہیں ایک مزے دار بات سناؤں؟"

یہ کہہ کر ہر پرشاد نے کن انکھیوں سے کرم دین کی جانب دیکھا جو اس وقت بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ خوب سمجھتا تھا کہ آج کم بخت ہر پرشاد پہل کر گیا ہے۔ اس لیے اُس نے پر کٹے (دب جانے) میں خاص ہرج نہ جانا۔ بچپن میں ان

دونوں ساتھیوں نے اَن جانے ہی سے یہ سمجھوتہ کر رکھا تھا، کہ ان میں سے اگر ایک کو برتری حاصل ہو جائے تو دوسرے کو بڑے چین سے ہرک جانا چاہیے۔

"بچپن کی بات سناتا ہوں۔ ایک بار ہم میلہ دیکھنے گئے......"

کرم دین سمجھ گیا کہ اب وہ کون سی بات سُنانے والا ہے۔ وہ خود بھی بڑی شانتی سے حقہ گڑگڑاتے ہوئے مسکرانے لگا۔ ہر پرشاد نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ "ہم دونوں کے گھر والے بھی ساتھ تھے۔ اتنے میں میاں کرم دین سب کا ساتھ چھوڑ کر کھسکے اور ایک بُوڑھے آدمی کی طرف بڑھے جو اس وقت جلیب کھا رہا تھا۔ جاتے ہی زبردستی اُس کی گود میں گھس بیٹھے اور بڑے پریم اور بھولپن سے کہنے لگے۔

"تم میرے باپو ہونا؟"

اس بات پر سب لوگ خُوب ہنسے۔ نوجوانوں نے اپنی پگڑیاں ہوا میں اُچھال دیں۔ ہر پرشاد نے اس کی نقل اتارتے ہوئے بڑا عجیب سا منہ بنا کر کہا۔ "جی چاہتا ہے کہ اب جو کرم دین جلیب کھانے لگے تو چپکے سے دھوتی سمیٹ کر اس کی گود میں بیٹھ جاؤں اور کہوں " تم میرے باپو ہونا؟"

"ہاہا..... ہی ہی...... ہو ہو..... او ہو ہو۔" پہلے سے بھی زوردار قہقہوں سے آسمان گونج گیا۔ اتنے میں جلیبیوں کا پہلا پُور نکلا اور سب میں بٹ گیا۔ اس طرح جلیبیوں کے ساتھ گرم گرم لطیفوں کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ پالی کو جلیب بہت پسند آئے اور اس کے دوست خیراتی نے بھی کنجوسی سے کام نہیں لیا۔ یہ نئے ڈھنگ کی محفل پالی کو اِس قدر پسند آئی کہ وہ سوچنے لگا۔ جلیب ضرور ہی تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد نکلنے چاہئیں۔ پالی بھی اچھی اچھی کہانیاں سُنانے میں مانا ہوا تھا۔ اُسے بھی سب نے اُکسایا اور اُس نے بھی اپنی مُونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے دو چار چٹکلے سنائے لوگ اس کی باتوں سے بہت محظوظ ہوئے۔ پالی کے بعد وہ کرم دین کے پیچھے پڑ گئے آخر کرم دین بھی چٹکلہ سنانے کے لیے تیار ہو گیا کہ باتوں میں ذرا ہر پرشاد کی بھی خبر لے لیں گے۔

جب لوگ کرم دین کی باتیں سننے میں محو تھے تو پالی نے نظر اُٹھائی تو دور سے

ایک لڑکی آتی دکھائی دی۔ اسے فوراً شک گزرا کہ وہ سرنوں ہو گی۔ لیکن جب وہ موڑ سے مڑی تو اُس کا شبہ دُور ہوا۔

گاؤں میں آکر جب اُس نے پہلے پہل سرنوں کو دیکھا تو اسے اپنی امیدوں سے بڑھ کر حسین پایا۔ اُس نے حالات کو اچھی طرح نہ سمجھا تھا۔ لیکن وہ سرنوں کے معاملے میں کوئی زبردستی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اگر کبھی اس کے دل میں جبر کا خیال آیا بھی تو اُس نے اسے فوراً دبا دیا۔ کسی انجانے جذبے کے تحت اس کے غیر ذمہ داری کے نظریے میں تبدیلی پیدا ہو رہی تھی۔ یُوں بھی اسے اس بات کا یقین تھا کہ سرنوں سے اس کی شادی ہو ہی جائے گی اور از خود ہی اس نے اس بات کا ارادہ کر لیا تھا کہ اسے سرنوں کے والدین کی نظروں میں جچنے کے لئے پُرانے پاپیوں سے ذرا بچ کر رہنا ہوگا۔ مگر جب سے اس نے پرتھی پال سنگھ کو دیکھا تھا۔ اس کے من میں کئی جذبات اُبھر آئے تھے۔ نہ جانے وہ کس کی آواز تھی۔ جو ہر لمحہ اس کے کان میں خبردار! خبردار! کا نعرہ لگا رہی تھی۔ اس دن سے وہ سرنوں اور پرتھی پال کے تعلقات کے بارے میں اصلیت کی ٹوہ لگا رہا تھا لیکن بے نتیجہ۔ کچھ دن پہلے اسے پتہ چلا تھا کہ پرتھی پال پھر چھٹی پر گاؤں آیا ہوا ہے اور وہ حیران تھا کہ آخر پرتھی پال سنگھ کے لیے اس کے معمولی سے گاؤں میں کون سی کشش ہے جو وہ اتنی جلد جلد چھٹی لے کر آ دھمکتا ہے۔

وہ اسی قسم کے خیالات میں گم رہتا۔ دوستوں کی طرف بھی وہ زیادہ دھیان نہیں دے پاتا تھا۔ ان کی محفلوں میں بھی اس کی یہی حالت ہو جاتی اور وہ اس کی محویت پر اسے ٹوکا بھی کرتے تھے۔ اس وقت سب لوگ کرم دین کے لطیفوں پر ہنس رہے تھے۔ اس لیے کسی نے اس کی جانب زیادہ دھیان نہیں دیا۔ اسی اثناء میں نواب بھی ادھر آنکلا اور جلیب دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ گاڑھے کی موٹی چادر کے گوشے میں جلیب ڈلوا کر وہ سیدھا پالی کے پاس پہنچا اور اُس کے ساتھ سٹ کر بیٹھتے ہوئے بولا:

"کہو پالی!"

پالی نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا تو نواب نے دو تین جلیب ایک ساتھ

مُنہ میں رکھتے ہوئے کہا "بیٹا! اکیلے اکیلے کھا رہے ہمیں خبر تک نہیں کی....."

پالی نے مجبوری کا اظہار کرتے ہوئے کہا "بھئی مجھے خود اس بات کا پتا نہیں تھا۔ جب سے گاؤں میں آیا ہوں۔ پہلی بار یہ تماشا دیکھا ہے۔"

نواب نے اس کی پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے کہا "لو کھاؤ۔"

"تم کھاؤ یار! میں پہلے بھی کھا چکا ہوں۔"

"ابے کھا بھی لے ہمارے کہنے سے۔"

پالی نے ایک جلیب اُٹھا لیا۔ پھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ اچانک نواب نے سرگوشی میں کہا "ہاں یار! میں تم سے ایک بات کہنے والا تھا...."

"کہو۔"

"وہ ہے نا! کیا نام ہے اس کا بھلا سا....... وہ پیٹھین دیکھو نام بھول رہا ہوں......"

پالی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا "پرتھی پال سنگھ۔"

"ہاں وہی......"

"تو کیا ہوا؟"

"آج میں نے اس گاؤں سے کچھ دُور....... اُدھر قبرستان سے بھی پرے...."

"اچھا؟"

"تو مجھے کچھ شک گزرا۔"

پالی چپ رہا۔ لیکن اُس کی نظریں نواب کے چہرے پر جمی تھیں۔ نواب پھر سے کہنے لگا:

"سرنوں بھی اُدھر ہی سے آرہی تھی۔"

لمحہ بھر کے لیے خاموشی طاری ہوگئی۔ پھر پالی نے بھاری آواز میں پوچھا:

"تو کیا ان دونوں کو تم نے ساتھ ساتھ دیکھا تھا؟"

"نہیں...... پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ ضرور ملے ہوں گے۔ آخر اتنی دُور جانے کا لڑکیوں کا کیا کام......؟"

پالی کے لئے یہ خبر غیر متوقع تھی۔

"سرتوں بھی اِدھر اُدھر دیکھتی دبے پاؤں چلی آرہی تھی اور برتھی دوسرے راستے سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا گاؤں کو آرہا تھا۔ بھئی میں یہ تو نہیں کہتا کہ میرا خیال بالکل ٹھیک ہے مگر کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔"

"کب دیکھا تم نے؟"

"ابھی ابھی.... جب میں رہٹ سے لوٹ رہا تھا۔"

"کیا تم نے اچھی طرح دیکھا بھی تھا کہ وہ سرتوں ہی تھی۔"

"ہاں بھئی! تو کیا میں سرتوں کو بھی نہیں پہچانتا؟"

پالی لمحہ بھر کو چپ ہو گیا اور پھر دوست کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا! "دیکھو یار کسی اور کو معلوم نہ ہو۔"

"بالکل نہیں۔"

پالی کو نواب پر پورا بھروسہ تھا۔ وہ قابلِ اعتماد تھا بھی۔ لگائی بجھائی والی اس کی طبیعت ہی نہیں تھی۔ دوستی کے ناطے پالی کو یہ بتانا اُس نے ضروری سمجھا۔

پالی پگڑی سنوارتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا اور پھر تیزی کے ساتھ قبرستان کی جانب چل دیا۔

نواب جانتا تھا کہ اگر کہیں اسے برتھی پالی دکھائی دے گیا تو یہ مُلاقات دونوں کے حق میں اچھی نہیں ہو گی۔ لیکن وہ اس بات سے مطمئن تھا کہ برتھی پال تنہا تھا۔ اگر مڈھبیڑ ہو گئی تو پالی کا پلڑا بھاری رہے گا۔ چنانچہ وہ بیٹھا جلیب کھاتا رہا۔

پالی کے کچھ دوستوں نے اُسے گاؤں سے باہر جاتے دیکھا تو ان میں سے ایک بول اٹھا۔

"ابے دیکھو پالی چپکے سے کھسک گیا ہے۔"

"کوئی پکڑیے حرام حرام جادے کو۔" دوسرا بولا۔

اس پر بشنا چپ چاپ تہبند کس کر اس کے پیچھے ہو لیا۔ نواب نے یہ دیکھا تو چلا کر بولا۔ "یارو! غضب کرتے ہو۔ پاس کے کھیت میں پاخانہ کرنے گیا ہے۔

ابھی لوٹ آئے گا۔"

"کیا تجھ سے کہہ کر گیا ہے؟"

"ہاں بھئی تو کیا جھوٹ بکتا ہوں۔ عجب الول جلول آدمی ہو۔"

اس طرح اس نے سب کو چپ کرایا اور پھر ان کا دھیان ہٹانے کے لیے خیراتی سے بولا:

"ابے کھیراتی کیا ہو گیا ہے تجھے۔ جلیب لاجلیب۔ کھڑا اٹکر ٹکر منہ دیکھتا ہے۔"

بالی تیزی سے قبرستان کی جانب بڑھ رہا تھا۔ ابھی تک وہ طے نہیں کر پایا تھا کہ اگر ان دونوں میں سے کوئی ایک مل جائے تو وہ کیا برتاؤ کرے گا۔ لیکن چہرے کے آثار اچھے نہیں تھے۔ دل میں ایک طوفان برپا تھا۔

آخر وہ قبرستان کے قریب سے ہوتا ہوا اس کی پرلی طرف پہنچ گیا مگر وہاں میدان صاف تھا۔ دُور دُور تک نظر دوڑائی کہ شاید پرتھی ہی دکھائی دے جائے پر کھیتوں میں کچھ کسانوں کے علاوہ کوئی نظر نہ آیا۔

وہ کچھ دیر تک وہاں کھڑا رہا۔ پھر اُس کے بالوں میں سرسراہٹ ہونے لگی۔ ادھر کئی دنوں سے اُس نے بال نہیں دھوئے تھے۔ سوچنے لگا۔ کہیں جوئیں نہ پڑ گئی ہوں۔ اسے اپنی بے پرواہی پر غصہ آنے لگا۔ وہ دل ہی دل میں اپنے آپ کو کوسنے لگا۔ سرنوں کو اس قسم کی عادتوں سے سخت نفرت تھی اور اب کچھ پڑھ لکھ چکنے کے بعد تو اس کا مزاج اور بگڑ گیا تھا۔ پھر وہ سوچنے لگا کہ پرتھی اگر زیادہ نہیں تو ہفتے میں دوبار تو ضرور ہی بال دھوتا ہو گا۔ اس نے بھی پختہ ارادہ کر لیا کہ گھر پہنچتے ہی وہ ریٹھے توڑ کر ان کے چھلکے پانی میں بھگو لے گا۔ اور دوسرے دن سب سے پہلے بال دھو ڈالے گا۔ ان کے پانی سے۔ اگر ہو سکا تو بال دھونے کے بعد کہیں سے چنبیلی کا تیل بھی لائے گا اور ان سے بالوں کو خوب چمکائے گا۔ جوڑے پر بندھی جالی اور اُس کے پھندے جو چکنائی اور تیل سے چکٹ رہے تھے انہیں بھی دھو ڈالے گا۔

ایسے شبہ خیال کے بعد وہ حالات کا نئے طریقے سے جائزہ لینے لگا۔

اُس نے سوچا ممکن ہے کہ سرون اور پرتھی پال کے مابین ایسا ویسا معاملہ نہ ہو۔ چونکہ اسے خود سرون سے پریم ہے۔ اس لیے یہ بھی ممکن نہیں سب شکوک اس کے دماغ کی پیداوار ہوں۔ آخر سرون سے بیاہ میں رکاوٹ ہی کیا ہو سکتی تھی۔ خط و خال کے لحاظ سے اس میں کوئی خرابی نہ تھی۔ اگر سرون کا خاندان اُونچا تھا تو جب سے وہ گاؤں میں آیا تھا۔ اُس نے بھی کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں تھی۔ جوالا سنگھ و دیگر بدکاروں سے اس کا خاص تعلق نہیں تھا۔ وہ ایک بار اُس نے جوالا کے وہاں شراب پی اور کھانا کھایا تھا۔ تو اس دن اس قدر زور کی آندھی چلی تھی کہ کسی کو کانوں کان پتہ نہ چلا تھا۔ رہی تھوڑی بہت شرارت تو وہ گاؤں کا کون نوجوان نہیں کرتا تھا۔

اس نے سرون کے بارے میں بھی نئے سرے سے سوچا۔ چاہے وہ کچھ بھی کہتا یا سمجھتا ہو مگر سرون نے اسے کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ وہ ایسی ہنسوڑ تھی کہ جب ملتی پھول کی طرح کھل جاتی۔ ہر وقت الھڑ پنے سے ہنستے رہنے کی یہ عادت ہی تو تھی جو اس کے لیے ایک مصیبت بن گئی تھی۔ اب وہ اسے کسی سے ہنس کر ایک بات کرتے دیکھ لیتا تو اس کے دل میں کئی طرح کے شکوک پیدا ہو جاتے۔ نہیں نہیں یہ سب شکوک بے بنیاد تھے۔ وہ کبھی ایسی لڑکی نہیں ہو سکتی بلکہ وہ خود جذبات کی رو میں بہہ کر ایک دن اس سے بغل گیر ہو گیا تھا۔ پر اس کی اس حرکت کا بھی سرون نے بُرا نہیں مانا۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اس کے لیے جگہ ہے۔ اگر وہ ڈھب سے آپس کے تعلقات مضبوط کر سکے تو..... اور دیوالی کے دن جب وہ من ہی من میں بالکل مایوس ہو چکا تھا۔ بھابی نے سرون سے کہہ دیا کہ پالی تجھ سے خفا ہے تو وہ بچاری بھاگی بھاگی چلی آئی۔ اس وقت اس کی حرکات و سکنات بہت پیاری لگ رہی تھیں۔ اگر اس کے دل میں اس کے لیے جگہ نہ ہوتی تو کیا وہ اس طرح وہاں آتی؟ نہیں، ہرگز نہیں!!

اس طرح پالی نے اپنے دل کو ڈھارس دی۔ وہ دُور دُور تک نظریں دوڑا

کر پھیلے ہوئے کھیتوں کی آڑی ترچھی، جال سا بنتی ہوئی پینڈوں، ٹن کے پیڑوں کے گھنے سایوں تلے رواں رواں کرتے ہوئے رہٹ، کہیں کہیں چپ چاپ کھڑے ہوئے جھڑ بیریوں اور مدار کے جھنڈوں کی جانب دیکھتا رہا۔ کھلی ہوا اور پُرسکون فضا کا اس کے درماندہ اعصاب پر بڑا سہانا اثر پڑا۔ اس نے جی میں ٹھان لی کہ اگلے دن سے وہ سرتوں پر کسی قسم کا شبہ کئے بغیر اس سے نئے سرے سے تعلقات قائم کرے گا اور آئندہ کے لیے بھی اس امر کا خیال رکھے گا۔ کہ جب تک اسے سرتوں کے خلاف کوئی واضح اور ٹھوس ثبوت نہیں ملے گا۔ وہ اس پر ہرگز شک نہیں کرے گا۔

وہ سیٹی بجاتا اور کبھی کسی گیت کا بول گنگناتا گاؤں کو لوٹ پڑا۔ اپنی دُھن میں اسے صاف ستھری پگڈنڈی پر چلنے کا دھیان بھی نہ رہا۔ جدھر اُس کے پاؤں پڑتے تھے۔ اُدھر وہ چلا جا رہا تھا۔ اس طرح کئی بار اس کے پاؤں برسات کے دنوں میں مویشیوں کے کھُروں سے بنے ہوئے گڑھوں میں پڑ پڑ گئے۔

ادھر اروڑی کے پاس گاؤں کی گلی شروع ہوتی تھی۔ جب وہ اروڑی کے ڈھیر کی چھوٹی سی چڑھائی چڑھ رہا تھا تو اُس کے گاؤں کے کچھ بچوں کو وہی پُرانا کھیل کھیلتے دیکھا۔ جو جوان بزرگ ہمیشہ سے کھیلتے چلے آئے تھے۔

ایک لڑکا دیوار کی طرف منہ کر کے اس پر دونوں ہاتھ ٹیک کر کھڑا ہو گیا۔ دوسرے نے اُس کی پشت پر پاؤں رکھ دیا۔ پاس کھڑے ہوئے لڑکوں کے گروہ میں سے ایک نے سوال کیا۔ "تیری گھوڑی کیہہ دِتا؟"

دیوار والے لڑکے نے جواب دیا "لال بچھیرا۔"

"کھاندی کیہہ؟"

"دال وڑی۔"

"پلیندی کیہہ؟"

"بھنگ۔"

"تیری گھوڑی دی توڑدیاں ٹنگ۔"

اور پھر یکلخت اس کی پیٹھ پر ایک لات پڑی اور سب لڑکے پھلجھڑی کی طرح ادھر اُدھر بھاگ نکلے۔ اور وہ دیوار سے ہاتھ ہٹا کر ان کو پکڑنے کے لیے لپکا۔ ان کی مسرت بھری چیخوں اور قہقہوں سے فضا گونج اُٹھی......... اور پالی مسکرا دیا۔

گھر کی ڈیوڑھی میں پہنچتے ہی پالی نے گلی والا دروازہ بھیڑ دیا تاکہ کوئی مویشی اندر نہ گھس آئے۔ آنگن میں ہلنے کے بچے کھیل رہے تھے۔ آج اُس نے مویشیوں کے لیے سانی تک نہ کی تھی۔ اپنے اپنے کھونٹوں سے بندھے وہ سینگ ہلا ہلا کر ڈکراتے اور اس طرح اپنی بے چینی ظاہر کر رہے تھے۔ خیر کھلی بھیگی پڑی تھی۔ اس نے آستینیں چڑھا کر پہلا کام یہی کیا اور پھر سانی سے سنے ہاتھ دھوئے بنا وہ بچوں کے ساتھ کھیلنے لگا اور جب کھلی کی چراند سے اس کی کلائیوں پر جلن سی ہونے لگی تو اُس نے ٹھنڈے پانی کی بالٹی میں ہاتھ کہنیوں تک ڈبو دیئے۔

چھت پر اس کی بھابی شاید کپڑے اکٹھا کرنے گئی ہو گی۔ لیکن اب پڑوسن سے باتیں کرنے میں مگن تھی۔ پالی نے دو تین بار اسے بلانے کے لیے لڑکے کو بھیجا مگر اس کی باتیں ختم ہونے میں ہی نہ آتی تھیں۔ خیر اس نے منڈیر پر سے آنگن میں جھانکا۔ اس کے ہونٹوں پر حسب عادت مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ سچ مچ کا غصّہ تو اُسے کبھی آیا ہی نہیں تھا۔ ماتھے پر بناوٹی غصّے کے بل ڈال کر بولی: "کیا ہے بھئی!"

پالی نے چڑانے کے لیے کہا "ہوتا کیا......... دن ہے۔"

"ہائے رے کہاں جاؤں میں؟"

"یہ ہائے رے کیسی؟"

"تو پھر؟"

"کیا ہم نے جھوٹ کہا ہے۔"

"اچھا بابا دن ہے تو بتاؤں پھر میں کیا کروں؟"

"نیچے آؤ۔"

"نیچے کہاں؟"

"بھائی چھت سے نیچے آنے کے لیے کہہ رہے ہیں۔"

تاباں چمک کر بولی: "پھر بکنے لگے آنے دو ماں کو۔"

"نہیں بھابی تمہیں قسم ہے .... ماں سے کچھ نہ کہنا...... اب آ بھی چکو۔"

"ذرا بات کر لوں۔"

"ہم بھی بات ہی کریں گے۔"

"کیوں میرا بھیجا چاٹتے ہو۔ مفت میں...."

"واہ بھابی! ہم اس چاؤ سے بلا رہے ہیں اور تم..."

"میرا اچھا بھیا—— میں ذرا سی بات کر لوں ...... ابھی آتی ہوں۔"

پالی بچوں کی طرح مچل گیا: "نا بھئی ہم نہیں..... تمہیں قسم ہے۔"

مگر اب تاباں چھت کی پرلی طرف پڑوسن کے قریب پہنچ چکی تھی۔ پالی جانتا تھا کہ اس کی ذرا سی بات کتنا وقت لے گی۔ پر اسے زیادہ دیر تک انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ڈیوڑھی کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور اس کے ساتھ اس کی ماں آنگن میں داخل ہوئی اور چھوٹتے ہی بولی: "تیری بھابی کہاں ہے؟"

"چھت پر۔"

"چھت پر؟"

"ہاں..... بہت دور نہیں چھت پر ہی ہے....."

ماں بگڑی: "چھت پر تو ہے۔ پر میں پوچھتی ہوں۔ کیا ہو رہا ہے وہاں....؟"

"باتیں ہو رہی ہیں۔"

"باتیں..... ارے باتیں؟"

"ہاں...... کیوں؟"

"لو اور سنو۔ بھلا باتیں کرنا بھی کوئی کام ہے؟"

"مجھ سے پوچھتی ہو؟...... اسی سے پوچھو۔"

"آنے تو دو۔"

"آ چکی وہ؟"

"کیوں پڑوسن کے وہاں پکا ڈیرہ ڈال دیا ہے کیا؟"

"معلوم تو یہی ہوتا ہے۔"

"آخر بات بھی تو ہو کوئی"

"بات کیا...... دو گھنٹے سے تو میں انتظار کر رہا ہوں.... ضرور کوئی کھاس بات ہے"

سنداں کو تعجب ہوا "دو گھنٹے سے؟"

"اور نہیں تو کیا"

اتنے میں لہنا سنگھ بھی آ گیا۔ اُس نے یہ بات سن لی۔ اب سنداں سے نہ رہا گیا "اری تاباں تاباں!"

لہنا سنگھ نے سر سے پگڑی اتار کر اُسے جھاڑا اور پھر اسے پرے چارپائی پر پھینکتے ہوئے بولا "کئی بار کہہ چکا ہوں اس چڑیل سے کراتی باتیں نہ کیا کر۔ گھر کا کام کیا کر"

پالی نے جلتی پر تیل ڈالا "نہ جانے کب سمجھاتے ہو اس کے سامنے تو بھیگی بلی بنے رہتے ہو"

یہ الزام سن کر ایک بار تو لہنا سنگھ کو تاؤ آ گیا۔ لیکن اُس نے پالی سے کچھ کہا نہیں۔

سنداں نے پھر ہانک لگائی "اری تاباں"

آخر تاباں جلدی جلدی کھٹ پٹ کرتی سیڑھیوں سے نیچے اتری۔

سنداں بھری پڑی تھی۔ اس کے آتے ہی برس پڑی "موئی کیا مزا ملتا ہے تجھے باتیں کرنے میں۔ جب دیکھو دو دو گھنٹے باتیں ہی کرتی چلی جاتی ہے"

تاباں بھی گرما گئی "کب...... میں کب دو دو گھنٹے باتیں کرتی ہوں.... تمہارے جو منہ میں آتا ہے بک دیتی ہو"

اب لہنا سنگھ نے شوہرانہ حقوق کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا "تیری زبان کیسے چلتی ہے ری۔ ذرا کام کی بات کہہ دو تو مرچیں لگتی ہیں؟"

"مجھے مرچیں کیوں لگیں"

اس پر لہنا سنگھ نے آگے بڑھ کر دھمکایا "یاد رکھیو زبان کھینچ لوں گا منہ

سے"

یہ دیکھ کر سب بغیر معقول وجہ کے اس پر پل پڑے ہیں۔ تاباں کی آنکھیں پُرآب ہوگئیں۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی "کاٹ کر کھا لو مجھے۔ دن بھر کام کرتے کرتے کمر ٹوٹ جاتی ہے۔ دو گھڑی کسی سے بات کر لی تو سب کے سب سر پر سوار ہو گئے۔

یہ کہہ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتی وہ دُھلے ہوئے کپڑے رسی پر پٹخ کر سب سے اندر والے کمرے میں گھُس گئی اور دھڑام سے پلنگ پر جا گری۔

لہنا سنگھ نے چارپائی گھسیٹ کر اُس کی پٹی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"عجیب عورت ہے۔ بھلا پوچھو کہ سبھی بال بچوں والی گھر کا کام کاج کرتی ہیں نہ کہ منڈیر پہ چڑھ کر پڑوسنوں سے باتیں کرتی رہتی ہیں"

سنداں اور لہنا سنگھ دونوں بات بڑھانا نہیں چاہتے تھے اس لیے جب پالی بھابی کو منانے کے لیے بھیتر گی اور بڑھا تو ان دونوں نے اطمینان کی کمانس لی۔

اندر والے کمرے میں تاریکی چھائی رہتی تھی۔ نہ کوئی کھڑکی تھی نہ روشندان لے دے کے چھت میں ایک مگھ (سُوراخ) تھا۔ جس میں سے دوپہر کے وقت روشنی آتی تھی۔ پر اب شام ہو چکی تھی اور مگھ کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔

جب وہ ایک دم اندھیرے میں داخل ہوا تو پہلے تو اُسے بالکل کچھ نہ سُوجھا۔ تاریکی میں صرف سسکیوں کی آوازیں آتی رہیں۔

تاباں کو اس بات کا کچھ پتہ نہیں تھا کہ ساری آگ دیور کی لگائی ہوئی تھی۔ اس لیے جب پالی کی آنکھیں مدھم روشنی سے مانوس ہوئیں اور بھابی کے لرزتے ہوئے شانے پر ہاتھ رکھا تو بھابی نے اعتراض نہیں کیا۔ پالی نے بھولپن سے کہا "بھابی!"

وہ سسکیاں بھرتی رہی۔

"بھابی؟"

اُس نے پھر بھی جواب نہیں دیا۔

تب اُس نے بھابی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اُس نے ہاتھ نہیں کھینچا۔ جس
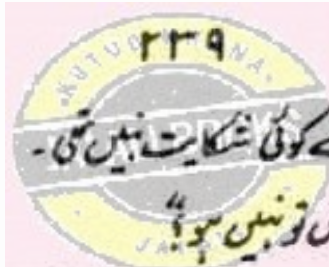
سے ثابت ہوا کہ اُسے پاآں سے کوئی شکایت نہیں تھی۔

"بھابی! تم مجھ سے ناراض تو نہیں ہو؟"

جب اس بار بھی بھابی نے جواب نہیں دیا تو پاآں نے کہا۔ "دیکھو بھئی تم ہم سے بیکار ہی خفا ہو۔ ہم نے تو کچھ نہیں کہا۔ کوئی غلطی ہو تو ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتے ہیں۔"

اس پر بھابی نے اس کا ہاتھ نرمی سے دبا دیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ پاآں سے اسے کوئی شکایت نہیں۔ پاآں نے لاڈ سے مچل کر کہا: "بھئی کہہ دو کہ تم ہم سے خفا نہیں ہو۔"

وہ چُپ۔

"بھئی ہم یوں نہیں مانیں گے .... منہ سے کہو کچھ۔"

بھابی نے انکار کے طور پر سر ہلا دیا۔ جیسے بھولے دیور سے بھابی کیوں ناراض ہونے لگی۔ اس طرح پاآں باتوں کے چمتکار دکھاتا رہا اور ان باتوں کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا۔ پاآں آخر تاباں پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ "دیکھو تو تمہارے تو سامنے ہی ساری بات ہوئی ہے۔ جب دیکھو ہوا کے گھوڑے پر سوار۔ خود کھیتوں کو چلے جاتے ہیں، ماں گھر گھر گھومتی ہے۔ سب کام میں نبٹاتی ہوں۔ پھر بھی یہ کاٹ کھانے کو دوڑتے ہیں ......" تاباں نے یہ بات بڑے اُونچے لہجے میں کہی تاکہ ان دونوں کے کانوں تک پہنچ جائے لیکن اُس کے تو خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ بات کا بتنگڑ بن جائے گا۔ کان دبائے چُپ چاپ سُنی اَن سُنی کر رہے تھے۔ پاآں نے بھابی کو ہمت دلاتے ہوئے کہا۔ "واہ بھابی! کسی کی مجال ہے گھر میں گھر میں کیا گاؤں بھر میں ...... جو تمہاری طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھے۔ ہم بھلا کس روگ کی دوا ہیں؟"

ان باتوں سے تاباں کی ہمت ہی نہیں بڑھی بلکہ وہ خوش بھی ہوئی۔

"اچھا بھئی اب یہ رونا دھونا بند کرو۔ تمہاری آنکھیں تو پہلے ہی سے دُکھتی ہیں۔ رو رو کر اور خراب نہ کرو۔"
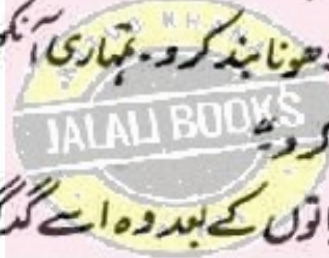
اس قسم کی چکنی چپڑی باتوں کے بعد وہ اسے گدگدانے لگا۔ یہاں تک کہ وہ

کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ گھر کی رانی کی آواز سن کر لبنے اور سنداں کی جان میں جان آئی۔

سنداں نے چو کے برتن کی طرف تو دھیان دینا ہی چھوڑ دیا تھا۔ کبھی کبھار کڑچھی ہاتھ میں اُٹھا لے تو خیر! اب کے بھی اُس نے کڑچھی ہانڈی میں گھمانی شروع کر دی۔ ساتھ ہی اُونچی آواز میں اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی۔ اتنے میں بچے نے پاس آ کر کہا: "ماں ماں ہمیں آٹے کا تو تا بنا دو۔"

"بھئی تمہاری بے بے ہی بنائے گی..... آئے تو اسی سے کہنا۔"

اتنے میں تاباں بھی آ پہونچی۔ سنداں اور لبنے نے ایسی صورت اختیار کی جیسے کوئی جھگڑا ہی نہ ہوا ہو۔ بلکہ بچوں کے ساتھ مل جُل کر فضا کو خوشگوار بنا دیا۔ تاباں کو دیکھتے ہی سنداں نے چو کی چھوڑ دی۔ آلو بڑی کی ترکاری پک چکی تھی۔ تاباں نے پتیلا اتار کر آگ دھیمی کر دی اور پہلے سے مل رکھے آٹے کو پھر سے ملنے لگی۔ سنداں کو محفل میں سلجھی پیدا کرنے کے لئے ایک بات سُوجھی پاس کے مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے بات چھیڑی: "بھئی اس لونڈیا کی باتیں نکلنے لگی ہیں کچھ کچھ۔"

پالی کے کان کھڑے ہو گئے۔

لبنے کو اس قسم کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لیکن چونکہ ابھی ابھی روٹھی بیوی کے من جانے سے اسے خوشی ہوئی تھی۔ اس لئے اُس نے ضرورت سے زیادہ دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا: "کون لونڈیا بے بے؟"

"یہی اپنی سرفوں....."

لبنے نے اونٹ کی طرح گردن آگے کو بڑھا کر کہا: "اچھا ـــ کمال ہے!"

سنداں کو بھی اس قسم کی بات سننے والے کی ضرورت تھی۔ چونچ سے چونچ بھڑا کر بیٹھ گئی۔ رازدارانہ لہجے میں بولی: "وہ ہے نا..... پرتھی پال..... یہی نام ہے نا اس لبھٹیس کا... تو نے دیکھا ہی ہو گا اسے....."

اس پر لبنے نے منہ کھول کر سر ہلایا اور بولا: "نہیں میں نے اسے دیکھا تو نہیں نام سُنا ہے..... ابھی ابھی جب ہم جلیب کھار ہے تھے تو اسی طرح باتیں ہو رہی تھیں۔"

پالی کو تعجب ہوا۔ شاید نواب نے کچھ کہہ دیا ہو۔ حالانکہ اس کو اس سے اس قسم کی قطعاً امید نہیں تھی۔ لبنے کی بات سے سنداں کو اور شہ ملی۔ منہ پھیلا کر کہنے لگی۔ "اچھا تو اب دو کانوں پر بھی باتیں ہونے لگی ہیں؟ بھئی دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔ پالی کا باپو کہا کرتا تھا۔ ۔ ۔"

لبنا بولا۔ "ارے نہیں بے بے تو تو بات سنے بنا ہی اپنی گاڑی چھوڑ دیتی ہے۔"

سنداں کو قدرے غصہ آیا۔ "ارے واہ! تو کچھ ہی تو۔ ۔ ۔"

"کچھ ہی کیا۔ ۔ میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ اس کے بارے میں ادھر اُدھر کی باتیں ہوئیں۔"

"ارے یونہیں۔ ۔ ۔ کہتے تھے بڑا کھب صورت ہے۔ تم جانو لوگوں کو ایسی باتوں کا چسکا ہوتا ہی ہے۔ ۔ ۔ ایسی ویسی کوئی بات نہیں ہوئی۔"

یہ سن کر سنداں کو ناامیدی ہوئی اور وہ بولی "عورتوں میں تو ہوتی ہیں باتیں۔"

تاباں بولی "ہاں عورتوں کا کیا ہے۔ وہ تو یونہی بکنے لگتی ہیں۔"

سنداں بزرگانہ انداز میں بولی "پر بٹیا کوئی نہ کوئی بات تو ہوگی ہی۔ ۔ ۔ بے بنیاد کے بات تھوڑے ہی اڑتی ہے۔"

تاباں نے انگلیوں سے آٹا چھڑاتے ہوئے کہا "کیوں نہیں لوگ تو چاہتے ہیں کہ کسی پر الزام دھر کر خوب نمک مرچ لگا کر باتیں کریں۔"

سنداں کچھ نرم پڑ گئی "اچھا بہو! ہمیں کیا جو کریں گے سو بھریں گے تم کیوں بھئے اُداس۔"

اپنی دانست میں کبیر جی کے اس قول کو دہرانے پر سنداں کو امید تھی۔ تاباں اس کو تعریف کی نظر سے دیکھے گی۔ لیکن تاباں نے کچھ ظاہر نہ ہونے دیا۔ بلکہ کہنے لگی "اور تو کسی سے ایسی ویسی بات نہیں سنی۔ جب سنی تمہارے منہ سے۔ ۔ ۔"

ایسا مایوس کن جواب سن کر سنداں کو غصہ تو آیا۔ لیکن یہ جھگڑے کا موقعہ نہیں تھا نرمی سے بولی "نا بھئی! اسر نوں تو میری بیٹی سی ہے۔ بھلا میں اسے کیوں بدنام کرنے لگی۔ ہاں اپنے گھر میں بات کرنا تو پاپ نہیں۔"

اس پر تاباں کچھ نہ بولی۔ سنداں نے زیادہ صفائی کے لئے بات جاری رکھی "بلکہ اگر کوئی میرے سامنے ایسی ویسی بات کرتا بھی تو میں اس سے یہی کہتی ہوں کہ یہ سب جھوٹ ہے کسی کی اڑائی ہوئی گپ ہے۔"

پالی نے ان کی بے تکی باتوں سے اُوب کر کہا: "ماں! اب کہہ بھی ڈالو کیا بات سُنی ہے تم نے۔ اتنا بکھیڑا کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔"

سنداں نے تاباں اور پالی کی طرف باری باری دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"یہی سُنا ہے کہ دونوں میں میل جول ہے۔"

"دونوں کون؟" جیسے پالی کو یقین نہ آیا ہو۔

"یہی سرنوں اور پرتھی پال ۔ ۔ ۔ ۔"

"شاید ٹھیک ہی ہو لیکن ہے بھی کھب صورت۔" لینے نے رائے دی سنداں نے چمک کر کہا: "خاک کھب صورت ہے۔"

لہنا ڈر گیا: "بھئی میں کیا جانوں ۔ ۔ ۔ ۔ لوگ یہی کہتے ہیں ۔ ۔ ۔ سُنی سُنائی کہدی میں نے۔"

سنداں بالوں کو انگلیوں سے دباتے ہوئے بولی: "چالاک تو ہے مجھے ایسا آدمی بِل کُل اچھا نہیں لگتا ۔ ۔ ۔ مجھے تو وہ کوئے باج نظر آتا ہے۔"

تاباں توا چولھے پر رکھتے ہوئے بولی: "ماں یونہیں بگیر دیکھے بھالے کسی کے بُرے بھلے کا کیا پتا چل سکتا ہے۔"

"ہاں جی، باہگورو ہی جانے۔"

پالی کے دماغ کا سکون ختم ہو رہا تھا بھلا وہ کیسے خاموش رہتا: "ماں! تو کیا کسی نے اسے اس کے ساتھ دیکھا ہے؟"

تاباں کو یہ باتیں بالکل پسند نہیں تھیں اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس قسم کی باتیں ہوں لیکن چونکہ خود پالی ان میں دلچسپی لے رہا تھا۔ اس لئے اس نے ٹوکنا مناسب نہیں سمجھا۔

سنداں بولی: "باہگورو کے بگیر دلوں کا بھید کون جانتا ہے۔ لوگ یہی کہتے ہیں کہ دونوں میں میل جول ہے۔ سرنوں بھی تو ان کے گاؤں جاتی رہتی ہے۔"

تاباں کے دل میں یہ خوف پیدا ہوا کہ کہیں پالی کے دل میں یہ خیال جڑ نہ پکڑ لے۔ بیکار ہی دکھی ہوگا۔ اس لئے اُس نے سنداں کی بات کی تردید کرتے ہوئے کہا: "ان کے گاؤں تو وہ ہمیشہ سے جاتی ہے۔ پہلے تو کبھی کوئی بات نہیں اُٹھی ۔ ۔ ۔"

سنداں نے کہا: "اور وہ بھی تو ان کے یہاں آتا ہی ہے۔"

"تو کیا سرنوں کے ماں باپ اندھے ہیں۔ انھیں بھی تو پتہ ہی ہو گا۔"

"بھئی جو کچھ بھی ہو جب تک کچھ گڑبڑ نہ ہو۔ لوگ باتیں نہیں بناتے۔"

تاباں نے آٹے کا پیڑا بناتے ہوئے جواب دیا "اصل بات تو یہ ہے کہ لوگ ان سے جلتے ہیں۔ ان کے پاس کچھ دھن ہے۔ لوگ انھیں دیکھ نہیں سکتے۔"

یہ بات سنداں کے دل میں بھی پوشیدہ تھی۔ اس نے کانوں کو ہاتھوں سے چھوتے ہوئے کہا "نہیں جی نہیں ہمیں کیا پڑی ہے جو ان سے جلیں ہمیں کس بات کی کمی ہے؟"

تاباں نے روٹی توے پر اُلٹا دی۔ "نہیں ماں، میں تمہیں نہیں کہہ رہی ہوں۔ میں تو اوروں کی بات کر رہی ہوں۔"

سنداں نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا "ہاں اوروں کے بارے میں ہم نہیں کہہ سکتے۔"

تاباں نے دو چار روٹیاں پکالی تھیں۔ بچوں سے بولی "آؤ بیٹا! تم لوگ کھالو۔" اور پھر ساس سے مخاطب ہوئی۔ "ہاں ماں! سرنوں بڑی ہنسوڑ ہے اور وہ پھینبن بھی ہنس کر بات کرتا ہے ہر کسی سے۔ اس طرح کے آدمیوں پر سبھی لوگ جھٹ شک کرنے لگتے ہیں۔"

تاباں اپنی دانست میں پالی کی بھی ڈھارس بندھا رہی تھی — تھوڑی دیر تک خاموشی طاری رہی۔ پھر نہ جانے لبھنے کو کیا سوجھی "یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جنداں اُن دونوں کی شادی کرنا چاہتی ہو۔"

سنداں بگڑ کر بولی "کیا رکھا ہے اس بندر ریں۔"

تاباں کو سنداں کی اس بات پر تعجب ہوا۔ پر تھی پال ایسے بانکے نوجوان کو بندر کہنا انتہائی حماقت تھی۔

لبھنے نے اپنی دانست میں بڑی دُور کی بات کہی "شکل سے بندر ہی ہو گا کون جانے نرنجن سنگھ کو روپے کا لالچ ہو۔ لوبھ بھی تو بُری بلا ہے۔"

ان سب باتوں کا پالی کے دل پر بُرا اثر ہُوا۔ روپے والی بات سُن کر اُس کے دل پر چوٹ سی لگی۔ جب سے وہ گاؤں آیا تھا۔ اُس نے جنداں سے جھوٹ ہی کہہ دیا تھا کہ وہ زمین خریدے گا۔ حالانکہ اس کی جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ ممکن ہے ان کی اس پر پہلے نظر ہو۔ لیکن اب شاید زمین خریدنے کی بات ڈھکوسلا سمجھ کر اُنھوں نے اپنا ارادہ

بدل دیا ہو اور پر تھی پال بہتر نظر آنے لگا ہو۔

بالی کے ذہن میں کئی خیالات آئے اور چلے گئے۔ وہ بیتے دنوں کی یاد سے پچھتانے لگا۔ اگر وہ ذرا سنبھل کر خرچ کرتا تو آج اُس کے پاس کافی بڑی رقم ہوتی۔ لیکن اُس نے روپے کو روپیہ نہ جانا مٹی جانا . . . . .

اتنے میں ڈیوڑھی کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور پھر گائے کے گلے کے گھنگھرو بج اُٹھے۔

وہ ڈیوڑھی کی جانب دیکھنے لگے۔ وہاں چنتو نظر آئی۔

سنداں نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ "آؤ بہن!"

لبنا نے سرک کر چارپائی پر اس کے بیٹھنے کیلئے جگہ چھوڑ دی۔ چنتو بیٹھتے ہوئے بولی۔ "کہو بہن تاباں! کیا حال چال ہے؟"

تاباں کو چنتو سے چڑ تھی۔ اُس نے دھیرے سے یہ کہہ کر ٹال دیا:

"آنند سے ہوں بہن۔"

"بہن سنداں! تم کہو . . . . چین کی بنسری بج رہی ہے نا؟"

سنداں کو اس سے چڑ نہیں تھی۔ بڑے پریم سے بولی۔ "تمہاری کرپا ہے بہن! . . . چین کی بنسری تو بھلا کیا بجائیں گے۔ بس جیے جاتے ہیں۔"

"ہاہاہا!" چنتو نے قہقہہ لگایا۔ "بہن! مجھے ذرا جلدی جانا ہے۔ باتیں پھر کبھی ہوں گی۔ گھر سے مٹی کا تیل لینے آئی تھی۔ دکان بند ہے۔ اگر تیل ہو تو ایک تہائی اس بوتل میں بھر دو۔ کل لوٹا دوں گی۔"

سنداں اندر سے تیل کی بوتل اُٹھا لائی اور تیل چنتو کی بوتل میں ڈال دیا۔ چنتو اُٹھتے ہوئے بولی۔ "تم نے دروازے کے پاس ہی تو گائے باندھ رکھی ہے۔ آنے جانے والے کو مارنے کو دوڑتی ہے۔"

سنداں نے جواب دیا۔ "اس کے سینگ آگے تک نہیں پہنچتے۔ کھونٹے سے بندھی ہوتی ہے بے فکر رہو۔"

"نہیں بابا! . . . چلو بالی! مجھے دروازے سے باہر چھوڑ آؤ۔"

بالی کسلمندانہ انداز سے گھٹنوں پر ہاتھ ٹیک کر اُٹھا۔

"ڈرپوک کہیں کی۔"

ڈیوڑھی میں پہنچ کر معاً چنتو رُک گئی اور پھر پاگی کے کان کے پاس مُنھ لاتے ہوئے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "تیل ویل کا تو بہانہ تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ تمہیں جوآلا سنگھ نے بلایا ہے . . . اور سنو، میں ڈرپوک نہیں ہوں تم سے بات کرنے کو کوئی حیلہ تو ہونا ہی چاہیئے تھا۔"

پاگی کو یہ سُن کر اور اُس کی چمکتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر عجیب قسم کا احساس ہُوا۔ اُس نے بھانپ لیا کہ اُسے کس غرض سے بُلایا جا رہا ہے۔ اُس نے چاہا کہ صاف انکار کر دے۔ "کیسا کام ہے؟"

وہ چُپ رہی۔

"پھر بھی . . . . تمہیں تو معلوم ہی ہوگا۔"

چنتو نے مردانہ انداز میں سر پیچھے کی جانب جھٹک کر اس کی جانب بھرپور نظروں سے دیکھا اور پھر ہلکا سا قہقہہ لگایا — "بس یہ سمجھ لو تمہاری شان کے شایان کام ہے۔"

انکار کے الفاظ پاگی کے ہونٹوں تک آتے آتے رہ گئے۔

"اچھا۔"

"تو کب آؤ گے؟"

"تم ہی بتاؤ۔"

"جلد از جلد۔"

"کیوں کوئی گڑبڑ ہے کیا؟"

"نہیں نہیں۔ گڑبڑ کوئی نہیں۔ ابھی تو بات ہی کرنی ہے۔"

"تو میں کھانا کھا کر آجاؤں گا۔"

"ضرور۔"

"ضرور۔"

۱۰

چنتو کو رخصت کر کے پالی صحن میں آیا تو اس وقت گفتگو کا موضوع بدل چکا تھا۔ لیکن پالی ابھی تک انہیں خیالات میں گم تھا۔ اُس نے سوچا، ممکن ہے سرتوں کی بابت افواہیں غلط ہی ہوں۔ لیکن اگر اس کے والدین کی نظر بری تھی پالی پر ہُوئی تو پھر بھلا سرتوں کو بھی کیا اعتراض ہوگا اور اگر اعتراض ہو بھی تو وہ کیا کر سکتی ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ اگر سرتوں ان حالات سے بچنے کے لئے گھر سے بھاگ جانے پر آمادہ ہو تو وہ اسے بڑی خوشی سے بھگا کر لے جائے گا۔ یہاں سے سیدھا کلکتے پہنچ جائے۔ کوئی اچھا سا دھندا شروع کر دے۔ جس میں گرفتاری اور جیل کا ڈر نہ ہو۔ ایک چھوٹا سا گھر ہو اور بس وہ ہو اور سرتوں۔

دوسرے لمحے میں پالی کا ذہن دل کی ان حماقتوں پر ملامت کرنے لگا۔ اس نے سوچا کہ اگر سرتوں یا اس کے والدین کو اس کے ان خیالات کا علم ہو جائے تو وہ اس سے یقیناً بہت متنفر ہو جائیں۔ سرتوں بچاری کو ان باتوں کی کچھ ہوش ہی نہیں۔ توبہ! اسے اپنے خیالات دُرست رکھنے چاہئیں۔ بار بار اس کا ذہن اُلٹی سیدھی باتوں کی طرف کیوں منتقل ہو جاتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی اُس کے خیالات حقائق کی طرف منتقل ہو گئے۔ سرتوں نے ابھی تک اس سے محبت کا اظہار یا اقبال نہ کیا تھا۔ اس کی حرکات سے کچھ اندازہ نہ لگ سکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا تھا کہ اسے اس سے نفرت نہیں تھی۔ لیکن نفرت نہ ہونا ہی کافی نہیں محبت کا ہونا بھی لازمی ہے۔ پھر اسے یاد آیا کہ دیوالی کی رات جب وہ اسے ملنے کے لئے آئی تھی اور جب تنہائی میں اُس نے اُس سے کہا تھا کہ میرے پاس تمہاری اور تمہارے پاس

میری نشانی ہونی چاہیئے تو اس نے اس بات کا کچھ بھی جواب نہیں دیا تھا۔ حالانکہ اس میں سوچنے کی بات بھی کچھ نہیں تھی۔ وہ اس بات پر شرمائی بھی نہیں بھابی کے وہاں پہنچنے سے پہلے اس کے پاس جواب کے لئے وقت بھی بہت کافی تھا۔ پر نہ معلوم اُس نے جواب کیوں نہیں دیا اور پھر ذرا سا خفا ہو جانے پر کس قدر اُداس دکھائی دیتی تھی۔ عجب لڑکی تھی۔ اس کی باتوں اور حرکات سے کچھ پلے نہ پڑتا تھا۔ اسے بہت کوفت ہو رہی تھی۔ دماغ عجیب مخمصے میں گرفتار تھا۔ اس کی بھابی نے اسے سوچ بچار میں گم دیکھا تو روٹی کی تھالی اس کے آگے کھسکاتے ہوئے بولی:

"کیا سوچ رہے ہو؟"

تاباں لمحہ بھر اس کے چہرے کی طرف مشکوک نظروں سے دیکھتی رہی۔ پھر سرگوشی میں بولی:

"دیکھو بے بے کی باتوں میں آکر وہم میں مت پڑنا۔ وہ تو یونہی آئیں بائیں شائیں بکتی رہتی ہے۔"

"اوہ نہیں بھابی! تم کچھ خیال مت کرو۔ میرے دل میں کوئی شک پیدا نہیں ہوا۔"

بچاری تاباں کو بڑی ہمدردی تھی اس سے۔ آخر اس کے دُکھ درد کا بھی تو وہی ایک ساتھی تھا۔ وہ اس سے بہت محبت کرنے لگی تھی۔ وہ اسے بزرگ بھی سمجھتا تھا اور اس کا لحاظ بھی تھا۔ پاآی کے جواب سے اسے مکمل طور پر تسکین حاصل نہیں ہوئی۔ گو اس وقت گفتگو کرنے سے احتراز کر رہا تھا۔ اس نے اسے مزید تسلی دینے کے لئے کہا:

"میں کل جاؤں گی سرلوں کے پاس اور پتہ لگاؤں گی کہ یہ بات کہاں تک درست ہے۔"

پاآی نے شکایت آمیز لہجے میں کہا:

"تمہیں تو کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔"

تاباں نے خطاوارانہ نگاہوں سے پاآی کی طرف دیکھا اور قدرے سکوت کے بعد بولی:

"میں تو ہمیشہ ٹوہ میں رہتی ہوں۔ پر پاآی تمہارے سر پر بھی تو گھتنا سوار ہے نا . . ."

سنداں نے انھیں کانا پھوسی کرتے دیکھ کر ذرا بلند آواز میں کہا:

"کیا بات ہے آج تو بھابی دیور بہت سر جوڑ کر بیٹھے ہیں۔"

اس پر دونوں نے باتیں بند کر دیں اور تاباں، سنداں سے مخاطب ہوئی:

"باتیں کیا . . . کہتا ہے سر میں درد ہو رہا ہے . . ."

"اچھا؟"

بچاری سنداں نے اُٹھ کر اُس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور پھر سہمے ہوئے بولنے لگی۔

پالی نے بھابی کی طرف قدرے کڑوی نظروں سے دیکھا کہ مُفت میں مصیبت اس کے گلے میں ڈال دی۔

تاباں کہہ کر پچھتائی لیکن جلدی میں اسے اور کوئی بات ہی نہ سُوجھ سکی۔

لہنے نے شاید کبھی علی اصغر حکیم کی زبانی یہ بات سُنی ہو گی۔ اب حکمت جھاڑنے کا موقعہ ہاتھ سے کیوں کر جانے دیتا۔

"کبھی سے بھی سر درد ہونے لگتا ہے۔ کھیر اُتی کی دکان سے ہڑ کا مربہ لے آؤ۔ یا جے مل کے ہاں سے گلقند لا کر گرم گرم دودھ کے ساتھ کھا ڈالو۔ کل صبح پیٹ ہلکا ہو جائے گا۔۔۔"

پالی نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا:

"سر سے پیٹ کا کیا متبل؟"

لہنا بچارا بھی کچا حکیم تھا۔ دب کر بولا:

"یا گور و جانے۔۔۔ ہمیں کیا ملوم۔ علی آشگر کہتا تھا۔۔۔ اسی سے سُنا ہے میں نے۔۔۔"

دفعتاً پالی کو خیال آیا کہ اسے باہر بھی جانا ہے یہ نہ ہو کہ ماں اسے لیٹنے پر مجبور کر دے۔ بولا:

"ہاں تو پھر ٹھیک ہو گا۔ روٹی کھا کر لے آتا ہوں۔ ہڑ کا مربہ۔۔۔"

سنداں نے رائے دی۔

"بیٹا تو لیٹ رہیو۔ لہنا لا دے گا ہڑ کا مربہ۔۔۔"

لہنا تھکا ہارا آیا تھا۔ اس کا باہر جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے وہ چُپ رہا۔ لیکن جب سنداں نے کہا کہ لہنا ان باتوں میں بہت سیانا ہے اسے اچھے بُرے مُربے کی پہچان بھی ہے تو لہنے نے پندرہ بیس قدم جانے میں چنداں حرج نہ سمجھا۔ کہنے لگا:

"ہاں پالی بھیا تو لیٹ رہو۔ میں ہی لا دیتا ہوں۔"

پالی قدرے کرخت لہجے میں بولا:

"بے بے، تو مجھے بل کل بچہ سمجھتی ہے۔ میں خود ہی لے آؤں گا جر اکھلی ہوا بھی کھا

آؤں گا۔ لہنا بچارا اب تھک تھکا کر واپس آیا ہے۔ اب پھر بھگا دو بچارے کو۔۔۔ اب لیٹا رہنے دو اسے۔ لڑکوں بالوں سے بات چیت کر کے دل بہلائے گا اپنا۔"

یہ سن کر لہنا مسلسل ڈاڑھی کھجلانے کی بجائے لڑکوں بالوں سے بات چیت کر کے دل بہلانے لگا۔

اب سب لوگ چپ ہو گئے اور اس قدر گہری خاموشی طاری ہو گئی کہ پاآل کو اپنے منہ کے ہلنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور پھر جب سب لوگ آپس میں بات چیت کرنے لگے تو وہ ذہنی طوفان سے بہت دور ایک مرتبہ پھر اپنے خیالات میں کھو گیا۔

ایک مرتبہ پھر بھابی سے لے کر پرتھی پال اور سرنوں تک سب اس کے ذہن میں گھوم گئے۔ اسے بھابی سے امید نہیں تھی کہ وہ سرنوں کے دل کا پتہ لگا سکے گی۔ اسے سرنوں اور پرتھی پال سنگھ کی بابت خود ہی غلط فہمی پیدا ہو چکی تھی۔ بھلا ایسی حالت میں وہ ان کی حقیقت کیونکر سمجھ سکتی۔ سچ پوچھئے تو اس میں اس کا قصور بھی کیا تھا آخر وہ خود بھی سرنوں کی بابت قطعی طور پر کچھ کہنے سے قاصر تھا۔ اس جگہ پہنچ کر پاآل کا دماغ متضاد قسم کے خیالات میں گڈمڈ ہو کر رہ گیا اور خیالات کی رو بے حد تیز اور بے تکی تھی۔ اس ذہنی خلفشار میں اسے ایک نہایت مدھم لیکن واضح آواز آئی۔ کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ سرنوں کے خیالات سے بے نیاز ہو کر اس کے والدین کا دل اپنی مٹھی میں لے لے۔۔۔۔۔

اس مقام تک پہنچ کر اس کے ذہن کو بڑی تکان کا احساس ہوا اور اس نے سوچنا بند کر دیا اور منہ میں پانی بھر کر انگلی سے مسوڑھوں کو مل مل کر زور زور سے کلیاں کرنے لگا جانے سے پہلے اس نے پگڑی کے اندر دو انگلیاں داخل کر کے کنپٹیوں کے باہر کو نکلے ہوئے چند بالوں کو اندر داخل کیا۔ تہبند کے پلو دوبارہ کس کر باندھے اور جوتوں کو پاؤں کے پنجوں میں پھنسا کر زور زور سے جھاڑا اور پھر ڈیوڑھی میں سے ہوتا ہوا گلی میں نکل آیا۔

چاندنی رات تھی۔ خاموش گلیوں میں کچے مکانوں کے سایوں اور چاند کی دودھیا روشنی کا تضاد آنکھوں کو بہت بھلا دکھائی دیتا تھا۔ دو چار کتے اسے دیکھ کر بھونکنا بند کر کے دم ہلانے لگے۔ وہ اس کی صورت سے مانوس تھے اسے چور اچکا یا ڈاکو نہیں

سمجھتے تھے۔

رہٹ پر کچھ رونق تھی۔ پالی ڈرا کہ کہیں کوئی دوست موجود نہ ہو۔ مبادا پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے۔ حالانکہ اس بات کا امکان بہت کم تھا۔ وہ تو گاؤں کی پرلی طرف اندھے کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھے اس کا انتظار کرتے ہوں گے۔ جو لوگ موجود تھے۔ ان سے مسکراہٹوں اور سر کی جنبشوں کا تبادلہ ہوا اور وہ بخیر و عافیت آگے نکل گیا اور احتیاطاً پہلے وہ سیدھا کھیتوں کی طرف چلا گیا اور پھر ایک طویل چکر لگاتا ہوا جوالا سنگھ کے گھر میں داخل ہو گیا۔

صحن کے احاطے میں خراس چل رہا تھا۔ بوڑھی سانڈنی سست قدموں کے ساتھ ایک دائرے میں گھوم رہی تھی۔ خراس کو چلتے دیکھ کر اسے شک گزرا کہ جو کہیں گیہوں پسوانے والوں نے اسے دیکھ کر پہچان لیا تو اُس کے حق میں اچھا نہ ہو گا۔ گھر سے باہر کوئی اسے جوالا سنگھ کے ساتھ بات چیت کرتے دیکھ لے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ لیکن کسی کا اسے ان کے گھر کے اندر دیکھ لینا مناسب نہیں تھا۔ بھائی بہن کی بابت جو افواہ اڑی ہوئی تھی۔ اُس نے انھیں قدرے بدنام کر دیا تھا لیکن وہ بہت پرانی بات ہو چکی تھی۔ اب تو چنتو کی عمر بھی ڈھل گئی تھی۔ اس لئے اس بات کا خیال بھی لوگوں کے دلوں سے اتر چلا تھا۔ پالی کو زیادہ خوف تھا تو سرنوں کے گھر والوں کا۔ نظاہر ان کی زبانی بھی اُس نے کبھی جوالا سنگھ کی بُرائی نہیں سُنی تھی۔ لیکن یونہی اس کے دل میں یہ خیال جڑ پکڑ گیا تھا کہ جوالا سنگھ سے اس کے گہرے تعلقات کو وہ پسندیدگی کی نظروں سے نہ دیکھیں گے۔ اس لئے اس باب میں جتنی بھی احتیاط کی جائے بہتر ہے۔

شکر کا مقام تھا کہ جو لوگ گیہوں پسوانے کے لئے آئے ہوئے تھے وہ ان کے گاؤں کے آدمی ہی نہیں تھے اور ان لوگوں نے سوائے اس بات کے کہ ایک لمبا تڑنگا جوان ان کے قریب سے ہو کر باہر کے احاطے میں سے گزرتا ہُوا اندرونی صحن میں داخل ہو گیا ہے اور کسی بات پر دھیان نہیں دیا۔

صحن میں ایک طرف موسم برسات اور موسم سرما کے لئے باورچی خانہ بنا ہُوا تھا۔ باورچی خانے کے دو طرف اُونچی دیواریں تھیں اور باقی دو اطراف بالکل کھُلی تھیں۔ صحن میں چھاج اچنے چھاننے والی بڑے اور آٹے چھیدیوں والی چھلنی اور چرخہ وغیرہ بے ترتیبی سے پڑے تھے۔ ایک کتے کو زمین پر زور زور سے دُم پٹختے دیکھ کر پالی نے کسی اور طرف دیکھے بغیر

سمجھ لیا کہ ابھی گھر کے لوگ چرکے میں بیٹھے روٹی کھا رہے ہیں۔ چنانچہ وہ اسی طرف کو چلا گیا۔ آرے میں سرسوں کے تیل کا چراغ تھا اور اس کی ٹمٹماتی ہوئی مدھم روشنی میں کمبلوں اور کھیسوں میں لپٹی ہوئی چند صورتیں دکھائی دیں۔ وہ تو انھیں پہچان نہ سکا لیکن اُسے دیکھتے ہی گویا ان بے جان سایوں میں زندگی کے آثار نظر آنے لگے۔

"باگورو جی کا کھالصہ" آواز آئی۔

"سری باگورو جی کی پھتح"

پالی نے جواب دیا۔

بہت قریب پہنچ کر پالی کو معلوم ہوا کہ جنتو چولھے کے آگے بیٹھی ہے اور چارپائی پر جوالا سنگھ کے علاوہ دو آدمی اور بیٹھے ہیں۔ جن میں سے ایک ابھی روٹی کھا رہا تھا۔

اُنھوں نے اسے دیکھتے ہی اس کے بیٹھنے کے لئے چارپائی پر جگہ چھوڑ دی۔

جوالا سنگھ نے للکار کر کہا:

"سناؤ بیٹا پالی! بہت کم ملتے ہو..... علوم ہوتا ہے کہ کچھ ناکھش ہو ہم سے نہیں؟"

پالی نے مدھم روشنی میں جوالا سنگھ کے چہرے کو واضح طور پر دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے ہنس کر جواب دیا۔

"نہیں چاچا بھلا کبھو تم سے ناکھش بھی ہو سکتا ہوں میں....؟"

"تو پھر آتے نہیں کبھی...."

"یونہی کچھ ادھر اُدھر کے دھندوں میں پھنسے رہتے ہیں۔"

جوالا سنگھ نے ہاتھ بڑھا کر اس کی پیٹھ پر دھمو کا دیا پیار سے۔ اور بلغم میں پھنسی ہوئی آواز میں گڑگڑایا۔

"اچھا بیٹا اب اپنے چاچا کو بھی چکمے دینے لگے۔ یاد رکھ تو ہمارے ہاتھوں میں پلا ہے..."

پالی نے یقین دلانے کے لہجے میں کہا:

"سچ چاچا.... چکمہ کیسا"

"واہ رے پالی.... شاباش شاباش.... بھلا بتا تو تجھے کام ہی کیا ہے.... کیوں کسی کی لنگوٹی بھگانے جانے کی چکر میں تو نہیں ہوتا"

"باہگورو! باہگورو!!"

بابی نے گویا اس قسم کے کاموں سے اپنی قطعاً لاتعلقی کا اظہار کیا۔

اس دوران میں اس نے دیگر دو آدمیوں کو پہچاننے کی کوشش میں ان کی طرف بڑے غور سے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔

چنانچہ جوالا سنگھ نے حقیقتِ حال تاڑ کر بادل کی گڑگڑاہٹ کے مانند قہقہہ بلند کرتے ہوئے کہا۔

"ارے انھیں پہچانتے نہیں ... ہوہوہو ... بھائی یہ ہے جیل سنگھ اور ادھر وہ ساوھو سنگھ روٹی کھا رہا ہے ..."

بیشک بھاری چٹان کی مانند بیٹھا ہوا شخص سوائے جیل سنگھ کے اور ہو بھی کون سکتا تھا۔ اسے ایک مرتبہ دیکھ کر زندگی بھر اس کی صورت بھلانا ناممکن تھا اور وہ بھی یقیناً اسے پہچان لیتا۔ لیکن تاریکی کی وجہ سے نہ پہچان سکا۔ اپنی پوزیشن صاف کرنے کے لئے اس نے کہا:

"نہیں میں جیل سنگھ کو خوب اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ پر جراغ نار روشنی کم ہے نا۔ یوں میرے دل میں شک تو تھا کہ ہو نہ ہو یہ جیل سنگھ ہے۔"

اب کے جوالا سنگھ ہنسا تو اس کے یہ بڑے گول گول کندھے آواز کے زیر و بم کے ساتھ لرزتے رہے۔ نہ معلوم اس میں ہنسنے کی کیا بات تھی۔ چنتو کی طرف بازو پھینک کر بولا:

"سنتی ہو چنتو! جرا دیوا (چراغ) ادھر کرو جیل سنگھ کے منہ کی طرپھ۔"

جیل سنگھ بھی ہنسنے لگا۔ اس نے اپنے جسم کے گرد لپٹے ہوئے چار خانوں کے کھیس کے اندر ہی اندر بے چینی سے پہلو بدل کر کہا:

"دیوا ادھر لانے کی کیا جرورت ہے۔ میں ہی دیوے کی طرپھ منہ کئے دیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے روشنی کی طرف چہرہ بڑھا دیا۔

جوالا سنگھ بولا:

"کیوں بھائی دیکھ لیا۔"

"ہاں چاچا دیکھ لیا۔"

"آگے کو تو نہ بھولو گے؟"

"بھولا تو اب بھی نہیں تھا، پر اس کا منہ تھا جرا اندھیرے میں۔ ۔ ۔ ۔"

"اجی بھائی جیل سنگھ دیوے کی طرف منہ کر لو۔ ایک بار پھر۔"

اس پر سب لوگ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

ہنسی کی ان آوازوں میں جوالا سنگھ کی آواز ایک مرتبہ پھر بلند ہوئی

"اس کھشی میں دونوں ہاتھ تو ملا لو۔"

ان دونوں نے ہاتھ ملائے۔ سادھو سنگھ کھانا کھا رہا تھا۔ اس لئے اس نے داہنے کی بجائے بایاں ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

جوالا سنگھ نے اب ذرا سنجیدہ بن کر دریافت کیا۔

"کہو گھر کے لوگ تو اچھی طرح سے ہیں نا؟"

"ہاں سب اچھے ہیں"

"۔ ۔ ۔ تمہاری بھابی اور اس کے بال بچے؟"

"سب ٹھیک ٹھاک ہیں"

جوالا سنگھ نے جہاندیدہ بزرگوں کے سے لہجے میں کہا:

"ہے نا بے تکی بات۔ ایک گاؤں کے رہنے والے ہم ان کی کھیریت یوں پوچھ رہے ہیں جیسے وہ کہیں پردیس میں رہتے ہوں۔ ۔ ۔ ۔ لہنا تو کھیر کام میں جٹا رہتا ہے۔ اس کی تو بات ہی جانے دو۔ ہاں کبھی راستے میں بھینٹ ہو جائے تو دو باتیں کر ہی لیتے ہیں۔ بھلا کوئی سنداں سے پوچھے کہ آکھر اسے کیا کام پڑے رہتے ہیں۔ ایسے جو کبھی شکل ہی نہیں دکھاتی آن کر۔ ۔ ۔ کے دن ہو گئے ہیں بھلا اس کی شکل دیکھے؟ ۔ ۔ ۔ ۔ کیوں چنتو تجھے تو کھیال ہو گا کچھ۔"

چنتو نے چمٹے سے سلگتے ہوئے اپلے کی راکھ جھاڑتے ہوئے جواب دیا:

"اس پر کیوں دوش دھرتے ہو۔ وہ بچاری تو آج ہی ہی تھی۔ ۔ ۔"

بالی کو ایک لمبی سی جماہی آگئی۔ اس نے جوالا سنگھ کی بے کیف باتوں سے اکتا کر بے معنی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا تھا۔

جوالا سنگھ کچھ اور مطلب سمجھا اور سرک کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ اس کی بغل میں اپنی کہنی سے ٹھوکا دے کر بولا

" کہو کس کی تلاش ہے۔"

پالی نے قدرے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔

" نہیں تلاش کس کی ہوتی مجھے۔"

جوالا سنگھ نے ایسے سر ہلایا جیسے وہ سب کچھ سمجھتا ہے۔

" وہ یہاں نہیں ہے۔"

پالی نے قریب سے جوالا سنگھ کی داڑھی کے گھنے اور کھُردرے بال اور اس کا اندازِ بیان دیکھ کر شرارتاً یونہی کہہ دیا۔

" بس چلی گئی جہاں سے آئی تھی۔"

اب پالی کو معلوم ہو گیا کہ جوالا سنگھ کا اشارہ کس عورت کی جانب ہے اس کی آنکھوں تلے پیارو کی صورت گھوم گئی۔

جوالا سنگھ نے خوب اچھی طرح دانت نمایاں کرتے ہوئے کہا:

" بچاری بہت یاد کرتی تھیں تمہیں۔"

پالی نے قدرے اشتیاق سے پوچھا:

" واقعی بہت یاد کرتی تھی؟"

" تو کیا میں جھوٹ کہتا ہوں۔"

یہ کہہ کر جوالا سنگھ نے منہ قدرے زیادہ اُوپر کو اُٹھا دیا اور اُس کے نتھنوں کے غلیظ بال نمایاں ہو گئے۔

پالی کو پیارو کی صورت یاد آئی تو دل کو کچھ کچھ ہونے لگا۔ کیسا بانکا جسم تھا پیارو کا۔ سر سے پاؤں تک گٹھا ہُوا۔ اسے افسوس ہونے لگا کہ اُس نے یونہی شیخی میں آکر اُسے چھونے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ وہ مت سنگھ پر یہ ثابت کر دینا چاہتا تھا کہ وہ اسے زیر کر کے بھی پیارو سے دست بردار ہو سکتا تھا لیکن اس جذبے سے بھی مضبوط تر جذبہ ایک اور تھا اور وہ تھا اس کا سرکوں سے پیار عشق کے دربار میں یہ بھی ایک قربانی تھی۔

ان باتوں کو سوچ کر اس کا غم غلط ہونے لگا اور بالآخر اسے اس بات پر خوشی محسوس ہوئی۔ اُس نے اچھا ہی کیا جو اس حرام کار عورت سے ملوث نہیں ہوا۔ حالانکہ وہ ہزار جان سے اس بات پر آمادہ تھی۔ پیارو کی بابت اس کا اشتیاق دفعۃً بھڑک کر ٹھنڈا پڑ گیا۔ لیکن اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھنے کے خیال سے پوچھا:

"آخر تمہیں تو معلوم ہی ہو گا کہ وہ کہاں گئی ہے۔"

نہیں دھرم سے مجھے اس بات کی کوئی خبر نہیں۔ بھلا تجھے بتا دینے میں میرا کیا حرج تھا۔"

"اور وہ آدمی... ماتا کے داگومگوالا... کیا نام تھا اس کا... ہمت سنگھ؟"

"وہ بھی تو اُسی کی دُم سے بندھا ہُوا ہے۔"

پالی کو اس کے ساتھ اپنی جھپٹ یاد آ گئی۔ اُس نے مخصوص انداز سے جوالا سنگھ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"ہمت سنگھ بھی بڑا جبریلا آدمی تھا۔"

کچھ دیر تک جوالا سنگھ چُپ چاپ اپنے دانتوں اور سُرخ مسوڑھوں کی نمائش کرتا رہا پھر اُس نے زبان نکال کر اس کے سِرے سے مُونچھ کو چُھوتے ہُوئے جواب دیا۔

"لیکن پالی تو نے دو ہاتھ ایسے دکھائے کہ سارا جبر اُس کی ناک اور مسوڑھوں میں سے بہہ کر نکل گیا۔ پھر تو بالکل بکری بن گیا تھا۔ اسے تو کچھ خبر ہی نہیں ہُوئی کہ آخر کو تم نے ایک ننھے بچّے کی طرح گھما کر پرے کیسے پھینک دیا... کیوں جیل سنگھ؟"

جیل سنگھ ان کو سرگوشیوں میں باتیں کرتے دیکھ کر ابھی تک چُپ تھا۔ اب جو جوالا سنگھ اس کی طرف مخاطب ہُوا تو وہ بھی گویا پہلے ہی سے بھرا بیٹھا تھا۔ ڈھول کی طرح بول اُٹھا۔

"ہاہو۔"

جوالا سنگھ نے قہقہہ لگایا۔

"وہ بھی اوروں کا بِلا ہُوا عادی تھا۔ اُس نے سمجھا ہو گا۔ کل کا بچہ ہے ابھی دھرلوں گا نیچے...."

"نہیں پاتی کوئی کل کا بچہ تو نہیں دکھتا۔ اب بھلا اس سے بڑا جوان کیا ہوگا۔ بجا رہا میں ایک ہے ٹھیک ہے کہ مت سنگھ کو بھی اپنی طاقت پر گمان ہے۔ پر پھر بھی اسے یہ تو دیکھنا چاہیئے تھا کہ اس سے اس کا مقابلہ ہو ہی نہیں سکتا . . . . "

اب تک سادھو سنگھ روٹی کھا رہا تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ بزرگوں کے اس قول پر پُورے طور پر پابند تھا کہ کھانا کھاتے وقت باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ اس کا اصل مقصد تو وہ نہ پا سکا تھا۔ لیکن اُس کا قیاس یہی کہتا تھا کہ اگر انسان روٹی کھاتے وقت باتیں کرے تو اُس کا پیٹ باتوں سے ہی بھر جاتا ہے اور وہ تھالی میں پڑی ہوئی روٹیوں سے پُورا انصاف نہیں کر سکتا۔ خیر اب وہ کڑی آزمائش سے صحیح و سالم نکل آیا تھا۔ اس نے جھٹ بات کر کے اپنی موجودگی کا احساس دلا دیا۔

"اجی وہ دیکھتا کیسے . . . . مارے نشے کے ہو رہا تھا مُنّ . . . . تم جانو نشے میں آدمی سمجھتا ہے کہ وہ پہاڑ سے بھی ٹکر لے سکتا ہے۔"

جوالا سنگھ کے دل پر اس کی اس فصیح گفتگو کا کوئی اثر نہ ہوا۔ بلکہ اُس نے اس کی دُبلی پتلی گردن کو اپنے بہت بڑے ہاتھ میں دبوچ کر کہا:

"کیوں تم تو دیکھ لیتے ہو نا؟"

سادھو سنگھ نے مدرسے میں پڑھنے والے بچے کی طرح گردن اندر کو سکیڑی اور عجیب انداز میں ہنستے ہوئے کہنے لگا:

"ہاں میں تو دیکھ لیتا ہوں۔"

جوالا سنگھ نے اپنی دانست میں بڑا اچھا تماشہ پیش کرتے ہوئے اُس کی گردن کو دو تین جھٹکے دے کر اس کا سر اس انداز سے اُٹھا دیا کہ وہ پاتی کا چہرہ دیکھ سکے۔

"نہیں پھر دیکھ لے اچھی طرح دیکھ۔"

"ہاں ہاں دیکھ رہا ہوں۔ ارے بھائی مجھے سور تو نہیں بننا ہے جو میں اسے دیکھوں ہی نہ۔"

پاتی کو اس کی "ہی ہی" کرتی ہوئی ہنسی، لمبی داڑھی اور بے تکی باتیں، مضحکہ خیز صورت بالکل پسند نہ آئی بلکہ اسے کوفت ہو رہی تھی کہ جوالا سنگھ مفت میں کیوں بے تکی باتیں اور

بے معنی حرکتیں کئے جاتا ہے۔

سب کو روٹی کھلا کر جیتو بھی روٹی کھانے بیٹھی تو پاّلی سے مخاطب ہو کر بولی:

" پاّلی! روٹی کھالے۔"

" نہیں۔ ۔ ۔ بس میں تو کھا کر آیا ہوں باہگورو تمہیں اور دے۔"

پاّلی کی اس بات پر جوالا سنگھ جھوم اُٹھا۔

" آہاہا۔ ۔ ۔ واہ پاّلی واہ واہ۔ کیا بات کہی ہے۔ باہگورو تمہیں اور دے۔ بابھی باہگورو ہی سب کو دیتا ہے۔"

جیل سنگھ نے ڈھیلے جوڑے کو ذرا کس کر باندھتے ہوئے کہا:

" جوالا سنہا بات تو تو نے ٹھیک کہی ہے۔ دینے والا تو باہگورو ہی ہے پر ایسا بھی نہیں کہ آدمی آپ سے تو کرے نہیں اور نری باہگورو پر آس لگائے بیٹھا رہے۔"

جوالا سنگھ کی گردن نہ ہونے کے برابر تھی اس لئے جب وہ اثبات میں سر ہلانے لگا تو سر کے ساتھ سارا دھڑ بھی ہلنے لگا۔

" کھری کہی۔ ہاں بھائی روجی تو ہاتھ کی کرت ہے۔ ۔ ۔ ۔"

اتنے میں سادھو سنگھ نے مٹی کی انگیٹھی جس میں سوکھے اُپلے سُلگ رہے تھے۔ چارپائی کے قریب آن رکھی۔ شدّت کی سردی پڑ رہی تھی۔ کسی نے انگیٹھی کی طرف ہاتھ بڑھادئے اور کسی نے پاؤں۔

جیل سنگھ نے پاؤں بڑھایا تو اُس کی موٹی، مضبوط اور سڈول پنڈلیاں عُریاں ہوگئیں۔ جنھیں دیکھ کر اس بات کا بخوبی اندازہ لگ سکتا تھا کہ وہ کتنی طاقت کا مالک ہے۔ ایسے موقعہ پر سادھو سنگھ بھی فلسفہ چھانٹے بغیر نہ رہ سکا۔ چارپائی کے بجائے انگیٹھی کے قریب پڑی ہوئی چوکی پر بیٹھتے ہوئے بولا:

" باہگورو بھی کسی حیلے سے دیتا ہے۔ آسمان سے نہیں برساتا روجی۔ ۔ ۔ کیوں چاچا جوالا سنگھ۔"

جوالا سنگھ نے آفرین بھیجتے ہوئے کہا:

" کیا بات ہے۔ ۔ ۔ واہ وا۔ ۔ ۔ سادھو سنگھ تو پچھلے جنم میں ضرور سادھو

ہُوا ہوگا۔ ۔ ۔ ۔ اس جنم میں تو کھیر حرام جادہ ہے پکا۔ ۔ ۔ ۔ کیوں جیل سنگھ سُنی اس کی بات ؟ مثل یہ کہ آدمی جب تک کوشش نہ کرے باہگورو اسے کچھ نہیں دیتا۔"

" باہگورو کہتا ہے۔ ۔ ۔ ۔" جگنتو نے نوالہ چباتے چباتے دفعتاً رُک رُک کر کہنا شروع کیا۔ ۔ ۔ " واہگورو کہتا ہے کہ ہے منکھ واے انسان! دیکھ میں نے تجھے موکا دیا ہے جو تو اس کا پھائدہ اُٹھانا چاہتا ہے تو اُٹھائے۔ بادمیں پھر نہ کہیو مجھے کہ میں نے تجھے کچھ نہیں دیا۔ ۔ ۔ ۔"

تھوڑی دیر تک ہر طرف سے باہگورو باہگورو کی صدائیں آتی رہیں۔ سب لوگ بڑی سنجیدگی سے آنکھیں موندے اس انداز سے بیٹھے تھے جیسے ان کے دل بھگتی رس میں ہچکورے لے رہے ہوں۔ جیل سنگھ کی تقریباً ساری تھوڑی کھیس میں چھپی ہوئی تھی۔ دفعتاً اس کی آنکھیں اُٹھیں۔ ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی اور اس نے جوالا سنگھ کی طرف دیکھ کر پُر معنی لہجے میں کہا:

" بھئی موکا تو باہگورو نے اب کے بھی بہت اچھا دیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ کیوں جوالے ؟"

" ہو ہاں۔ ۔ ۔ ۔ کیوں نہیں۔"

اس کے بعد پھر قدرے طویل خاموشی طاری ہوگئی اور بالآخر جب پھر تھوڑی بہت گفتگو شروع ہوئی تو جوالا سنگھ اُٹھا اور پالی کو اشارے سے اپنے ساتھ لے گیا۔ پہلے وہ خراس پر گئے۔ وہاں جوالا سنگھ نے کام کی دیکھ بھال کرنے کے لئے ایک آدمی بٹھا رکھا تھا۔ اس نے وہاں ان لوگوں سے دو چار باتیں کیں اور پھر پالی کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر احاطے کے ایک گوشے میں چھپر کھٹ کے نیچے جا کھڑا ہوا۔

پالی کو اس کی حرکات اور سکنات ہی سے اس بات کا احساس ہوگیا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔"

جوالا سنگھ نے ایک ہاتھ سے گُدی کے بالوں کو سمیٹ کر اوپر کیا اور مُنہ پالی کے قریب لا کر رازدارانہ لہجے میں بولا:

" ایک گھر تاڑا ہے۔"

پالی کو اسی قسم کی بات کی توقع تھی۔ اس نے ابھی تک غور نہیں کیا تھا کہ اگر اس قسم کا

کوئی پروگرام بنا تو اس میں وہ کس حد تک حصہ لے سکے گا، چنانچہ اب اُس نے دل ہی دل میں اس پر غور کرتے ہوئے پُوچھا:

"کون ہے؟"

جوالا سنگھ نے اپنے مُنہ کے آگے ہاتھ کی اوٹ کرکے تاکہ کسی اور کے کان میں بھنک نہ پڑ جائے آہستہ سے کہا:

"ساہوکار ہے اور ہے بھی موٹی اسامی؟"

پالی خاموش رہا۔

"اپنے چلیے کا سب سے بڑا ساہوکار ہے معمولی آدمی نہیں ہے جو ایک دیجے داؤ چل جائے تو بس سمجھو بیڑا پار ہے۔ جیل سنگھ کی شادی ہونے والی ہے نا اسی لیئے وہ اپنی عورت کے لئے وہاں سے گہنے لانا چاہتا ہے۔ تم جانو اس کے ہاں ایک عورت کا جیور تو نہیں ہوگا نا۔ نہ معلوم کتنی عورتوں کا جیور ہو۔ بس ہم لوگوں کی چاندی ہی چاندی۔ جیور، نقدی، کپڑے جو ملا ہم اجیل سنگھ کی بکھروں میں سما گئے ہو۔ مجھ سے کہتا تھا کہ لڑکا اچھا ہے۔ اسے ساتھ لے چلنا چاہیئے۔ دو چار بار جائے گا تو ہاتھ میں صفائی آجائے گی۔ تم نے جو اس روج مت سنگھ کو دو ہاتھ دکھائے نا۔ تو بس اسی دن سے اسے تم سے پریم ہو گیا ہے سمجھے۔ بڑا نیک آدمی ہے۔ اس کے ساتھ تمہارا دوستا نہ ہو جائے گا تو بس عیش سے دن کاٹو گے۔ دیکھو بیٹا تمہارے باپ کے ساتھ بھی میرا یہی ماملہ چلتا تھا۔ لیکن وہ تھا بڑا ادبنگ۔ اس کام میں جرا سنبھل کر پیر اُٹھانا چاہئے۔ آگا پیچھا خوب اچھی طرح دیکھ لینا چاہئے۔ یہ بڑے پتے کی بات کہہ رہا ہوں۔ جندگی کا نچوڑ ہے۔ جو آدمی ڈھب سے چلتے ہیں۔ ساری عمر عیش کرتے ہیں کہ کبھی بال نہیں بیکا ہوا۔ یہ بات نہیں کہ کسی کو اس بات کا پتہ نہ ہو۔ سب جانتے ہیں کہ ہم یہ کام کرتے ہیں۔ ڈنکے کی چوٹ کرتے ہیں اور بیچ کھیت کے کرتے ہیں لیکن کیسے کرتے ہیں یہ کسی کو بھی نہیں ملوم۔ کبھی پلس (پولیس) کے کابو آجاتے ہیں تو دو چار روج جوتے پڑتے ہیں۔ لیکن یہاں تو وہی ماملہ ہے کہ دو لگیاں لسّر گئیاں۔ یاراں دیاں دُور بلائیں۔۔۔۔

(دو لگیاں اور بھول گئیں یاروں کی مصیبتیں دُور ہو گئیں) بڑے بڑے جالم تھانے داروں سے نمٹ چکے ہیں۔ اپنی۔۔۔ تک کا جور لگا کر دیکھیں۔ ہم نے کبھی اکبال ہی نہیں کیا اور

پھر ثبوت بھی تو ہونا چاہئے ہمار آج تک ثبوت ہی نہیں ملا۔ نہ کبھی چوری کا مال پکڑا گیا نہ کوئی ہتھیار آکھر ہم بھی تو بیا کو پھ نہیں ہیں ناجوان کے کالوں میں آجائیں۔ ہمارے پاس سب جیچ موجود ہے۔ پر کہاں ہے یہی تو ان کو علوم نہیں ہو سکتا۔ ۔ ۔ ۔ "

پاتی چپ چاپ سنتا رہا۔

جوالا سنگھ نے قدرے سکوت کے بعد پھر کہنا شروع کیا:

"پہلے پہل دل کو کچھ کھٹکا معلوم ہوتا ہے۔ پھر کچھ بھی نہیں۔ آکھر کو تم بھی دنیا دیکھے ہو۔ کوئی بیا کو پھ تو نہیں۔ کھد سب باتیں سوچتے اور سمجھتے ہو۔ اتے دن سے گاؤں میں آئے ہوئے جرا دو چار روج کو باہر چلے جائیں گے گھومنا پھرنا بھی ہو جائے گا اور جو کام بن گیا تو سمجھو کہ آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔ پھر آکر عیش کرنا۔ ۔ ۔ ۔ "

جوالا سنگھ سبز باغ تو خوب دکھا رہا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ چونکہ پالی کو پہلے کبھی ایسے کام میں حصہ لینے کا موقعہ نہیں ملا۔ اس لئے وہ کچھ ہچکچا رہا ہے۔ حالانکہ پالی کو اس قسم کی ہچکچاہٹ نہیں تھی۔ اس طرف تو اس کا طبعی رجحان تھا۔ جن کاموں میں وہ ہاتھ ڈال چکا تھا۔ وہ بھی کچھ کم خطرناک نہیں تھے۔ حقیقتاً لڑائی بھڑائی، مار پیٹ، قید و بند بلکہ موت تک کا خوف اسے کبھی محسوس ہی نہیں ہوا۔ ایسے پروگرام میں حصہ لینے میں اسے اعتراض بھی کیا ہو سکتا تھا بلکہ وہ سب سے آگے سینہ تان کر جانے کو تیار تھا۔ اگر اس کے چہرے سے ہچکچاہٹ کے آثار نظر آرہے تھے تو محض اپنے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے جب سے وہ گاؤں میں آیا تھا۔ اس نے اس قسم کی صحبت اور اس قسم کے کاموں سے عمداً احتراز کیا تھا۔ اب وہ تذبذب کی حالت میں تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔

جوالا سنگھ اس کی خاموشی دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔

"ارے بیٹا! اس کام میں مشکل ہی کیا ہے جو تم ایسی گہری سوچ میں پڑ گئے ہو جو آدمی ہمارے بیچ میں ہے نادہ ہے گھر کی سب باتوں کا بھیدی۔ ہم یہ سوچے ہوئے ہیں کہ کام کھتم کرنے کے بعد اسے بھی مار ڈالیں گے۔ نہ رہے بانس نہ بجے بنسری۔ پھر کون جانے گا، کس نے ڈاکہ ڈالا۔ پلس کے آدمی اور کھوجی پاگل کتوں کی طرح بھاگتے پھریں گے۔ لیکن ہمیں نہیں پا سکیں گے۔ ارے بھائی آٹھ دس ہجار تو ایک آدمی کے حصے میں جو نہی (یونہی) آجائے گا۔

تو بھی اس روپے سے اپنی زمین خرید لیجیو اور بڑے عیش سے رہیو۔"

جوالا سنگھ نے آخری فقرہ تو ایسے کہہ دیا جیسے اس نے پالی کے دل کا حال کھلی کتاب کی طرح پڑھ لیا ہو۔ اس کی ساری لچر بازی کا پالی کے دل پہ اتنا اثر نہیں ہوا تھا جتنا کہ صرف اس ایک بات کا ہوا۔ پالی کے تخیل کو گویا پر لگ گئے۔ زمین خریدنے کے واسطے روپیہ حاصل کرنے کے لئے وہ دنیا کا کوئی کام بھی کرنے کو تیار تھا۔ سرتوں کے ماں باپ کے دل میں اس کے سوا تو اور کوئی بات بھی نہیں تھی۔ وہ لوگ اتنے دنوں سے اس بات کا انتظار کر رہے تھے کہ ادھر پالی زمین خریدے ادھر وہ اس کے ساتھ سرتوں کا بیاہ کر دیں لیکن پالی زمین کہاں سے خریدے۔ جیب میں روپیہ ہو تبھی نا۔ روپیہ درختوں کے ساتھ نہ لگتا تھا کہ وہ جا کر توڑ لائے۔ آسمان سے نہ برستا تھا کہ وہ جا کر بٹور لائے۔ . . . پھر دفعتاً پالی کو احساس ہوا کہ خود واہگورو اکال پرکھ نے اسے مشکل میں دیکھ کر اس کے لئے یہ سنہرا موقع پیدا کیا ہے۔ اگر وہ اب بھی چوک گیا تو پھر اس کی قسمت۔ کیا تعجب آج سے چند روز بعد سرتوں کے ماں باپ کے کانوں میں یہ بات جا پڑے کہ سردار پالا سنگھ زمین اور دو جوڑی بیل خرید رہا ہے۔ یہ سنتے ہی نرنجن سنگھ دوڑتا چلا آئے گا باتوں باتوں میں تفصیلات پوچھے گا۔ پھر وہ اسے اپنے گھر بلائیں گے۔ جنداں اپنے مخصوص انداز میں اس سے پرمعنی باتیں کرے گی۔ اور بیٹھے بیٹھے پرتھی پال سنگھ اس طرح غائب ہو جائیں گے جیسے آندھی کے آگے خس و خاشاک۔ اور پھر کسی کو اس بات کا علم تک نہ ہوگا۔ آخر کسی کو خبر ہو ہی کیونکر سکتی ہے۔ کسی بہانے سے مثلاً یہ کہ اس کا ایک دوست کلکتے سے امرتسر میں آیا ہوا ہے وہ اس سے ملنے کے لئے جا رہا ہے۔ بس اسی دوران میں سارا کام ختم کر کے واپس آ جائے گا۔ جو ماں پوچھے گی کہ اتنا روپیہ کہاں سے آیا تو وہ کہہ دے گا کہ برما میں ایک دوست کے پاس اس کا روپیہ موجود تھا۔ اب وہ برما سے واپس آیا ہے تو اس نے روپیہ بھیج دیا۔ یا اسی قسم کا کوئی اور بہانہ لگا دے گا۔ آخر گھر والے پیچھے تو نہ پڑ جائیں گے کہ گھر میں روپیہ کیوں آ گیا۔ انھیں تو روپے سے کام ہے۔ اس بات سے غرض ہی کیا کہ کہاں سے آیا۔ ماں کو تو معلوم ہی ہے جیسے اس کا باپ گھر میں روپیہ لایا کرتا تھا۔

پالی اپنی سوچ بچار میں گم تھا اور جوالا سنگھ اس کی پُراسرار خاموشی پر کچھ پریشان

سا ہو رہا تھا۔ وہ اس دوران میں بڑے تھیلے الیسے منہ میں زبان کو گھماتا پھراتا رہا۔ پھر دھندلی روشنی میں دونوں کی نظریں ملیں۔ انہوں نے بھانپ لیا کہ وہ دونوں ایک ہی میدان کے شہسوار ہیں۔ پالی تھوک کی پچکاری چھوڑ کر مسکرایا اور جوالا سنگھ کی باچھیں چر گئیں خاموش ہنسی کے موقعہ پر اس کے رخسار جو ابھرے تو اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور بھی چھوٹی دکھائی دینے لگیں۔ یہاں تک کہ بالآخر رخساروں کے ابھار اور بھنووں کے درمیان میں وہ محض ڈوبلوں کی مانند دکھائی دینے لگیں اور وہ ہاتھ بڑھا کر پالی کی پیٹھ تھپتھپانے لگا۔

پالا سنگھ نے اطمینان سے زمین میں گڑے ہوئے لکڑی کے ستون سے پیٹھ ٹیک کر پوچھا۔

"کس روز؟"

"بس۔۔۔ کل نہیں تو پرسوں۔۔۔ اندر چل کر جیل سنگھ سے بات چیت کر لیں گے۔"

پالی نے قدرے آگے جھک کر پوچھا۔

"تم نے دل کی تسلی کر لی ہے نا آسامی کیسی ہے؟"

جوالا سنگھ نے چٹکی بجا کر کہا۔

"ارے آسامی کی کیا پوچھتے ہو سولہ آنے کھری۔ میں خود جا کر وہ گھر دیکھ آیا ہوں۔ ساہوکار ہے ساہوکار۔ بڑا جبر جست مال ہاتھ لگے گا چل کر تماشہ تو دیکھیو۔"

"اچھا تو تم نے خود دیکھ لیا ہے گھر۔"

"ہاں بھئی خود" پھر جوالا سنگھ نے آنکھوں کو چھوتے ہوئے کہا: "خود ان آنکھوں سے دیکھا میں نے۔۔۔۔"

اب پالی کا شوق بھی تیز ہونے لگا۔

"اور یہ بھی معلوم ہے کہ وہاں گاؤں میں ہی مال ہے سب؟"

"ہاں بھئی وہ اپنے گھر ہی میں رکھتا ہے۔ لین دین کا کام ہے۔ سونا اور روپیہ وغیرہ سب اس کے پاس ہی رہتا ہے۔"

"تو یہ سب باتیں اس بھیدی نے بتائی ہیں؟"

"ہاں۔۔۔۔ ایک بات اور بھی تو ہے۔ اُنھوں نے گھر میں بندوک (بندوق) بھی رکھی ہوئی ہے۔ جوان کے گہنا دہنا نہ ہو تو بتاؤ بندوک رکھنے کی کیا جرورت ہے؟"

پاآئی نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا:

"یہ بندوک والا معاملہ ٹیڑھا ہے جرا۔۔۔۔"

جواّلا سنگھ اپنا مُنہ اس قدر قریب لے آیا کہ پاآئی کو اپنی گردن پر اس کی مُنہ سے نکلتی ہوئی گرم گرم ہوا کا احساس ہونے لگا۔ جواّلا سنگھ نے پلکیں جھپکائے بغیر اس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ دیں۔ پھر اُس کے پھُولے ہوئے ہونٹ ہلے۔

"بھیدی کی جبانی ملوم ہُوا ہے کہ ان کی بندوک بگڑ گئی تھی۔ اس لئے مرمت کے لئے شہر بھیج دی گئی ہے۔ اب پانچ سات روج سے پہلے نہیں آئے گی اور ہم اس سے پہلے ہی سارا کام کھتم کر آئیں گے۔۔۔۔"

پاآئی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ دل میں جواّلا سنگھ کی ہوشیاری کا قائل ہو گیا لیکن جواّلا سنگھ اب بھی اسی انداز سے اس کی نظروں سے نظریں ملائے ہوئے تھا۔ پھر اُس نے ناک کی پھنکار کی سی آواز میں کہا:

"پاآئی! ہمارے پاس بھی تو ہو گی بندوک!"

پاآئی کا دل مارے خُوشی کے اُچھلنے لگا۔ اُس نے مُنہ پھیلا کر اظہارِ تعجب کیا:

"اچھا؟"

"ہاں بیٹا! میں نے سب پاپڑ بیلے ہوئے ہیں۔ ایسی کچّی گولیاں نہیں کھیلا ہوں۔"

پاآئی نے اسے خُوش کرنے کے لئے کہا:

"چاچا! واکئی تم اکل بند (عقلمند) آدمی ہو"

جواّلا سنگھ نے بھی خُوش ہونے میں بُخل سے کام نہیں لیا۔

"تم جرا تماشہ تو دیکھنا۔۔۔۔ ارے جب تیرا باپ جندا تھا۔ تو بڑے بڑے میدان مارے تھے ہم نے۔ جیب سے تو آیا تھا میں سوچ رہا تھا کہ کوئی موکا پڑے تو ہم دونوں ساتھ ساتھ چلیں۔ تُو تو بالکل اپنے باپ کا رُوپ ہے وہ تیرے برابر اُونچا نہیں تھا۔ شراب وراب بھی بہت پیتا تھا لیکن پھر بھی بڑا جور تھا اس کے بدن میں۔ ارے اس کی تو

آواج ہی ایسی تھی جیسے شیر کی گرج سُننے والے کی گھگی بندھ جاتی تھی۔ . . جرا ایک ملٹ

. . . ٹھہرا رہو۔ میں ٹھہراس تک ہو آؤں . . . "

جوالا سنگھ خراس کی طرف گیا۔ پسوائی کا گیہوں علیحدہ چھاج میں دھرا تھا۔ اسے

دیکھ کر جوالا سنگھ نے بڑے اطمینان سے سینہ کھجایا۔ گاہکوں نے جاتے جاتے اعتراض کیا۔

"بھئی جوالا سنہا! یہ سانڈنی بہت بوڑھی ہوگئی ہے۔ اس سے تو چلا ہی نہیں جاتا اور چکی

کے پتھر بھی ٹھیک کام نہیں کرتے۔"

جوالا سنگھ نے خوش طبعی سے ہنستے ہوئے کہا:

"ہو ہو۔ . . ہاہو۔ . . یار اب یہ کام بھی کروا ڈالیں گے۔"

اس کے بعد جب جوالا سنگھ کا آدمی گیہوں کا چھاج لے کر گھر کے اندر گیا تو پالا بھی

س کے قریب چلا آیا۔ جوالا سنگھ نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"باہگورو اکال پرکھ نے آسمان میں تارے بھی کیا کھوب بنائیں جب آدمی کا جی گھبرا

جائے تو آسمان کی ترپھ دیکھنے لگے۔ . . . ہوں ہو نہ ملوم کتنے تارے ہوں گے۔

کیوں پالی ہجار سے کم تو کیا ہوں گے۔"

پالی کو تاروں سے کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ وہ کچھ جواب دیئے بغیر

گادھی پر بیٹھ گیا اور وہ اس کے بوجھ تلے چرچرانے لگی۔

جوالا سنگھ نے اسے اپنی دھن میں مگن پا کر اپنے آدمی کو آواز دی ۔

"ہو لبھیا ہو"

"ہو۔"

"ابے باہر آ۔ تو تو اندر ہی مر گیا۔"

لبھا بہت غلیظ اور سست آدمی تھا۔ اُس نے صحن کے دروازے میں سے

گردن نکالتے ہوئے کہا:

"ہو تو میرے پیچھے کیوں پڑ جاتا ہے۔ . . . "

جوالا سنگھ نے اس کی بات سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے کہا:

"مڈاچی کو طویلے میں باندھ دے جلدی سے۔ حرام جادے بد کے تخم۔"

دُبلا پتلا لبھا بڑبڑاتا ہوا سانڈنی کی نکیل پکڑے اسے اصطبل کی طرف لے گیا۔

جوالا سنگھ نے پالی کو اشارہ کر کے کہا۔

"آؤ اندر چلیں۔ اب سردی میں اس جگہ بیٹھنے کی کیا ضرورت ہے۔"

وہ دونوں صحن کی طرف بڑھے۔ دروازے میں داخل ہوتے ہوئے جوالا سنگھ نے گھوم کر لبھے کو آواز دے کر کہا۔

"لبھو ہوئے۔ باہر کا دروازہ بند کر دیجو خوب اچھی طرح سے۔"

"ہو" ادھر سے آواز آئی۔

پھر وہ دونوں صحن کے اندر داخل ہوئے۔ باورچی خانے کی محفل برخاست ہو چکی تھی۔ جیل سنگھ کھرلیوں کے قریب بیٹھا پیشاب کر رہا تھا۔ سادھو سنگھ ایک آوارہ کتے کو روٹی کے ٹکڑے ڈال رہا تھا۔ چنتو ایک سرے ہی سے غائب تھی، شاید جب وہ دونوں خراس سے ذرا پرے چلے گئے تھے۔ اس وقت چنتو ان کے علم کے بغیر ہی ادھر سے گزر کر باہر چلی گئی تھی۔

جیل سنگھ جب اٹھ کر کھڑا ہوا تو پالی کو اندازہ ہوا کہ اس کا ڈیل ڈول کس قدر زبردست ہے۔ دیو کا دیو معلوم ہوتا تھا۔ وہ تہبند کے نیچے اپنے کچھرے کا ازار بند باندھتے ہوئے ادھر آیا۔ اس نے پرمعنی نظروں سے جوالا سنگھ کی جانب دیکھا۔ جواب میں جوالا سنگھ کے گوشت سے پر چہرے پر کئی نشیب و فراز پیدا ہوئے اور پھر اس کی گردن بمشکل ہلی اور منہ کھلا

"بس ہو گیا کام"

پالی کو اس کا مطلب سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔

جوالا سنگھ نے آنکھ مار کر کہا۔

"لونڈے کو گورو منتر دے دیا ہے میں نے۔"

جیل سنگھ نے دوستانہ انداز میں اپنا بھاری بھرکم ہاتھ پالا سنگھ کے کندھے پر رکھ دیا۔ سادھو سنگھ نے ان کی باتیں سنیں تو وہ بھی قریب کھسک آیا اور پھر وہ آپس میں بات چیت کرتے ہوئے پسار میں چلے گئے۔

جوالا سنگھ نے پوچھا:

"چنتو کہاں گئی ہے۔"

سادھو سنگھ نے ڈکار لے کر کہا۔

"دو گھڑی کے لئے باہر گئی ہے۔"

پھر سادھو سنگھ کے سوا سب چارپائی پر بیٹھ گئے اور سادھو سنگھ اُچک کر اُوپر تلے دھری ہُوئی گیہوں کی بوریوں پر چڑھ بیٹھا۔

جوالا سنگھ بولا:

"ابے سادھو سنگھ جرا انگیٹھی ہی لے آنا اندر۔"

سادھو سنگھ نے بچّوں کی طرح کندھوں کو حرکت دے کر جواب دیا

"پتا وُاب کون جائے چوکے ہیں۔"

جوالا سنگھ نے بھنویں تان کر اس کی طرف دیکھا۔

"بے مایا دانہ ہو تو......"

سادھو سنگھ نے اسے غراتے ہوئے دیکھا تو بے دلی سے بوریوں پر سے نیچے اُتر آیا۔ باہر نکلتے نکلتے بڑبڑایا۔

"بھینسے کی سی سوٹی چمڑی ہے...... سردی سے مر تو نہ جائے گا۔"

یہ حقیقت تھی کہ ان میں سے سردی کے مارے کوئی بھی مرنے والا نہیں تھا لیکن جوالا سنگھ کو تو مہمانوں کی خاطرداری منظور تھی نا۔

آخر کار سادھو سنگھ مٹی کی انگیٹھی میں چند سُوکھے ہُوئے اُپلے سُلگا کر لے آیا اور اُسے چارپائی کے قریب رکھ کر پھر بوریوں پر چڑھ بیٹھا۔

جوالا سنگھ نے اسے بندر کی طرح بیٹھا پایا تو بولا:

"بیرا جو بورے کھسک گئے تو دھڑام سے نیچے آن رہے گا۔ ساری شیخی کرکری ہو جائے گی۔ یہ چپٹی سی ناک پچک جائے گی۔"

جَیل سنگھ نے ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا

"ابے چھوڑ حرام جادے کو...... کوئی کام کی بات کر۔"

جوالا سنگھ نے فوراً بات کا رُخ بدلتے ہوئے جواب دیا۔

"ہاں بھائی پالی کی کسر تھی سو پوری ہو گئی۔ وہ ہمارے ساتھ چلے گا۔ میں نے تجھے

پہلے ہی بتا دیا تھا کہ یہ اپنا بیٹلے سے جانے پر تیار ہو جائے گا۔۔۔۔۔۔بس ہمارے کہنے کی دیر تھی۔"

جیل سنگھ نے مطمئن لہجے میں کہا:

"ہاں یہ تو مجھے ملوم تھا۔ لیکن پھر بھی میں نے سوچا ابھی ناتجربے کار ہے شاید ایسے کام سے گھبراتا ہو۔"

"ہو ہو۔ تم اسے ناتجربے کار سمجھتے ہو۔ یار کیا بات کہہ دی تم نے اس روح اپنی آنکھوں سے اس کے ہاتھ کی سپھائی دیکھ چکے ہو پھر بھی۔۔۔؟"

"نہیں بھئی اتنا تو میں مانتا ہوں کہ وہ بڑا کرارہ جوان ہے۔ اگر اس دن لڑائی نہ بھی ہوتی۔ پھر بھی اس کی صورت سے انداجا لگ سکتا ہے۔ میں بھی شکل سے آدمی کو پہچان لیتا ہوں۔ اگر میرے دل میں اس کے لئے پریم نہ ہوتا تو بھلا میں اسے اپنے ساتھ لے جانے کے لئے تمہیں اتنی بار نہ کہتا۔۔۔۔"

جوالا سنگھ نے زور سے سر ہلا کر کہا۔

"ہو تو ٹھیک ہے۔ پر تمہیں ملوم نہیں۔ پالی بھی بڑا جگرت ہے۔ کلکتے میں اس نے بڑے ہاتھ مارے ہیں۔ جان ہتھیلی پہ رکھ کر گوروں کی پھوج سے ٹرک چرا چرا کر لاتا رہا۔ اب تو ہمارا ساتھ رہے گا تب دیکھنا اس کے ہاتھ۔۔۔۔؟"

پالی یہ سب باتیں سن کر بہت خوش ہوا۔ اس نے انکسار دکھانے کی کوشش نہیں کی بلکہ دانتوں کی نمائش کر کے دلی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے دانتوں کی دراڑ سے تھوک کی پچکاری چھوڑ دی۔

جوالا سنگھ نے اپنی چھوٹی لیکن موٹی گردن کو بمشکل آگے بڑھاتے ہوئے ذرا رازدارانہ لہجے میں پوچھا:

"اچھا بھائی جیل سنگھ! اب یہ بھی بتادو کہ کس دن جانا ہو گا۔ کل کتنے آدمی ہونگے ہمارے ساتھ۔ کیا کیا سامان ہو گا۔ کچھ مال وال کا انداجا بھی ہے؟"

جیل سنگھ نے دونوں بازو آپس میں پھنسا کر کہنیاں گھٹنوں پر ٹیک دیں۔

"اب مجھے کتنی دیر سے بتانا ہو گا کہ بڑا مال دار سا ہو کار ہے۔ تجھے تو گھر بھی دکھا دیا

ہے۔ اب پھر وہی پرانی بات پوچھے جاتا ہے۔۔۔"

" ارے نہیں یار اپنے لئے نہیں۔ جرا پالی کو بتا دے نا مجھے تو سب کچھ ملوم ہی ہے۔"

پالی کا بھی بہانہ تھا۔ ورنہ دراصل مال و دولت کا ذکر بار بار سن کر خود اسے حظ محسوس ہوتا تھا۔ اس نے پالی کی طرف مخاطب ہو کر کہا:

" لو بیٹا پالی سن لیا۔ میں نے کچھ جھوٹ نہیں کہا تھا۔۔۔ ہاں یار تو پھر کس سوچ کا کھیال ہے۔"

جیل سنگھ نے دماغ پر زور ڈال کر دو چار لمحے غور کیا اور پھر فیصلہ کن لہجے میں بولا:

" ہمیں کل شام کے دھندلکے میں یہاں سے چل دینا چاہیے۔ راتوں رات ہم کاہن سنگھ کے وہاں پہنچ جائیں گے۔"

جرالا سنگھ نے ٹوک کر پوچھا

" بھئی کاہن سنگھ کون ہے؟"

" ارے تمہیں اتنا بھی یاد نہیں۔ ننکانے صاحب کے میلے پر جو وہ کھب صورت سا آدمی تھا نا۔ ارے بھائی جب ہم سب نے بھنگ پی تھی اور کاہن سنگھ کو ایسی ہنسی چھوٹی کہ بس توبہ ہی بھلی۔"

جرالا سنگھ نے ذہن پر زور ڈالا۔ لیکن کچھ یاد نہ آیا۔ جیل سنگھ نے بے چین ہو کر کہا:

" ہو جس کے دانت بہت سپھید تھے۔ تیس برس کی عمر ہو گی۔ بھورے رنگ کی ڈاڑھی تھی اس کی۔۔۔"

" اوہ ہاں۔۔۔ یاد آ گیا تم ہی نے تو بتایا تھا نہ شایت کہ اسے ایک عورت نے بیٹا بنا لیا تھا۔"

" ہاں ہاں بس وہی۔۔۔ بڑا چلتا پرجا ہے۔ وہ عورت جس نے اسے بیٹا بنایا ہے رنڈی تھی، اکیس بائیس برس کی۔ مجاج چنچل تھا اس کا۔ کچھ مال بھی تھا۔ ادھر کاہن سنگھ یتیم تھا لیکن ویسے بڑا حرام کا تخم تھا۔ عورت نے اسے بیٹا بنا لیا۔ دو چار برس باد جب اس کی ڈاڑھی مونچھ پھوٹنے لگی تو ایک رات اندھیرے میں اس عورت نے گھبرائی ہوئی آواج میں کہا۔

" وے کاہن یہ کیا کرتا ہے؟ تو اس حرامی کے پلے نے جواب دیا۔ بے جرا دیر باد پوچھ لیتی تو تیرا کیا بگڑ

جاتا، اس پر عورت نے نہ اسے کچھ کہا اور نہ کوئی سوال جواب کئے ۔ ۔ ۔ ۔

" ہو ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہو ہو ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ہا ہا ہا "

وہ سب قہقہے لگانے لگے ۔

جوالا سنگھ نے بمشکل ہنسی روکتے ہوئے پوچھا:

" جب کھانے پینے کو خوب ہے تو پھر ایسے کاموں میں کیوں پڑتا ہے وہ "

" ارے ہمارا تمہارا بھائی ہے نا وہ ۔ بس لت پڑ گئی ۔ اور ہے بھی بڑا پریمی آدمی ۔ اب چلو گے تو پھر ملوم ہو گا "

پالی نے پوچھا ۔

" اچھا تو وہ بھی ہمارے ساتھ چلے گا "

" جرور ۔ بڑا کام کا آدمی ہے ۔ ایک بار ملو گے تو کہو گے کہ ایسا روح والا آدمی نہیں دیکھا ۔ وہ کچھ بھی کہتا ہے ۔ بس تو روح والا آدمی ہوں ۔ ہاں بھئی چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات ہے اور یا بگورو اکال پرکھ سب کا رکھوالا ہے "

جوالا سنگھ اس وقت باگورو اکال پرکھ کی باتیں کرنے کے موڈ میں نہیں تھا اُس نے پھر حقائق کی طرف آتے ہوئے پوچھا:

" ہاں تو ہم کتنے آدمی ہوں گے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

جیل سنگھ نے حساب لگا کر کہا:

" کُل چودہ آدمی ہوں گے "

" چودہ "

" ہاں چودہ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن بے فکر رہو سب کو برابر کا حصہ نہیں ملے گا ان میں سے جتنے تو میرے چیلے چانٹے ہیں اور پھر ہمارا کھیال یہ ہے کہ گاؤں میں اور چار آدمیوں پر بھی ہاتھ صاف کر دیا جائے "

جوالا سنگھ نے کہا:

" جنتو بھی تو ہو گی "

" اچھا جنتو ساتھ چلے گی ۔ ۔ ۔ ۔ بڑی ہشیار ہے وہ بھی ان کاموں میں "

" ہاں وہ تو میں بھی جانتا ہوں ۔ ۔ ۔ جنتو کو ملا کر کُل پندرہ ۔ ۔ ۔ ۔ "

"اور بھیدی؟"

"ارے ہاں۔ اس کا تو کھیال ہی نہیں رہا بس سب ملا جلا کر سولہ ہو جائیں گے سولہ کے سولہ گاؤں میں داخل ہو جائیں گے۔ سب کے سب کھوب مجبوط اور ہوشیار۔ باقی رہا سادھو سنگھ تو یہ مرگھٹ یا قبرستان کی جھڑ بیریوں میں سانڈینوں کی رکھوالی کرے گا۔"

اچھا تو اگر ہم کل شام ہی کو چل دیئے تو سانڈنیوں کا انتجام کون کرے گا؟"

"بے پھکر رہو۔ یہ سب کام کاہن سنگھ کے پاس پہنچ کر ہو جائیں گے۔ بلکہ میں نے تو اسے پہلے ہی سے کھبردار کر دیا ہے۔ وہ بڑا ہی پریمی آدمی ہے۔

سب کام ٹھیک ٹھاک کر دے گا۔"

جوالا سنگھ نے اطمینان سے سر ہلایا۔

"اچھا تو کل شام کو چل دینا چاہیئے۔ . . . . سن لو باؔئی! کوئی بہانہ واہنہ گھڑ رکھو گھر والوں کیلئے۔"

باؔئی نے مسکرا کر جواب دیا۔

"بے پھکر رہو چاچا!"

جوالا سنگھ گدھ کے پروں کی طرح اپنا کیس پھڑ پھڑاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا تو کل رات ہم وہاں پہنچے تو اصل کام کس رات کو کیا جائے گا؟"

"بس پرسوں ہی ۔ اور کب؟"

"ہاں بس ٹھیک ہے۔"

باؔئی نے لقمہ دیا

"بھلے کام میں دیر نہیں کرنی چاہیئے۔"

یہ سن کر سب ہنس پڑے۔

باؔئی کے دوستوں بشنے، کشنے اور نواب کا ذکر بھی آیا۔ لیکن اتفاق رائے سے طے ہو گیا کہ وہ اتنے اہم کام میں حصہ لینے کے قابل نہیں ہیں۔

۱۱
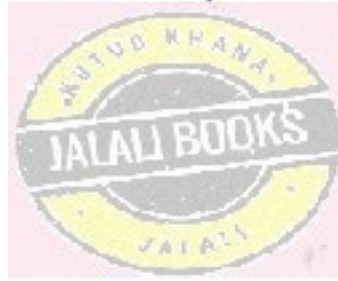
جیل سنگھ سے مشورہ کرنے کے بعد دوسرے روز پالا سنگھ ان کے ساتھ جانے کی طیاریاں کرنے میں مصروف رہا اور اسے اس بات کی خبر ہی نہیں ہوئی کہ عین اسی دن سرنوں کے گھر میں کس قدر اہم واقعہ پیش آیا اور رات کو جبکہ وہ تو چپکے سے اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھسک گیا تو ادھر حالات میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا۔

صبح کے وقت جنداں چھاہ ویلے کے مشاغل سے فرصت پا کر چوڑے تختوں والی سیڑھی کے قریب بچھی ہوئی ایک ننھی منی چارپائی پر بیٹھی سوت اٹیر رہی تھی۔ سوت کا گدھا اٹیرنے کی حرکات کے ساتھ ساتھ زمین پر لڑھکنیاں کھا رہا تھا۔ جسے پکڑنے کے لئے اُس کی بہو کا دو سالہ بچہ اِدھر اُدھر ہاتھ ہلا رہا تھا۔

گھر میں اس وقت نسبتاً خاموشی طاری تھی۔ مرد تو اپنے اپنے کام پر چلے گئے تھے۔ عورتوں کو دوپہر کے کھانے تک فرصت ہی فرصت تھی۔ گوبر سے لپا ہُوا صحن اور چو کے بڑے اُجلے اُجلے دکھائی دے رہے تھے۔ لپائی کی مٹی میں ملے ہوئے بھوسے کے ٹکڑے دیواروں پر چمک رہے تھے۔ بچے کی ماں بچے کو گدھا پکڑنے میں مصروف پا کر چوکے کی چھوٹی سی دیوار پر اکڑوں بیٹھی گنا چوسنے میں مصروف تھی۔ دُوسری اپنے ننھے کو دونوں پاؤں پر بٹھائے ہگا رہی تھی اور اس کی صفائی کے لئے دُور کونے میں بیٹھے ہوئے کتے کو کُور کُور کر کے بُلا رہی تھی۔ سیڑھی کے تختے پر بیٹھا ہُوا ایک جنگلی بِلا بڑی لطافت سے اپنی دُم کو ہوا میں ہلا رہا تھا۔ نہ معلوم وہ کس چیز کی تاک میں تھا، عام طور پہ جنگلی بلے علانیہ ایسی جگہوں پر نہیں بیٹھا کرتے لیکن اس بلے کی جرأت قابلِ داد تھی

اتنی عورتوں کی موجودگی کے باوجود گفتگو کی محفل گرم نہیں تھی۔ کبھی کبھی ایک آدھ بات ہو جاتی ورنہ ہر کوئی اپنے اپنے کام اور خیالات میں مگن تھی۔ گنا چوستے چوستے میلو کی نظر دفعتاً بلے پر جا پڑی۔ حیرت سے بولی:

"ہاؤ ہائے ..... دیکھو نی اڑیو! کتنا بڑا بلا؟"

سب نے سست آنکھوں سے بلے کی طرف دیکھا۔ ہاں خاصہ پلا ہوا تھا لیکن ہوا کرے وہ پھر اپنے اپنے دھیان میں لگ گئیں۔ بھلا میلو کو چین کہاں۔ اس نے گنے کا ایک لمبا سا چھلکا چوس کر بلے کی طرف پھینکا جو وہاں تک نہ پہنچ سکا۔ لیکن اس نے کوشش جاری رکھی۔ بالآخر ایک دو چھلکے بلے کو چھوئے بھی تو وہ ڈرا نہیں بلکہ بڑی بے اعتنائی اور تمکنت سے میلو کی طرف اس انداز سے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو" ہونہہ میں نے ایسی کئی بلیاں دیکھی ہیں۔"

اس پر میلو کو بڑا طیش آیا۔ چنانچہ گنا اسے مارنے کے انداز سے وہ اس کی طرف جھپٹی۔ بلا تو دو چھلانگوں میں چھت پر جا پہنچا۔ لیکن میلو کے پاؤں کی ٹھوکر سے اوندھی دھری ہوئی بالٹی لڑھکنے لگی۔ میلو کی ہنسی کے ساتھ لڑھکتی ہوئی بالٹی کی گڑگڑاہٹ کی آواز سن کر سرتو اندر والے کمرے سے باہر نکل آئی اور برآمدے میں کھڑی ہو کر صحن کی طرف چندھی آنکھوں سے دیکھنے لگی۔

معمول کے مطابق اس روز بھی وہ دیر سے جاگی تھی۔ جاگتے ہی وہ اٹھ کر بیٹھ تو جاتی لیکن آنکھیں نہ کھلتی تھیں۔ گرمیوں میں تو وہ چھت پر سے اُتر کر کبھی برآمدے میں بیٹھتی۔ کبھی سیڑھی کے تختے پر ہی بیٹھ کر نیچے صحن میں ادھر اُدھر نگاہیں دوڑانے لگتی اور موسم سرما میں جب اس کی آنکھ کھلتی تو بھی نیند کا غلبہ اس قدر زیادہ ہوتا تھا کہ وہ دروازے میں سے باہر کی جانب تیز دھوپ کی طرف لمحہ بھر کو نہیں دیکھ سکتی تھی۔ چنانچہ وہ بستر پر ہی لوٹتی رہتی۔ کبھی اونگھ کر ایک جانب کو گرتی کبھی دوسری جانب کو۔ اب بھی وہ اسی کیفیت میں تھی کہ صحن سے شور سن کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

میلو نے سرتوں کو برآمدے میں دیکھا تو پھر دیوار پر بیٹھتی ہوئی بولی:

"رکھاں گوراں دیاں ..... دیکھو تو مرنی رانی بھی اُٹھ بیٹھی۔"

"مرنی رانی" کے الفاظ میں بھی تلخی پوشیدہ تھی۔ ان دونوں کو چنداں کی برتری

ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ لیکن اس کا تو کچھ بگاڑ ہی نہ سکتی تھیں۔ اس لئے دل ہی دل میں سرتوں سے جلتی تھیں اور پھر سرتوں کی یہ عیش و آرام کی زندگی تو ان کے دلوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی۔ وہ بھی زمانہ تھا جب وہ اپنے اپنے والدین کے گھر میں اسی بے پروائی کے ساتھ زندگی بسر کرتی تھیں۔ کام وام اپنی مرضی سے کرتی تھیں۔ انہیں اس جگہ کوئی خاص تکلیف نہیں تھی۔ لیکن نہ معلوم کیوں انہیں میکے میں گزارے ہوئے دن ہی یاد آتے تھے۔ محض انہی کی یاد دل کو سہانی معلوم ہوتی تھی۔

سرتوں کچھ دیر تک برآمدے میں کھڑی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر ادھر ادھر دیکھتی رہی۔ ایک دم روشنی میں آجانے کے باعث اس کی آنکھیں ابھی نہیں کھل رہی تھیں صحن میں کوئی خاص بات نہ دیکھ کر اس نے پوچھا:

"کیا بات ہے؟"

چنداں نے سوت کے بل درست کرتے ہوئے کہا:

"کچھ نہیں بیٹا! کچھ نہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یونہی بیٹھے بٹھائے میلو کو شرارتیں سوجھتی رہتی ہیں۔"

میلو نے چپ رہنا مناسب نہ سمجھا۔

"اری سرتوں! یہ بڑا بلا تھا، جنگلی بلا تو نے تو دیکھا ہوگا۔ بٹیا رے کالے رنگ کا۔ ۔ ۔ ۔ پارسال سا ہنسوں نے مار جان کھپا دی۔ لیکن یہ بلا ایسا بدماش ہے کہ ان کے قابو ہی میں نہیں آیا۔ اب جو یہاں آکر بیٹھا تو میں اسے یہ بڑے بڑے جھلڑ مارتی رہی۔ لیکن وہ بھی ایسا نڈر ہے کہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرے میکے میں بھی۔ ۔ ۔ ۔"

سرتوں کو بلوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے آنکھ مل مل کر انہیں کھولنا شروع کیا۔ اس وقت اس کے بال بے ترتیب ہو رہے تھے۔ چہرے کی رنگت پر ہلکی سی دھندلاہٹ بہت بھلی دکھائی دیتی تھی۔ چندری اس کے پیچھے پیچھے گھسٹتی چلی آرہی تھی۔ سلوار کے رنگین آزاربند کے پھندنے ادھر ادھر جھول رہے تھے۔ یوں بھی ہمیشہ کی طرح آزاربند کے ڈھیلے ہو جانے کے باعث سلوار کمر سے کھسک کر اس کے پھیلے ہوئے کولھوں پر آن کے اٹک رہی تھی۔ اس کی قمیص کے فیشن میں بھی شہر کی جھلک نظر آرہی تھی یعنی کمر کے قریب دونوں پہلوؤں پر کپڑے میں بل ڈال کر کچھ اس انداز سے سی دیا گیا تھا کہ قمیص کے

سامنے کا حصہ کھینچ کر پیٹ سے جا لگا تھا۔ دبے ہوئے پیٹ کے اُوپر پسلیاں ابھر گویا دفعتاً فلک بوس بلندیوں کی اٹھان شروع ہو جاتی تھی۔ وہ پاؤں نیچے ٹکا کر برآمدے ہی میں بیٹھ گئی۔ پہلے اُس نے دونوں بازوؤں میں سر چھپائے رکھا اور پھر سر اُٹھا کر قدرے اُلجھے ہوئے بے ترتیب بالوں میں کانوں کے اُوپر سے اُنگلیوں سے کنگھی کرنے لگی۔

جنداں نے اٹیرنا گھماتے گھماتے بیٹی کی جانب کن انکھیوں سے دیکھا اور کہنے لگی:

"سرفی بیٹا، آج بال وال دھو ڈالو۔ لو اب کے بہت دن گزر گئے ہیں۔ پانچ.... نہیں چھ دن....."

اب سرتوں کی آنکھیں اچھی طرح کھل گئی تھیں۔ اُس نے پپوٹے جھپکاتے ہوئے ماں کی طرف دیکھا اور خراب ناک آواز میں جواب دیا۔

"ہاں بے بے آج دھو ڈالوں گی۔"

جنداں نے ایک گھٹنا اوپر اُٹھا کر تکان زدہ بازو کی کہنی کو اس پر رکھتے ہوئے پوچھا

"پر سرتوں میں پوچھو ہوں تو اتنی سُست کیوں ہو گئی ہے؟"

سرتوں نے شکایت آمیز لہجے میں کہا

"لو بے بے اتنی بار کہہ چکی ہوں کہ مجھے جلدی سے جگا دیا کرو، خود ہی نہیں جگاتیں۔ اب میں کیا کروں۔ ایسی گہری نیند آتی ہے کہ بس۔"

"نہیں میں سونے کی بات نہیں کہہ رہی۔ یونہی تو کچھ اپنے آپ میں مگن رہتی ہے کھوئی کھوئی سی۔ بیٹا سب کام دھیان سے کرنے چاہئیں۔"

کبھی کبھی ماں باپ محض کچھ نہ کچھ کہنے کے لئے بولنے لگتے ہیں۔ سرتوں نے اس بات کو کوئی اہمیت نہ دی اور حقیقت بھی یہی تھی۔ جنداں کو بھی کوئی شکایت نہیں تھی۔ اُس نے یونہی کہہ دی یہ بات۔ ان دونوں کو موضوع کے غیر اہم ہونے کا احساس تھا۔ اس لئے بات اس سے آگے نہیں بڑھی اور ایک مرتبہ پھر چند لمحوں کے لئے سکوت طاری ہو گیا۔

جنداں نے سرتوں کو اُنگلیاں چٹخاتے دیکھ کر مشورہ دیا۔

"اب کچھ کھانے پینے سے پہلے تو اس کام سے نپٹ کیوں نہیں لیتی۔ کیسی مزے کی دُھوپ ہے۔ گھر میں کوئی بے بھی نہیں۔ نل کے قریب چارپائیاں کھڑی کرکے اور لگے

ہاتھوں اشنان کے ساتھ بال بھی دھو ڈال۔ کھوٹی لسی بھی پڑی ہے۔ پر لسی کی ضرورت بھی کیا ہے۔ تیرے بالوں میں میل تو ہے نہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بھکل (آبخورہ) میں سے دہی لے لے اور اس میں سرسوں کا تیل ڈال کر بال دھو ڈال ۔ ۔ ۔ گھڑی کی گھڑی دھوپ میں بیٹھے گی تو سُوکھ جائیں گے ۔ ۔ ۔ ۔ پھر سارا دن جوجی میں آئے کیجو ۔"

سرتوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ کچھ دیر تک ٹانگیں اور بازو اکڑاتی اور اُنگلیاں چٹخاتی رہی۔ پھر اُٹھی اور ننگے پاؤں چلتی ہوئی نل کے قریب پہنچی اور دستہ ہلا ہلا کر پانی کی بالٹیاں بھرنے لگی۔ پانی بھر کر اُس نے دو چار پائیاں نل کے دونوں طرف اس انداز سے کھڑی کر دیں کہ نل کے سوا ہر طرف سے اوجھل ہو جائے۔ بڑے آرام سے ٹہلتی ہوئی وہ نئی قمیص، دُھلی ہوئی سلوار، گھر کی سلی ہوئی باریک کپڑے کی بنیائن، ماں کا میلا دوپٹہ، تیل ملا دہی اور سلیپر وغیرہ کل ضروری سامان لے کر وہ چارپائیوں کے بیچ میں جا کھڑی ہوئی۔ اس وقت اُس نے بنیائن نہیں پہن رکھی تھی۔ اس لئے جب اُس نے دُھوپ کی طرف مُنہ کر کے قمیص کا ایک بٹن کھول ڈالا تو چھاتیوں سے اُوپر اور گردن کے نچلے حصے پر اسے سُورج کی کرنوں کی آرام دہ حرارت محسوس ہونے لگی۔ نسبتاً گرم ہوا کے جھونکے اس کی بغلوں میں اُگے ہوئے باریک بالوں میں گھس کر اسے گدگدانے لگے اور اس کے قدرے خشک ہونٹوں پر دلفریب مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

سر کی اگلی جانب اُگے ہوئے بالوں کی ایک لٹ اُس کی آنکھ کے اُوپر آن گری۔ اُس نے اسے بڑی ادا سے سر کی ایک جنبش کے ساتھ پیچھے گرا دیا۔ گاؤں کی لڑکیاں ایسی حرکت نہیں کیا کرتی تھیں۔ لیکن شہری لڑکیوں میں بعض شوقین مزاج اسی طرح بالوں کو پیچھے کی جانب پھینکا کرتی تھیں۔ اُس نے شانے پر سے ہاتھ پچھلی طرف بڑھایا اور لمبی چوٹی کو آگے کھینچ کر اسے آہستہ آہستہ کھولنے لگی۔ اسے کسی بات کی جلدی نہیں تھی۔ مَردوں کے واپس آنے کی ابھی کوئی توقع ہی نہیں تھی۔ چنانچہ وہ بڑے مزے مزے سے اپنا کام کر رہی تھی۔ اس کی نازک اُجلی اُنگلیاں کبھی بالوں کی لٹ آہستہ سے باہر کھینچتیں اور کبھی ایک دم ساکت ہو جاتیں۔

اس طرح اپنے خیالات میں مگن او رآپ ہی آپ مسکراتے ہوئے وہ اپنے کام میں مصروف تھی کہ صحن کے بند دروازے پر کھٹکا ہُوا۔ میتّو نے کنا چُپ سا بند کر دیا اور چلّا کر بولی:

"کون؟"

"میں ہوں"۔ ایک نازک زنانہ آواز سُنائی دی۔

"میں کون؟" میتّو نے شرارت سے ڈانٹا۔

"میں ـــ رکھی۔"

سرتوں نے بے چینی سے چلّا کر کہا۔

"بے کھول نہ دروا جا ـــ میری سہیلی آئی ہے۔"

میتّو نے دروازہ کھول دیا اور چلبلی رکھی گود میں بچّہ اُٹھائے کمر مٹکاتی اور گہرے نیلے رنگ کا تہبند لہراتی اندر داخل ہوئی۔ اُس نے پیلے پیلے ننھے لیکن خوبصورت دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے پُوچھا:

"اری کیا ہو رہا ہے۔ دن دہاڑے دروازے بند کر رکھے ہیں تم لوگوں نے۔"

"اے ہونا کیا ہے۔ دیکھ تو میں بال دھونے لگی ہوں" سرتوں نے پھول کی طرح کھل کر جواب دیا۔

تھوڑی دیر تک تو سب عورتوں کے درمیان خوب چہل پہل ہوتی رہی لیکن جلد ہی پہلے والی فضا طاری ہوگئی۔

اس گھر میں رکھی کو بس سرتوں ہی سے محبت تو تھی۔ چنانچہ وہ نل کے قریب چارپائی کی پٹی سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔ سرتوں کی اُنگلیاں چوٹی کے نیچے سے ہوتی ہوئی اوپر تک پہنچ چکی تھیں۔ جہاں اس کی نظریں نہ پہنچ سکتی تھیں۔ بالوں کی کوئی گرہ ایسی سخت پڑ گئی تھی کہ سلجھنے ہی میں نہ آتی تھی۔ رکھی نے باتیں کرتے دفعتاً کہا:

"لا ہشا ہاتھ میں کھولے دیتی ہوں۔"

اُس نے اپنا بچّہ زمین پر بٹھا دیا۔ بچّہ بھی بڑا کھلنڈرا تھا۔ گود سے اُترنے کی دیر تھی کہ چابی کی موٹر کی طرح ایک طرف چل نکلا۔

رکھی اس کے بالوں کو سلجھاتی رہی۔ اور وہ دونوں ہنس ہنس کر چپکے چپکے آپس

کی باتیں بھی کرتی رہیں۔ سرتوں گدی کے بالوں کے اندر گھومتی ہوئی رکھی کی ٹھنڈی سی انگلیوں سے بڑی راحت محسوس کر رہی تھی۔ جب ایک مرتبہ چوٹی کھل گئی تو رکھی نے دونوں ہاتھوں سے اُس کے لمبے گھنے بال ہوا میں لہرا دیئے۔ خشک بال بکھر کر یوں معلوم ہونے لگے جیسے ہوا داخل ہو جانے کے باعث پھول گئے ہوں اور ان میں دمکتا ہُوا سرتوں کا چہرہ جیسے کالی گھٹاؤں سے دفعتاً پورا چاند باہر نکل آیا ہو۔

سرتوں نے خوش ہو کر سر کو دائیں بائیں ہلکے ہلکے جھٹکے دیئے اور رکھی کا بازو سرتوں کی چھاتیوں پر سے ہوتا ہُوا اس کی بغل میں جا اٹکا اور پھر اس نے اپنی جانب کھینچ کر اس کے کان میں نہ معلوم کیا کہا کہ دونوں حسین صورتیں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

اب سرتوں قمیص اتارنے کے لئے نیچے بیٹھ گئی۔ آستینوں میں سے بازو نکال اُس نے قمیص کو دو پلوؤں سے پکڑ کر جوں اُوپر کھینچا تو پہلے تو قمیص کی کمر کا تنگ حصہ اُس کی چھاتیوں پر پھنس گیا اور پھر اُوپر سے رکھی نے ہاتھ بڑھا کر اسے کھینچنے میں جو مدد کی تو اس کش مکش میں نہ سرتوں کو اور نہ رکھی کو اس بات کا علم ہُوا کہ کب ایک تہ شدہ کاغذ جو اُس کے دونوں پستانوں کے بیچ میں پھنسا ہُوا تھا کھسک کر نیچے جا پڑا اور پھر سرتوں کے پَیر کی ایک انجانی ٹھوکر سے پرے ہٹ کر چارپائی کی پٹی کی اوٹ میں چلا گیا۔

وہ دونوں ہنس ہنس کر باتیں کرتی رہیں۔ سرتوں نے سر میں دہی ڈالا اور بالوں کو زور زور سے ملنے لگی۔ دو منٹ مل چکی تو نیچے سے چلا کر بولی:

"رکھی کی بچی باتیں بنائے جا رہی ہے ذرا ہتھی تو ہلا نل کی۔۔۔۔ بالوں میں پانی بھی تو پڑنا چاہیئے۔"

"ہے ہے دو بالٹیاں پانی بھرا ہُوا دھرا ہے۔ اسی میں سے لے نا یہ رہا چھنا۔"

سرتوں مچل کر بولی:

"ناں بھئی۔۔۔۔ اس طرح مزا نہیں آتا نا۔ نل کی دھار تلے سر دھرنے کو جی چاہتا ہے۔"

رکھی نے چڑانے کے لئے کہا:

"میں چلی آئی تو تو مجا تلاش کرنے لگی۔ جو میں نہ آتی تو بالٹی ہی میں سے

پانی پیتی نا۔"

"ہاں اب تو آ گئی ہے تو۔"

"تو میں تیری نوکرانی نہیں ہوں۔۔۔۔۔"

تیل علاوہ ہی سرنوں کی آنکھوں میں گھس کر چڑاند پیدا کر رہا تھا۔ اُس نے پریشان ہو کر بمنت کہا:

"میری بہن تو ہے نا۔ بھئی دیکھ تیری خو[illegible] رہی ہوں۔ ذرا دستی ہلا دے نا رکی۔"

رکھی نے اس کی آواز میں لجاجت کا احساس کرکے ہنسی دباتے ہوئے نل کی دستی ہلانی شروع کر دی

سرنوں راحت اور مسرت کے مارے ہنسنے اور چیخنے لگی۔ جنداں دُور بیٹھی آپ ہی آپ مسکرائے جا رہی تھی۔ اس کا دھیان اپنے کام کی طرف تھا لیکن کانوں سے انبساط بھری آوازیں سُن سُن کر لبوں پر ان جانے طور پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ دونوں۔۔ سہیلیاں بچپن ہی سے چہلیں کرتی چلی آئی تھیں اور وہ انھیں اس طرح لڑتے بھڑتے ایک دوسرے کو چھیڑتے اور تنگ کرتے ہوئے دیکھنے کی عادی ہو چکی تھی۔

رفعتاً رکھی نے ہاتھ روک لئے اور بڑے پیارے انداز سے ناک چڑھا کر بولی:

"لاڈو رانی اب بس بھی تو کہہ دے۔ میری بانہیں دُکھنے لگی ہیں اور تم ہو کہ سر نیچے ڈالے بیٹھی ہو۔ وہی کب کا بالوں میں سے نکل گیا ہے۔۔۔۔"

"بڑا مزا آ رہا ہے۔"

رکھی کو بگڑنے یا سنورتے کچھ دیر نہ لگتی تھی۔

"بھاڑ میں جائے تمہارا مزا۔۔۔۔ بانہیں تو مار کے ہنپا دیا ہمیں۔"

"اچھا۔۔۔۔ اچھا میری بہن۔۔۔۔" سرنوں نے لجاجت سے کہنا شروع کیا۔ "کہو میرے بال تو دُھل گئے ہیں نا خوب اچھی طرح سے۔۔۔"

رکھی نے اپنی ناک کے بائیں نتھنے پر جگمگاتی ہوئی کیل کو ہاتھ سے چھوتے ہوئے کہا "ہاں ہاں بہت اچھے ہو گئے ہیں۔"

سرتوں نے بالوں کو نچوڑ کر گدی پہ گول جوڑا کرلیا۔ اُس نے تھوڑا سا تیل ملا دہی بچا لیا تھا۔
پلکوں سے پانی کی بوندوں کو پونچھتے ہوئے اُس نے رکھی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ادھر آ میری بلّو! تھوڑا سا کام اور ہے۔ ۔ ۔ ۔"

رکھی بدک کر بولی:

"ناں بھئی اب میں گھر جاؤں گی۔ یونہی ادھر سے گزری تو سوچا تم سے دو دو باتیں کرتی
جاؤں لیکن تم نے تو آتے ہی خدمت لینی شروع کر دی۔"

سرتوں نے خوشامدانہ کہا:

"بس یہ دہی مل دو میرے بدن پر۔ اپنے ہاتھ سے نہ تو اچھی طرح ملا جاتا ہے اور
نہ کچھ مزا آتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

رکھی نے اپنا گول چہرہ آگے بڑھایا اور شریر نظروں سے اس کے ننگے بدن کو سر سے
پاؤں تک دیکھا اور سرگوشی میں بولی:

"نا بہناں! اب ہمارے ملے سے کچھ نہ ہوگا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب تو کوئی اور ہی آئے گا۔"

سرتوں جنگلی بلّی کی سی تیزی کے ساتھ اس کی لہراتی ہوئی چوٹی پکڑ کر اسے اپنی طرف
کھینچنے لگی۔

"بدمعاش کہیں کی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دیکھ اب میں بالٹی میں ڈبو دوں گی تیرا سر۔ ۔ ۔ یاد رکھیو۔"

رکھی کا سر آگے کو جھک گیا تھا۔ وہ بُری طرح اس کی گرفت میں آ چکی تھی۔

"چھوڑ۔ ۔ ۔ ۔ چھوڑ مجھے۔"

"نہیں اب تو ڈبو کے چھوڑوں گی۔ تیری ان دھمکیوں کی کچھ پروا نہیں مجھے۔"

"ہائے اللہ میں دھمکی کب دے رہی ہوں۔"

سرتوں کے ہاتھوں میں اس کے بال مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے۔
اور ہونٹوں پر ہنسی تھی۔

سرتوں کی ماں دور سے بول اٹھی۔

"اری کم بختو! اتنی بڑی ہو گئی ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور پھر بھی بھینسوں کی طرح لڑنا نہیں
چھوڑتیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

رکھتی قابو میں آچکی تھی۔ منت کرنے لگی۔

"اے میری بہن۔ . . . تو میری بڑی بہن۔ اتنی سردی میں میرے کپڑے مت بھگوئیو۔"

"اچھا تو میرے بدن پر مالش کرے گی بھی یا نہیں۔"

"ہاں ہاں کروں گی۔"

"کھا قسم۔"

"قسم ہے۔"

"پھر شرارت؟" سرتوں نے ایک اور جھٹکا دیا۔ "قسم کھا کسی کی۔"

"کس کی کھاؤں۔"

"نواب کی کھا۔ . . ." سرتوں نے چپکے سے کہا۔

شادی سے پہلے رکھتی نواب پر لٹو ہو گئی تھی اور بعض کا خیال تھا کہ اب بھی ان دونوں میں اٹ مٹ ہے۔

رکھتی سٹ پٹا کر بولی:

"اب چھوڑ دے اللہ قسم رو دوں گی میں۔"

"ہا ہائے میری بلو روئے گی۔ دیکھوں تو منہ۔"

وہ گردن جھکا کر اُس کا منہ دیکھنے کی کوشش کرنے لگی۔

"رو کے دکھائیو ذرا۔"

اور جب سرتوں نے اس کی چوٹی چھوڑ دی تو رکھتی ٹھینگا دکھا کر فرار ہونے لگی۔ اب سرتوں نے خوشامد کی۔

"دیکھو میری بہن نہیں . . . . بڑی بہن۔"

سرتوں کی ماں کی آواز آئی:

"دیکھو لوگو! کیسی لڑکیاں ہیں یہ۔ کوئی پوچھے تم سے نچلا نہیں بیٹھا جاتا؟ کہو اب تم ننھی مُنھی بچیاں تو نہیں ہو۔ کیوں بیٹا رکھی! بات کیا ہے۔"

"کچھ نہیں تائی!"

یہ کہہ کر رکھتی بھی اُچک کر دو چارپائیوں کے بیچ میں گھس کر بیٹھ گئی اور اس کے

بدن پر دہی ملنے لگی۔

"دیکھ ری تو نیچے بیٹھ میں چوکی کے باہر بیٹھوں گی۔ دہی کے چھینٹے بھی مت اڑا میری لنگری (تہبند) خراب ہو جائے گی۔"

وہ اس کے بدن پر دہی ملتی رہی۔ سرتوں کو اپنے بدن سے تپش سی نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔ رکھی کی دہی والی ملائم اور نازک انگلیوں کے لمس سے سرتوں کو بدن کے حساس حصّوں پر عجیب راحت اور لذت انگیز گدگداہٹ محسوس ہوتی تو اس کی آنکھوں میں نمی سی آجاتی اور بدن کسمسا کر رہ جاتا۔

دہی ملنے کے بعد جب اُس نے غسل کیا تو وہ شبنم سے دُھلی دھلائی گلاب کی کلی کے مانند دکھائی دینے لگی۔

سرتوں کپڑے پہننے لگی تو رکھی واپس جانے کے لئے اپنے پیچے کی طرف لپکی۔ سرتوں بولی:

"اے رکھی، ابھی بیٹھ نا جلدی ہی کیا ہے۔"

"ناں بھئی اب تو میں چلی۔"

"پھر کب ملوگی۔" سرتوں نے پیچھے سے پکار کر کہا۔

صحن کے دروازے میں سے باہر کو جاتی ہوئی رکھی پکاری۔

"ہے رانی تم ہی ملو نہ آکر۔"

وہ دروازے سے نکل چکی تھی۔ اس لئے سرتوں نے اور بھی بلند آواز میں چلّا کر کہا۔

"دوپہر کو آؤں گی۔"

"اچھا ہو۔" کہیں گلی سے آواز آئی۔

جنداں نے سوت اٹیرتے اٹیرتے اپنے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"واہگورو! واہگورو غضب کی لڑکیاں ہیں یہ بھی۔"

سرتوں سلیپر پھٹپھٹاتی، چھاتیاں تھرکاتی اور قمیص کے بٹن بند کرتی ہوئی برآمدے کی طرف آئی۔ اُونچی جگہ پر کھڑے ہو کر اُس نے جُوڑا کھول کر بال نیچے لٹکائے چند لمحوں تک ان میں سے پانی کی بُوندیں ٹپکتی رہیں۔ ماں کے میلے دوپٹے سے اس نے انہیں خوب اچھی

طرح نچوڑ نچوڑ کر پونچھا۔ شانوں پر قمیص پھیلا کر بال پیچھے کی طرف پھینک دئے۔۔۔۔

اور اس وقت اسے یاد آیا کہ وہ بنیائن پہننا تو بھول ہی گئی تھی۔ اُس نے سوچا چلو جانے دو۔ اب کون پہنے۔ وہ بھاگ کر چارپائی سے بنیائن اٹھا لائی۔ اسے کھونٹی پر لٹکا کر وہ آنکھوں میں کاجل لگانے کے لئے پسار میں چلی گئی۔

ایک اُونچے موڑھے پر بیٹھ کر اُس نے بڑا سا آئینہ اپنے سامنے چارپائی پر رکھ دیا جب اُس نے اُس کے اندر اپنے چہرے کی جھلک دیکھی تو اُس نے سوچا کہ اس شیشے کی آب بری نہیں حالانکہ پہلے پہل جب اُس کا باپ اسے شہر سے خرید کر لایا تھا تو وہ اس کا بھدا چوڑا فریم جس پر پیلے پیلے پھول بنے ہوئے تھے۔ دیکھ کر بہت مایوس ہوئی مگر بعد میں جب اُس نے اس میں چہرہ دیکھا تو باپ کے ذوقِ انتخاب کی قائل ہو گئی۔

کاجل کی سلائی آنکھ میں گھما کر وہ اسے باہر نکالتے وقت آنکھ کے گوشے پر ایک چھوٹی سی مہین لکیر کھینچ دیتی۔ اس طرح آنکھوں کی لمبائی زیادہ معلوم ہونے لگتی اور وہ زیادہ کٹیلی ہو جاتی تھیں۔

ہر نوجوان رومان پسند لڑکی کی طرح وہ خوابناک نظروں سے آئینے میں اپنی صورت دیکھتی رہی لیکن اس کا ذہن حاضر نہیں تھا۔ وہ نہ معلوم کہاں گم تھا۔ ہر چیز پر غبار سا چھایا ہوا تھا۔ لہلہاتی شاداب کھیتیاں، پانی کے چھینٹے اڑاتے اور روں روں کرتے رہٹ، تا حدِ نگاہ پھیلی ہوئی پیلی پیلی سرسوں، شبنم میں نہائے ہوئے پھول۔ کپاس کے ٹروڈے اور اُن کے پودوں کی پتیوں اور شاخوں میں سے اُٹھتی ہوئی بھاپ، شرینہ کے درختوں کے سائے، اور لہراتے ہوئے رنگ برنگے دوپٹے۔۔۔۔۔

سرتوں کو کچھ یاد آیا وہ اٹھ کر اندر والے کمرے میں گئی۔ ایک رنگ دار ڈھکنے والی چھوٹی سی ٹوکری میں سونے کا ہار نکالا۔ یہ ہار منکو کا تھا جو اُس نے اُس کے باپ کو شہر سے چھوٹا کروانے کے لئے دیا تھا۔ آئینے کے سامنے بیٹھ کر اُس نے ہار گلے میں ڈال لیا۔ قمیص کے بٹن کھول کر وہ اپنی اجلی بیسنی جلد پر سونے کے زرد زرد منکوں کی بہار دیکھنے لگی۔ منکے نیچے کو گرتے ہوئے اس کی چھاتیوں کی بلندیوں پر نہ چڑھ سکے اور ڈھلک کر دونوں پستانوں کے درمیان نسبتاً اجلی جگہ پر رک گئے۔ اُس نے جھک کر منکوں کی قطار کی طرف دیکھا

تو اُسے یُوں معلوم ہُوا جیسے اس کی چھاتیاں انہی مٹکوں کا رنگ و روپ لے کر اُوپر کی جانب اُبھر آئی تھیں۔ . . . . ایک مرتبہ پھر وہ اپنے رنگین خوابوں میں کھوگئی۔

باہر حسبِ معمول خاموشی طاری تھی۔ دیواروں پر بیٹھے کوّے بے تحاشا کائیں کائیں کئے جارہے تھے۔ ان میں سے بعض نل کے قریب اِدھر اُدھر گری ہوئی دہی کی پھٹکیوں پر چونچ مارنے کے لئے وہاں پہنچ کر پَر پھڑ پھڑانے لگے۔ ایک آدھی پھٹکی تر شدہ کاغذ کے سہرے پر بھی جاگری تھی۔ چونچ لگنے پر کاغذ چارپائی کی پٹی سے باہر نکل آیا اور ہوا کے تیز جھونکے سے بالشت دو بالشت پرے جاگرا۔

دفعتاً جنداں کو یاد آیا کہ اُس نے زمین دوز انگیٹھی پر، جس میں کہ دودھ سے بھری ہُوئی مٹی کی ہانڈی رکھی تھی، چاپڑ (مٹی کا ڈھکنا) نہیں دھرا تھا۔ اُس نے کسی کو کہنے کے لئے اِدھر اُدھر دیکھا لیکن مینکو وغیرہ بھی نہ معلوم کہاں کو چل دی تھیں۔ چھت پر تھیں یا اپنے اپنے گھر کے اندر۔ سرّاں بھی قریب دکھائی نہ دی تو اس نے خود ہی اُٹھ کر چولے کے قریب ہی ہوئی زمین دوز انگیٹھی پر چاپڑ رکھ دیا۔ اور جب واپس لوٹی تو اس کی نگاہ اس کاغذ پر جا پڑی۔ یُوں کاغذ کو دیکھ کر اسے کچھ بھی خیال نہ آتا لیکن چونکہ یہ اچھی طرح تہ کیا ہُوا تھا۔ اس لئے اُس نے یہ سمجھ کر کہ ممکن ہے ان کے کُنبے میں سے کسی کی چٹھی گر پڑی ہو۔ اُس نے اُسے اوُپر اُٹھالیا۔ لیکن وہ کاغذ معمولی نہیں تھا بلکہ ہلکے گلابی رنگ کا ایسا نفیس کاغذ پہلے کبھی اس کی نظروں ہی سے نہیں گزرا تھا۔ اُسے کچھ تعجب ہُوا۔ وہ چارپائی پر آن کر بیٹھ گئی۔ اس کی نظر اب ذرا کمزور ہوگئی تھی۔ لیکن چٹھی نہایت خوش خط گورمکھی حروف میں لکھی تھی۔ اس لئے اسے پڑھنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی۔

پہلی سطر پڑھتے ہی اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اور ایک دفعہ تو یُوں محسوس ہُوا جیسے وہ اس کے آگے کچھ نہ پڑھ سکے گی۔ اُس نے ہاتھ نیچے جُھکا لیا۔ چاروں طرف نظر دوڑا کر دیکھا۔ وہاں کوئی شخص موجود نہیں تھا۔ پھر اُس نے ایک مرتبہ جلدی جلدی ساری چٹھی پڑھ ڈالی۔ مضمون یہ تھا:

جان سے پیاری میری اور صرف میری سرن!

شنو! میرے دل کی ملکہ! میرے دل کی دھڑکن شنو۔ یہ دل ہر گھڑی اور ہر لمحہ تمہیں

یاد کرتا ہے۔ اب میں تم سے کتنی مرتبہ کہوں اور کس طرح یقین دلاؤں کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ محبت کیا کرتا ہوں۔ تمہاری نگاہِ کرم کا بھکاری تمہارے پیروں میں سر جھکانے والا غلام ہوں۔ ساری ساری رات نیند نہیں آتی تمہاری یاد میں تارے گنتا رہتا ہوں۔ تمہاری حسین اور موہنی صورت ایک گھڑی کو بھی تو آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوتی۔ میری رانی! میری جان!! تم لکھتی ہو کہ تم بھی غلام پر فدا ہو تو پھر بتاؤ اپنی جدائی میں مجھے اس قدر تڑپاتی کیوں ہو۔ ظالم تم کیا جانو۔ عشق کیا بلا ہوتی ہے۔ بس کہیں سے عشق کا نام سُن لیا ہے۔ مجھے دن میں کم از کم ایک مرتبہ اپنے نازک ہاتھوں سے لکھا ہُوا خیریت کا پیغام تو بھیج دیا کرو۔ لو رخصت

میری جانب سے اپنے ہونٹوں۔ رخساروں، آنکھوں بلکہ سارے جسم کے ایک ایک حصے پر سو سو بوسے قبول کرو۔

تمہارا اور محض تمہارا

پرتھی پال سنگھ

جنداں سلجھے ہوئے مذاق کی عورت تھی اسے چٹھی کے الفاظ میں تصنع کی بُو آئی شہری مرد کی ساری بناوٹ اور دکھاوا اس میں موجود تھا۔ اس نے چٹھی کو بار بار پڑھا۔ بدنامی کا جو خطرہ اس وقت ان کے سر پر منڈلا رہا تھا۔ اسے اس بات کا بخوبی احساس ہو گیا تھا۔ اسے سب کام وام بھول گئے اٹیرنا ایک طرف رکھ کر ہاتھ میں کاغذ بھینچے وہ گھر کے اندر داخل ہوئی۔

بسار میں بیٹھی ہوئی سرنوں ماں کی دفعتاً آمد پر گھبرا گئی۔ اُس نے نیم عریاں چھاتیوں پر پڑے ہوئے سرد منکوں کو مٹھی میں بھینچ لیا۔ لیکن جنداں اس کی طرف دیکھے بغیر اندر والے کمرے کی طرف لپکی ہوئی چلی گئی اور چلتے چلتے بولی:

"سرنوں! ذرا اندر آیو"

سرنوں کو ماں کی آواز میں کچھ عجیب سا تغیر محسوس ہوا۔ اس نے چپکے سے ہار اتارا اور اسے ٹوکری میں بند کر کے ایک طرف کو کھسکا دیا۔

اندر پہنچ کر جنداں بڑے پلنگ پر بیٹھ گئی۔

کمرے میں روشنی کے لئے چھت پر گھڑ تھا جو اس وقت ڈھکا ہوا تھا یا اُوپر کی جانب پچھلی دیوار پر چھوٹی رکابی کے برابر گول سوراخ تھا۔ اس لئے روشنی نہائت مدھم تھی۔ تیز روشنی سے ایک دم مدھم روشنی میں آجانے کے باعث کچھ دیر تک ان کو ایک دُوسری کی صُورتیں دُھندلی دکھائی دیتی رہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جندآں کے دل پر اس واقعہ کا بہت سخت اثر ہوا تھا۔ اس کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں تھی۔ اُس نے خود بارہا اپنے خاوند کو مشورہ دیا تھا کہ جوان لڑکی کا اس قدر طویل عرصے تک گھر میں بٹھائے رکھنا مناسب نہیں۔ اتنی سی فکر ہر والدین کو ہوتی ہے۔ گھر میں بے شک پالی، پرتھی اور دیگر چند جوان لڑکوں کی آمدورفت بھی تھی۔ لیکن چونکہ وہ ان سب باتوں پر کڑی نگاہ رکھتی تھی۔ اس لئے اسے کبھی وہم بھی نہ ہوا تھا کہ اندر نہ صرف کھچڑی پک رہی ہے بلکہ نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی۔ یوں بھی اُس نے ایک آدھ مرتبہ سرتوں اور پرتھی پال کے بارے میں اُڑتی افواہ سُنی تھی۔ اُس نے ان پر کبھی یقین نہ کیا۔ وہ کہتی "بہن! اس دُنیا میں کسی کا کچھ بھی نہ بگاڑو تو بھی کوئی نہ کوئی بیری ضرور ہوتا ہے جو کسی نہ کسی طرح اپنے دل کا کھوٹ نکالتا رہتا ہے۔" سب کو اس کی بات کا یقین آجاتا۔ سب لوگوں کا خیال تھا کہ چونکہ اب ان کے پاس بہت سا پیسہ آگیا ہے اور پھر جندآں کے نہ سہی رنجن سنگھ کے مزاج میں تکبّر کی بُو بھی ہے۔ اس لئے ان کے شریک حسد کرتے ہیں اور اِدھر اُدھر کی گپ اُڑا دیتے ہیں۔ بہو بیٹیوں والے لوگ بلا ثبوت دوسروں کی آبرو کا خاکہ نہیں اُڑاتے تاکہ ان کی اپنی عزت پر حرف نہ آئے۔ اب جندآں کو معلوم ہُوا کہ ضرور کسی نے دونوں کو مشکوک حالت میں دیکھا ہوگا۔ ورنہ یہ بات جھوٹ موٹ بھی نہ اُڑتی۔ اس خیال سے کہ اگر واقعی کوئی معتبر آدمی ان دونوں کو ساتھ ساتھ دیکھ لیتا، تو اب تک سارے گاؤں ہی میں نہیں بلکہ دُور دُور تک ان کے جاننے والوں میں اس بات کی تشہیر ہو جاتی جندآں اس قسم کی باتوں سے اتنا ہی ڈرتی تھی جتنا کہ عزت آبرو والے گھرانوں کو ڈرنا چاہیئے۔

چند لمحوں تک ماں بیٹی آمنے سامنے چُپ چاپ بیٹھی رہیں۔ یہ غیر معمولی خاموشی دیکھ کر سرتوں کا دل بھی دھڑک رہا تھا کہ نہ جانے اس میں کیا بھید ہے اور اب کیا ہونے والا

ہے۔ ادھر جنداں کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا ذہن بالکل مفلوج ہو گیا ہو۔ حالات میں اچانک تغیر پیدا ہو جانے پر اس کے دل میں متضاد قسم کے جذبات بڑی شدت سے پیدا ہو چکے تھے جھنگی کا یہ حال تھا کہ کچھ دیر تک تو وہ منہ سے آواز تک نکالنے سے قاصر رہی۔

پھر اُس نے ہاتھ بڑھا کر کاغذ کا پرزہ بیٹی کے ہاتھ میں دے دیا۔

کاغذ دیکھتے ہی سرتوں کا رنگ متغیر ہو کر دفعتاً بالکل پھیکا پڑ گیا۔ وہ سمجھ گئی کہ اس سے کیا غلطی سرزد ہو چکی ہے۔ ہائے اسے نہاتے وقت چھاتی میں چھپی ہوئی چٹھی کا خیال کیوں نہ رہا۔ اب وہ گھڑی واپس نہ آسکتی تھی اور فرار کا راستہ بھی سجھائی نہ دیتا تھا۔

جنداں نے اور قریب پہنچ کر اس کے گال کا گوشت اپنی بے رحم چٹکی میں لے کر پوری قوت سے دبایا اور آگے پیچھے جھٹکے دیتے ہوئے دھیمی آواز اور نہایت کرخت لہجے میں بولی:

"حرام خور، چڑیل، مسٹنڈی.... بول"

وہ بچاری کیا بولتی۔

جنداں نے اور آگے بڑھ کر اپنی مٹھی میں جتنے اُس کے بال آسکے سختی سے پکڑ کر اُسے ایک جھٹکے سے جو اُوپر کھینچا تو سرتوں کا سر اُس کی گود میں آن گرا اُوپر سے اس نے اُس کی پیٹھ پر پوری قوت سے دُھواں دھوں دوہتڑ مارنے شروع کئے۔

"بڑی عشق بازی کرنے والی آئی وہاں سے کلموہی تو پیدا ہوتے ہی کیوں نہ مر گئی....

.... کیوں ری تیری چھاتی میں کونسی چتا جل رہی تھی جو تو اور چند مہینے صبر نہ کر سکی کونسے پسو کاٹے کھا رہے تھے حرامزادی کو۔ تیری عمر سے بڑی بڑی لڑکیاں پڑی ہیں گاؤں میں۔ کیا کبھی اُنھوں نے بھی یوں عشق بازی کی ہے۔ بول حرامزادی بول"

ایک دم پول کھل جانے کے باعث سرتوں بالکل ہی بھونچکا رہ گئی تھی۔ ماں کے قہر کا مقابلہ کرنے کی اس میں تاب ہی کہاں تھی۔ جنداں اس وقت تک دوہتڑ مارتی گئی جب تک کہ اس کی طاقت نے جواب نہیں دے دیا۔

سرتوں کو یوں محسوس ہوا جیسے اُس کی ریڑھ کی ہڈی چکنا چور ہو گئی ہو۔ اُس کی کمر پیچھے کو جھک گئی تھی۔ اُس نے پیٹھ سہلانے کے لئے اپنا ایک ہاتھ پیچھے کی طرف بڑھایا اور قمیص کے دو تین بٹن جو وہ جلدی میں اچھی طرح بند بھی نہ کر سکی تھی کھل گئے اور اُس

کی تنی ہوئی چھاتیوں کی خوش وضع گولائیاں نیم عُریاں ہوگئیں۔ اس نظارے نے گویا جنداں کے دل پر تازیانے کا کام کیا۔ اس نے بے رحمی سے اس کے گریبان کو کھینچ کر کہا:

• آگ لگے تیرے فیشن کو حرامزادی بند کر قمیص کے بٹن۔ لاڈو رانی۔ ہم تیرا مُنہ دیکھیں اور تو ہماری عزت ڈبوئے۔ بھینس کی بھینس کو پال پوس کر اتنا بڑا کیا۔ نہ کوئی کام نہ دھام۔ لگی پریم کے جھُولے جھُولنے۔ ابھی دُنیا کی ہوش تو کرے۔ ایسی چٹھیاں آتی ہیں تجھے عاشقوں کی؟ بول کلموہی کُتیا! ابھی تو تیرے دو بڑے بھائی کنوارے بیٹھے ہیں۔ کبھی ان کی عشق بازی بھی سُنی ہے تو نے۔ اور تو لڑکی ہو کر ان سے بازی لے گئی۔ جب تیرے بھائیوں کی شادی نہیں ہوئی تو تو کیوں اپنے عاشق آپ ڈھونڈنے لگی۔ میں تو ہمیشہ سے ڈرتی تھی تیری یہ بڑی لاش دیکھ کر۔ دن رات یہی کہتی تھی ہے واہگورو! تو ہی پت (آبرو) رکھنے والا ہے سب کی۔ ہماری چھوری کی رکشا کر لو۔ لیکن ہماری لونڈیا تو ایسی طرار نکلی اکہ بس۔ ابھی کیا ہے آنے دے باپ کو تیری وہ ہڈیاں تڑواؤں گی کہ سارا عشق وشق بھُول جائے گی۔ کیوں ری۔ ہم تجھے کھلائیں پلائیں چاؤ چونچلے کریں اور تو ہمیں اس کا یہ بدلہ دے نہ معلوم پچھلے جنم میں کیا پاپ کئے تھے جو تو ہمارے پلے پڑی۔

جنداں کی زبان ایک مرتبہ پھر بند ہوگئی۔ اس خیال سے کہ آخر اس مردار کو اتنی جرأت ہی کیوں کر ہوئی۔ وہ فیصلہ نہ کر سکی کہ اب وہ کیا کرے یا کیا کہے۔ وہ مار پیٹ کر چکی تھی جو کچھ مُنہ میں آیا کہہ چکی تھی۔ اُس کی آنکھیں اب بھی سُرخ تھیں اعضا و لرز رہے تھے۔ ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔

اچھا مردود۔ اب تو یہیں بیٹھی رہ۔ اور خبردار کتیا جو اکیلے گھر سے باہر قدم بھی رکھا تو تیری ٹانگیں توڑ دوں گی۔ . . . . بے فکر رہ۔ ابھی آتا ہوگا تیرا باپ اور پھر دیکھیو تیری کیا گت بنتی ہے۔ شریف زادیوں والی باتیں ہی بھُلا بیٹھی ہے تو۔"

یہ کہہ کر جنداں نے سرتوں کو پرے دھکیلا اور باہر سے دروازے کی کنڈی چڑھا کر وہ حواس درست کرنے کے لئے لیسار میں ٹہلنے لگی۔ غصّہ کم کرنے کے لئے اُس نے ٹھنڈے پانی کا گلاس پیا۔ وہ ڈر رہی تھی کہ اس حالت میں کوئی اسے دیکھ نہ لے اور شک کرے۔

تھوڑی دیر تک ٹہلنے کے بعد وہ باہر نکلی صحن میں خاموشی طاری تھی۔ اس وقت حالات موافق ہی تھے۔ پہلے تو اُس نے صحن ہی میں بیٹھ کر کام جاری رکھنے کا ارادہ کیا۔ پھر اُس نے کچھ سوچ کر برآمدے میں چارپائی ڈال دی اور بدستور سوت اٹیرنے لگی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اسے دفعتاً کسی سے آنکھ ملانی پڑے۔ اس کے دل میں جو طوفان اُمڈ چکا تھا۔ اُسے دبانے کے لئے کُچھ نہ کُچھ وقفہ تو ضرور درکار تھا۔

اس طرح وقت گزرتا گیا۔ بجھتے دیئے کے قریب اس نے خود آٹا گوندھا۔ رات کا ساگ پڑا تھا۔ خیال تھا کہ اسے چھونک کر گزارہ کر لیا جائے گا۔ جب تنور گرم ہُوا تو اُس نے میتو کو آواز دے کر کہا۔

" میلو بیٹی ذرا ہماری روٹیاں بھی لگا دو تنور پر۔"

" اچھی بات بے بے۔ ۔ ۔ ۔ سرتوں کہاں ہے کیا چھت پر بیٹھی ہے؟ ۔ ۔ ۔"

" نہیں تو۔"

جنداں نے جواب دینے میں تامل کیا۔

میتو نے قریب آکر پُوچھا

" تو پھر؟"

جنداں نے بہانہ لگایا

" ہے جب سے سر دھویا ہے کہتی ہے سر میں درد ہو رہا ہے۔ ۔ ۔ ۔"

میتو نے اظہارِ تعجب کیا

" اچھا۔ ۔ ۔ ۔ میں جا کر سر دبائے دیتی ہوں۔ ہے کہاں؟"

" ہاں بیٹی رہنے دو سو رہی ہے اندر والے کمرے میں۔ سر تو میں دبا چکی ہوں۔ ذرا سوئی ہے تو سوئی رہنے دو۔"

میتو کو کوئی شک نہیں گزرا۔ اور وہاں کے گندھے ہوئے آٹے کی پرات اٹھائے تنور کی طرف چلی گئی۔

روٹیاں پک کر آگئیں تو گھر کے مرد بھی آن پہنچے۔ جس نے سرتوں کی بابت پُوچھا بھی تو اُس نے سر درد کا بہانہ بنا دیا۔ سرتوں کے بھائی کھانا وانا کھا کر اپنی اپنی چارپائی

رشتہ آئی باجی کی طرف چلے گئے۔ اپنے ہمراہ چند چھوٹی چھوٹی نازک مولیاں اور پسا ہوا نمک بھی کھانے کے لئے لیتے گئے۔

جب گھر میں صرف نرنجن سنگھ رہ گیا تو جنداں اس کا بازو تھامے سرنوں والے کمرے میں لے گئی۔ یہ کمرہ بھی اسی ڈیزائن کا تھا۔ نرنجن سنگھ کو تعجب تو ہوا لیکن اُس نے سوچا۔ عورتوں کی تو یہ عادت ہی ہوتی ہے کہ ذرا سی بات سُن پائیں تو بڑے اہتمام سے بات کا بتنگڑ بنا کر سُناتی ہیں۔ پہلے بھی کئی مرتبہ اسی طرح ہو چکا تھا۔ چنانچہ کمرے میں پہنچ کر وہ اطمینان سے رنگ دار پایوں والے پلنگ پر اطمینان سے چپ چاپ بیٹھ گیا۔ سر کی پگڑی اتار کر ایک طرف رکھ دی۔ اور اپنا ہاتھ پیشانی پر پھیرنے لگا۔ چندیلے کچھ بال اڑ جانے کے باعث اس کی پیشانی بھی بہت بڑی دکھائی دینے لگی۔ سر پر دو تین بار ہاتھ پھیرنے اور بالوں کا چھوٹا سا جوڑا ٹٹولنے کے بعد اُس نے مطمئن لہجے میں پُوچھا:

” ہاں اب کہو کیا بات ہے؟“

جنداں نے ہاتھ جھٹکا کر جواب دیا

” صبر کرو نا۔“

اس کا اپنا دل بے قابو ہو رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ سرنوں والے واقعہ کا ذکر ایسے لہجے میں کرے کہ اسے اتنا غصہ نہ آجائے کہ زور زور سے بکنے لگے۔ اور لوگوں کو خواہ مخواہ اس بات کی خبر ہو جائے۔

نرنجن سنگھ نے قدرے تعجب سے کہا:

” تم بھی خوب ہو۔ خود ہی تو میرا ہاتھ پکڑ کر یہاں ایسے لائی ہو جیسے کوئی بہت بھاری بات ہو گئی ہو۔ . . . . . میں تو پہلے ہی سمجھتا تھا . . . . . “

جنداں نے رازدارانہ لہجے میں کہا

” بات تو خاص ہی ہے “

” اچھا جی “ نرنجن سنگھ نے بیوی کو چڑانے کے لئے کہا

” دیکھو مذاق نہیں۔ لیکن تم سے ڈر لگتا ہے۔ یہ نہ ہو کہ غصہ ایک دم سر کو چڑھ جائے۔ . . . “

نرنجن سنگھ نے قدرے بگڑ کر کہا۔

"سرتوں کی ماں تم سے اتنی مرتبہ کہا ہے کہ میرے سامنے جو بات کہنی ہو، صاف صاف کہہ دیا کرو۔ یہ جو مفت کا طومار باندھتی ہو۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

"ہے ہے صاف ہی کہوں گی۔ پہلے ہی سے لگے بگڑنے۔ . . ."

"پھر کہہ ڈالو نا۔"

جنداں ہاتھ ملتے ہوئے بولی۔

"اب کیا کہوں۔ میں پھر منع کرتی ہوں کہ ہوا کے گھوڑے پر سوار مت ہو جانا . . . . بس تو خیر کیا تم بات کا بتنگڑ بنا ڈالو گے۔"

یہ سن کر نرنجن سنگھ پیشانی پر ہلکے سے ہاتھ مار کر چت لیٹ گیا۔

"لو بھئی میں ہارا تم جیتیں۔ اب میں کچھ نہیں پوچھنے کا۔ جو تمہارے جی میں آئے کہو اور کیا؟"

جنداں نے حالات بگڑتے دیکھ کر کہنا شروع کیا۔

"بات تو یونہی چھوٹی سی تھی۔ میرا مطلب ہے ابھی تو چھوٹی ہے۔ لیکن بڑی ہو سکتی تھی جو مجھے آج اس بات کا پتہ نہ چل جاتا تو . . . ."

خاوند دل برداشتہ ہو کر گویا بولنے کی قسم کھا کر چپکا پڑا تھا جیسے اُس نے بولنے کی قسم کھائی ہو۔

جنداں نے گویا پھونک کر قدم رکھتے ہوئے کہنا شروع کیا:

"بات یہ ہے کہ آج مجھے سرتوں کی ایک بات کا پتہ چل گیا ہے۔"
شوہر نے بے رُخی سے پُوچھا۔

"بات کیا؟"

"آپ تو بچے بنتے ہیں۔" جنداں خاوند کو کبھی 'تم' اور کبھی 'آپ' کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔
"بھلا جوان لڑکیوں کی بات ہی کیا ہُوا کرتی ہے؟"

شوہر کا دل کچھ کھٹکا۔

"تمہارا مطلب . . . . آخر ہُوا کیا مجھے بھی تو بتا ڈالو اب۔"

"ہونا کیا تھا۔ وہ لڑکا ہے نہ پرتھی پال سنگھ . . . . وہ بڑا خوبصورت اور لمبا

سالڑکا یاد ہے تم کو۔۔۔۔؟"

"لیپھٹین سے مطلب ہے تمہارا؟"

"ہاں ہاں"

"تو لیپھٹین کہو۔۔۔ لفٹی ننٹ ہے اصل میں۔ ہاں تو کیا؟"

جنداں نے پھر قدرے تامل کیا

"ان دونوں کی آپس میں۔۔۔۔۔ سمجھے نا"

"کن دونوں کی؟"

جنداں کا مطلب صاف تھا لیکن نرنجن سنگھ تو جیسے سُنا اَن سُنا کر رہا ہو۔

"سرنوں اور وہ۔۔۔ لیپھٹین کی"

اس دوران میں وہ ایک کہنی کے سہارے ذرا اُوپر کو اُٹھ گیا۔

"کیا کہتی ہو تم؟"

اب ذرا صبر سے کام لو۔۔۔۔۔ میں جو کہتی ہوں۔ حرف بحرف ٹھیک کہتی ہوں"

شوہر بے چینی سے بولا:

"نہیں جنداں یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہ تو بڑی بدنامی کی بات ہے۔ ہم کسی کو مُنہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے اور لڑکی کی تو ساری زندگی تباہ ہو جائے گی"

"یہی تو دُکھ ہے" یہ کہتے کہتے جنداں کی آواز بھرا گئی۔ ان لڑکیوں کو کھلاؤ پلاؤ، پال پوس کر بڑی کرو۔ لیکن کیا کیا جائے ایسی اولاد کو جو ماں باپ کے سفید بالوں میں راکھ ڈال دے۔۔"

اب نرنجن سنگھ کو صورت حال کا احساس ہو چکا تھا۔ بیوی کی دبی دبی سسکیوں پر اُس نے جھلا کر دریافت کیا:

"آخر تمہیں یہ بات معلوم کہاں سے ہوئی۔۔۔۔ اب کچھ کہے گی بھی یا روتی چلی جائیگی؟"

جنداں نے آنچل کے کونے سے آنکھیں خشک کرتے ہوئے وہ چٹھی آگے بڑھا دی۔

نرنجن سنگھ نے جلدی جلدی چٹھی پڑھی اور پھر دفعتاً بگڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ قریب پڑا ہوا بڑا سا لٹھ اُٹھا کر سرنوں والے کمرے کی طرف چلنے لگا تو جنداں لٹھ سے لپٹ گئی۔

"کیا اسے جان سے مار دوگے"

"جنداں لٹھ چھوڑ دے۔ میں تجھ سے کہہ رہا ہوں۔"

وہ اور بھی مضبوطی سے لٹھ سے لپٹ گئی اور بڑی ہٹ دھرمی سے بولی:

"نہیں ہرگز نہیں چھوڑوں گی۔۔۔۔ آخر تم نے وہی کچھ کیا نا۔ اسی لئے تو میں تم کو بات بتانے سے گھبرا رہی تھی۔"

شوہر نے لٹھ چھوڑ دیا اور گھونسہ تان کر بولا۔

"میں مارے گھونسوں کے اس کی پسلیاں توڑ دوں گا۔"

وہ پھنکارتا ہوا اس کمرے کی طرف لپکا۔ جہاں سرنوں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے پیچھے پیچھے جنداں بھاگتی چلی جارہی تھی۔ نرنجن سنگھ نے کمرے میں داخل ہوتے ہی بلا کسی تمہید کے بے خبر سرنوں کو بالوں سے پکڑ کر اس قدر زور سے پرے پھینکا کہ اس کی پیشانی پلنگ کے پائے کے ساتھ ٹکرا گئی اور وہاں فوراً ایک بڑا سا گولہ نمودار ہو گیا۔ گولے کے قریب ہی خراش آجانے کے باعث لہو بہ نکلا۔ پھر اس نے زور کی ٹھوکر مارنے کے لئے پاؤں اٹھایا تو جنداں فوراً اس کی ٹانگ سے لپٹ گئی۔ نرنجن سنگھ کو اتفاق سے فوجی ملازمت کے زمانے کی بید کی پتلی سی چھڑی ہاتھ لگ گئی۔ جنداں نے دیکھا کہ دروازہ کھلا ہے۔ اسے یہ بھی اطمینان ہو گیا کہ شوہر کے ہاتھ میں کوئی خطرناک شے نہیں ہے۔ اس لئے اس نے جھٹ لپک کر دروازہ بند کر دیا۔ اتنی سی دیر میں سرنوں کی ہلکی ہلکی آوازیں "چاچا میں مر جاؤں گی۔ چاچا میں مر جاؤں گی۔" اور مضبوط چھڑی کی ضربوں کی پے در پے پھنکاریں سنائی دیتی رہیں۔ فوراً دروازہ بند کر کے وہ لوٹی تو شوہر کو قدرے دھکیل کر بولی۔

"بس کرو۔ کیا اب مار ہی ڈالو گے اسے۔"

سرنوں گرتی پڑتی ماں کی اوٹ میں ہو گئی۔

"ماں میری امڑی بچا لے مجھے۔۔۔۔"

شوہر نے انتہائی غصہ میں غرّا کر کہا:

"جنداں ہٹ جا میرے سامنے سے۔" اور پھر وہ پھیر پھیر کر سرنوں کو مارنے کی کوشش کرنے لگا۔

"میری ماں! میری ماں!" اور پھر سرنوں کے منہ سے درد اور کرب کی ایک بلند

چیخ نکلنے لگی۔ جنداں نے فوراً اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے ایک ننھی سی بچی کی طرح اپنی چھاتی سے لپٹا لیا اور چھڑی کی ہر ضرب اُس نے اپنے بدن یا بازوؤں پر روکی۔

آخر کار مارنے والا خود بھی نڈھال ہو گیا اور پلنگ کی پٹی کے سہارے بیٹھ کر ہانپنے لگا۔

جنداں نے گھوم کر دھیمی آواز میں کہا:

"جاؤ اب واہگورو کے لئے باہر جاؤ.... دروازہ بند کرتے جانا"

شوہر نے حکم کی تعمیل کی۔

گو سرنوں کے بدن کے مختلف حصوں پر ضربوں کے نشان پڑ گئے تھے۔ لیکن جنداں دل میں واہگورو اکال پرکھ کی ہزار ہزار شکر گزار تھی کہ اس وقت اس کے خاوند کے ہاتھ میں کوئی بھاری بھرکم شے نہیں تھی اور سرنوں کو کوئی خطرناک چوٹ نہیں آئی۔ ایسی جوان لڑکی کے لئے چھڑی کی مار تو خیر کچھ بھی نہیں تھی۔

دو گھڑی بعد اُس نے بیٹی کو پلنگ پر لٹا دیا اور خود اُس کے ساتھ لیٹ کر اس کا سارا جسم اپنے بدن سے لپٹا لیا۔ قدرے بھینچ کر اور ہاتھ دوڑا دوڑا کر وہ اس کے جسم کے مختلف حصوں کو سہلاتی رہی۔ پندرہ بیس منٹ تک اُس نے ایک لمحہ کے لئے بیٹی کو اپنے آپ سے علیحدہ نہیں کیا۔ پھر وہ اُٹھ کر پلنگ سے اُترنے لگی۔ تو سرنوں نے اُس کا ہاتھ اپنے دونوں میں تھام لیا۔

"ماں مت جاؤ.... یہیں لیٹی رہو"

اپنی بیٹی کا گدرایا ہوا جسم، بھرائی ہوئی آواز اور اپنے بوڑھے ہاتھ کے ساتھ اس کے تر و تازہ، نازک اور گورے ہاتھ لپٹے ہوئے دیکھ کر نہ معلوم کیوں جنداں کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ لیکن اُس نے اپنے لہجے پر قابو پاتے ہوئے مدھم آواز میں کہا "ٹھہر ذرا میں تیرا جسم سینکنے کے لئے روئی اور کچھ آگ لے آؤں"

اینٹ کا ٹکڑا آگ میں گرم کرکے اُس نے روئی میں لپیٹا اور بیٹی کا جسم سینکنے لگی۔ تھوڑی دیر تک سینک کرنے کے بعد تیز گرم دودھ میں گھی ڈال کر بیٹی کو پلایا۔ شاید سرنوں کو ایسی خبر گیری کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن ماں کی ممتا جاگ اُٹھی تھی۔ بھلا وہ اس کی تیمار
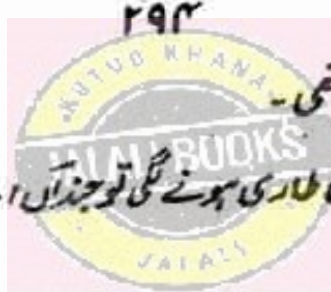
داری کئے بغیر کیوں کر رہ سکتی تھی۔

مرنوں پر کچھ غنودگی سی طاری ہونے لگی تو جنداں اسے چھوڑ کر دوسرے کمرے میں خاوند کے پاس چلی گئی۔

مرد کی جھلاہٹ تو ختم ہو چکی تھی لیکن نئے حالات پیدا ہو جانے کے باعث وہ گہری فکر میں مستغرق تھا۔ اس نے بیوی کی جانب دیکھا لیکن مُنہ سے کچھ نہ بولا۔

کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہُوئی کہ ان کے گھر میں اس قدر کہرام مچ چکا تھا۔ لیکن جنداں اس بات سے مطمئن تھی کہ اب کوئی ٹھکانے کی تجویز سوچی جاسکتی ہے۔ وہ شوہر کے پلنگ کے قریب ایک پیڑھی پر بیٹھ گئی۔ میاں بیوی کی خاموش نگاہیں ایک لمحہ کے لئے ایک دوسرے سے ملیں۔ لیکن دونوں میں سے کسی کو کچھ نہ سوجھتا تھا۔

چند سے سکوت طاری رہا۔ پھر نرنجن سنگھ نے پیشانی دبا کر گوبر سے لپی ہوئی دیوار کی جانب کھوکھلی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

"اس لونڈیا نے تو تباہ کر دیا ہمیں۔"

انتہائی مصیبت کے موقعہ پر بھی جنداں ہی شوہر کی ہمت افزائی کیا کرتی تھی۔ شوہر بھی اس بات کا عادی ہو چکا تھا۔ ہر ایسے موقعہ پر وہ بیوی کے ہمت افزا کلمات کا امیدوار ہوتا تھا۔ جنداں نے حسب معمول آواز میں کہا:

"یہ کیا کہتے ہو۔ واہگورو کا نام لو۔ گھروں میں ایسی باتیں تو ہو ہی جاتی ہیں۔ تباہی کی بات ہی کیا ہے اس میں۔ میں سمجھتی ہوں ابھی تک کسی کو اس بات کی خبر بھی نہیں ہُوئی۔"

"خبر پھیلتے کیا دیر لگتی ہے۔"

"دیر تو نہیں لگتی۔ لیکن اگر آدمی ہوشیاری سے کام لے تو سب باتیں ڈھکی چھپی رہ سکتی ہیں۔"

اس بات پر نرنجن سنگھ نے چپ چاپ ایک سرد آہ بھری اور ہاتھ پلنگ پر ٹیک کر پیچھے کی جانب جُھک گیا۔

جنداں نے پھر کہنا شروع کیا:

"ایک تم ہو کہ بس ایک دم ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو جاتے ہو۔ کچھ تو سوچ لیا کرو۔
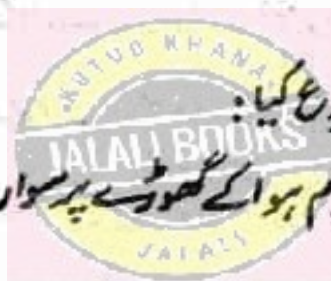
دُنیاداری کے معاملے اس طرح طے نہیں ہُوا کرتے ۔"

"ہاں بس اب تم نصیحتوں کے دفتر کھول دو یہ تو بات ہی ایسی تھی کہ میں اپنے آپ پر قابو رکھ ہی نہ سکا ۔ میں اس لڑکی کو ایسی . . . . . نہیں سمجھتا تھا ۔"

" یہ تو سب عمر کی باتیں ہوتی ہیں ۔ جوان لڑکی ہے ۔ اگر بھٹک بھی جائے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے ۔ ہمارے گاؤں ہی میں بہتری لڑکیوں کی باتیں مشہور ہو جاتی ہیں ۔ لورکھی اور نواب کی بابت لوگ باگ باتیں کرتے تھے ۔ شیلا کو تو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا . . . . ."

" نہ معلوم اب کیسا زمانہ آگیا ہے ۔ ہمارے دنوں میں تو ایسی لڑکیوں کی ٹانگیں توڑ کر انہیں نہر میں ڈبو دیا جاتا تھا . . . . . ."

"بس لد گئے وہ زمانے ۔ گاؤں کی باتیں کرتے ہو ذرا شہر میں جا کر دیکھو تو ہوش اُڑ جائیں . . . . . "

" اجی رہنے بھی دو ۔ اب شہر کے قصے لے بیٹھیں ۔ ہم گاؤں کے لوگ گاؤں کی باتیں ہی تو کریں گے ۔"

"گاؤں لئے پھرتے ہو معلوم بھی ہے کچھ ۔ اپنی لڑکی کتنے برس شہر کی ہوا کھا چکی ہے ۔ اس سے بالکل دیہاتنوں کی سی باتوں کی اُمید تو نہ رکھو ۔ . . ."

"میں پوچھتا ہوں کہ شہروں میں لڑکیوں کو بس یہی کچھ سکھایا جاتا ہے کہ لڑکوں سے محبت کی پینگیں بڑھائیں اور اُنھیں پریم بھری چٹھیاں لکھتی رہیں . . . . ."

"خیر سکھایا تو نہیں جاتا ۔ پر آزادی تو ہوتی ہے نا لڑکوں کو دیکھنے اور ان سے ملنے جلنے کی ۔ اب تو لڑکے لڑکیاں مدرسوں میں ساتھ ساتھ پڑھنے لگے ہیں . . . . ."

"چھوڑو ان باتوں کو سرنی کی ماں . . . . . یونہی بے پر کی اڑائے جاتی ہو ان باتوں سے تمہارا مطلب کیا ہے ۔ کیا ہے ۔ کیا ہم اپنی لڑکی کو من مانی کاروائیاں کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیں ؟"

"ہائے ہائے تم تو مفت میں سر ہوئے جاتے ہو ۔ لو بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی ۔ آزاد کیوں چھوڑ دیں ۔ میں تو کہتی ہوں کہ نوجوان لڑکی ہے ۔ شہر میں بھی رہ چکی ہے اگر اس سے کوئی غلطی ہو بھی جائے

تو ہمیں اس کی مجبوری کو سمجھ لینا چاہئے۔"

"اچھا چلو مجبوری سمجھ ہی لی۔ اب کہو آئندہ کیا ہوگا۔ ادھر ادھر کی ہانکنے سے کیا فائدہ۔ اب کوئی تجویز سوچ کر بتاؤ۔ آخر اس کا کوئی علاج تو ہونا چاہیئے۔"

"اجی میں کہتی ہوں لڑکے میں کیا ہے۔ ۔ ۔ ۔"

"کون سے لڑکے میں؟"

"یہی پرتھی پال سنگھ میں۔"

"کیا مطلب ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"خوبصورت ہے، جوان ہے، پڑھا لکھا ہے، کھاتا پیتا ہے، افسر ہے۔ ۔ ۔ ۔"

"ہاں ہاں۔ یہ تو میں جانتا ہوں۔ اب پہیلیاں مت بجھاؤ۔ جو بات کہنی ہے سو کہہ ڈالو"

جنداں نے تعجب سے ناک پر اُنگلی رکھ کر جواب دیا۔

"ہائے ہائے تو اور صاف کیا کہوں۔ ۔ ۔ ۔ میں کہتی ہوں۔ اسی سے رشتہ ہو جائے تو کیا برائی ہے۔"

نرنجن سنگھ نے غرا کر کہا:

"تمہارا مطلب ہے۔ اب اسی بدمعاش سے شادی بھی کر دوں تمہاری لاڈو کی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ واہ۔ ۔ ۔ ۔"

"پھر وہی بات۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بدمعاش کاہے کو ہو گیا وہ۔ اگر دونوں میں بننا لونا ہے بھی تو اس سے کوئی خرابی تو پیدا نہیں ہوگی۔ آپس میں پریم ہی تو ہے۔ ایسا لڑکا تو چراغ لے کر ڈھونڈے سے بھی نہ ملے گا۔ ہم جو کچھ بھی ہوں۔ ایسے اچھے رشتے کا خواب تک نہیں دیکھ سکتے۔ اگر خود لڑکا ہی لڑکی کو پسند کرتا ہے تو پھر دقت ہی کچھ نہیں۔ دونوں کی جوڑی بھی چاند سورج کی سی ہوگی۔"

نرنجن سنگھ نے دھیمے لہجے میں کہا

"بھئی مجھے تو جچتی نہیں یہ بات۔ ۔ ۔ ۔"

"اب پرانے خیالوں کو چھوڑو۔ جب لڑکی اور لڑکے کی آپس میں بنتی ہے اور لڑکے میں سب خوبیاں ہیں اور عیب کوئی بھی نہیں تو پھر ہمیں اور کسی چیز کی ضرورت بھی کیا ہے۔

ذرا ٹھنڈے دل سے غور کرو میری بات پر۔ یونہی جھلانے سے کوئی مشکل حل نہ ہوگی۔"

یہ نرنجن سنگھ کے تجربے کی بات تھی کہ بیوی کی تجویزیں پہلے پہل اسے بالکل بے معنی معلوم ہوتی تھیں۔ لیکن بعدازاں واقعی مفید ثابت ہوئی تھیں۔ اس لئے وہ دفعتاً اس کی بات کو رد نہ کر سکا اور تھوڑی دیر بعد اسے واقعی یہ محسوس ہونے لگا کہ اس مشکل کا اس سے زیادہ شاندار حل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ لیکن اس نے منہ سے کچھ نہ کہا اور نہ پیشانی کے بل ہی دور کئے۔

جنداں نے قدرے توقف کے بعد پھر کہا۔ "آج تم پرتھی پال کے باپ کو ان کے گاؤں ہی میں مل آؤ اور۔۔۔۔"

"کیا میں اس کے وہاں جاؤں؟"

"تو اور کون جائے گا۔۔۔۔ اس طرح کام جلد نپٹ جائے گا۔ یا پھر کسی کی معرفت ان کے کان تک اس بات کی بھنک ڈال دیں۔۔۔۔ لیکن وقت بہت لگے گا یہ باتیں تو عام حالتوں میں ہوتی ہیں۔ اب ہمیں یہ ڈر بھی تو ہے کہ کہیں یہ بھید دوسروں پر ظاہر نہ ہو جائے اور اس طرح مفت میں بات کا بتنگڑ بن جائے۔۔۔۔"

"جو کچھ بھی ہو۔ میں خود تو کچھ نہ کہوں گا۔ کسی کی معرفت ہی کرنا ہوگا یہ کام۔۔۔۔ کم از کم ان لوگوں تک ہمارا پیغام پہنچ جائے۔ پھر اگر ضرورت ہوئی تو میں خود بھی مل لوں گا۔"
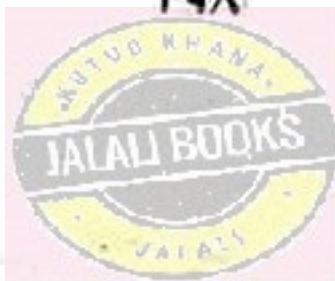
۱۲

گرم گرم دودھ پینے کے بعد سرتوں کو نیند آگئی۔ وہ بہت دیر تک پڑی سوتی رہی۔ اور اگر اس کی سہیلی رکھی اسے ملنے کے لئے نہ آجاتی تو نہ معلوم اور کتنی دیر تک نہ جاگتی۔

اس کی آنکھیں کھلیں تو اُس نے دیکھا کہ رکھی کا ہنستا ہوا چہرہ بالکل اس کے چہرے کے قریب ہے۔ وہ دھیمی آواز میں اس کا نام پکار پکار کر اسے جگا رہی تھی۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ تو رکھی نے ذرا بلند آواز میں پوچھا "کیوں ری تو آئی نہیں میرے ہاں۔ میں انتظار کرتی رہی تیرا . . . . ."

سرتوں نے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کے بعد اشارہ کیا، اور یہ دیکھنے کے لئے کہ کوئی اور ان کی باتیں تو نہیں سُن رہا۔ اُس نے سر اٹھا کر ادھر اُدھر دیکھا۔ وہاں ان دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ ہلنے جلنے پر اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے جسم کے جوڑ جوڑ میں درد ہو رہا ہو۔ جہاں جہاں چھڑی کی ضربیں لگی تھیں۔ وہاں وہاں اُبھار پیدا ہو گئے تھے۔ بڑی سخت قسم کی جلن ہو رہی تھی۔ سارا جسم پھوڑے کی طرح دُکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اذیت کے آثار پیدا ہوئے تو رکھی کو بڑی حیرت ہوئی۔ تاہم اُس نے ہنس کر نسبتاً دھیمی آواز میں پوچھا:

"اری بنچھے کیا ہوا ہے؟"

سرتوں نے کچھ جواب نہیں دیا۔ صرف اس کا چہرہ قدرے پھیکا پڑ گیا۔ رکھی کو محسوس ہوا کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر سرتوں کا

بازو تھاما تو درد کے مارے ایک آہ سرتوں کے ہونٹوں پر آکر رہ گئی۔ رکھی نے بھی محسوس کر لیا کہ اس کے بازو پر چھوٹے چھوٹے ابھار پیدا ہو چکے ہیں۔ اس کی ہنسی غائب ہو گئی اور پریشان نظروں سے اسے دیکھتی ہوئی سرگوشی میں بولی:

"کیوں خیریت تو ہے؟"

سرتوں نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا۔ بازو اٹھا کر آنکھوں پر رکھ لیا جیسے وہ اپنے آنسوؤں کو چھپانا چاہتی ہو۔

رکھی نے اس کے گلے میں باہیں ڈال کر ملتجیانہ لہجے میں دریافت کیا۔

"سرتی بہن! مجھے بھی نہیں بتائے گی کہ آخر ہوا کیا ہے؟"

سرتوں کے ہونٹ لرز کر رہ گئے۔

"بتانا، مجھ سے کیوں چھپاتی ہے؟"

سرتوں نے بڑی مشکل سے رک رک کر جواب دیا۔

"آج مجھے چاچا نے بہت مارا ہے۔"

یہ بالکل نئی بات تھی۔ بچپن ہی سے رکھی نے سرتوں کو بری طرح پٹتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بہت زیادہ شرارت کرنے پر اسے ایک آدھ دھپ پڑ گیا تو گیا اور وہ بھی ماں کے ہاتھ کا دھپ اور باپ نے تو کبھی کچھ کہا ہی نہیں تھا۔ اگر کہتا بھی تو جنداں رو ٹھ جاتی: "دیکھو جی! میری بیٹی کو کچھ مت کہا کرو۔ وہ میری بیٹی ہے۔ تمہارا کیا لگا لگتی ہے۔ اگر کچھ گڑبڑ کرے گی بھی تو میں خود ہی سمجھا دوں گی۔ ..." بھلا ایسی لاڈلی کو اس بری طرح سے کیوں پیٹا گیا۔

دفعتاً رکھی کے دل میں ایک شبہ نے سر اٹھایا۔ صرف اسی وجہ سے مار پڑ سکتی تھی۔ لیکن وہ بھید کیوں کر کھلا۔ اس کی سہیلیوں میں سوائے اس کے کسی کو اس بھید کا علم نہ تھا۔ سارا کام انتہائی ہوشیاری اور احتیاط سے ہو رہا تھا۔ سرتوں کے باپ کو اس بات کی خبر ملنے کا کوئی امکان نہ تھا اور ابھی صبح تک حالات بالکل درست تھے۔ جو کچھ بھی ہوا۔ وہ اس کے جانے کے بعد ہی ہوا ہو گا۔ ممکن ہے۔ اس کا باپ کہیں باہر سے کوئی افواہ سن آیا ہو۔ لیکن محض افواہ سن کر ایسی سخت مار پیٹ کی کیا ضرورت تھی۔ بغرض اس قسم کے

بیسوں خیالات آنِ واحد میں اس کے ذہن میں آئے۔۔۔۔ وہ جھک کر سرلوں سے لپٹ گئی اور اس کے رخسار پر ہاتھ رکھ کر بولی:

"کیوں مارا چا چانے۔۔۔۔"

جواب میں سرلوں کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے اور اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا:

"تم جانتی ہی ہو۔۔۔۔"

یعنی اس کا شبہ درست نکلا۔ ایک لمحے کے لئے دونوں طرف سکوت طاری رہا۔ رکھی کو موقعہ کی نزاکت کا پورا پورا احساس ہو چکا تھا۔

"ہاں۔ میں جانتی ہوں، پر بہن یہ بات انھیں کیسے معلوم ہوئی۔ میں اللہ کی قسم کھا کر کہتی ہوں۔ میں نے ان سے تو کیا کبھی کسی اور سے بھی ایک بات نہیں کہی۔۔۔۔"

سرلوں نے پیار سے اس کا ہاتھ تھام لیا اور نرم لہجے میں بولی:

"نہیں بہن، بھلا تم کو کیا پڑی تھی۔ قصور میرا ہی تھا۔۔۔۔ ایک چٹھی ان کے ہاتھ آ گئی۔۔۔۔"

"اری! وہ کیسے؟"

"جب میں نے نہانے کے لئے کپڑے اتارے تو وہ نیچے گر پڑی جو بعد میں بے بے کے ہاتھ لگ گئی۔۔۔۔"

"میں بھی تو تھی۔ میں نے تو نہیں دیکھی کوئی چیٹھی ویٹھی۔۔۔۔"

"نہ معلوم ہم دونوں میں سے کسی کی نظر بھی اس پر کیوں نہ پڑی۔ سب چٹھیاں ایسی جگہ پوشیدہ ہیں کہ کسی کو عمر بھر ان کا علم نہیں ہو سکتا تھا۔ صرف یہی ایک چٹھی تھی۔ جو میں نے پڑھ کر یہاں دچھاتی کی طرف اشارہ کرکے) چھپا رکھی تھی، اور جب ہم دونوں نے مل مل کر قمیص اتاری تو ہنسی مذاق میں نہ مجھے چٹھی کا خیال آیا اور نہ میں نے اسے نیچے گرتے دیکھا۔ میں تو نہا دھو کر اندر چلی آئی۔ بے بے صحن میں بیٹھی تھی۔ اس نے اٹھا کر اسے پڑھ لیا۔ بس پھر کیا تھا۔ مجھ پر ایک دم ہی طوفان ٹوٹ پڑا۔ میں بالکل بے خبر تھی۔ میں کیا جانتی تھی کہ دفعتاً سارا کام ہی بگڑ جائے گا۔"

یہ کہہ کر وہ پھر سسکیاں بھرنے لگی۔ رکمنی جانتی تھی کہ اب معاملہ بہت بگڑ چکا تھا۔ چنانچہ وہ سر جھکا کر اپنے خیالات میں گم ہو گئی۔ وہ سرتوں کی دلی کیفیت کا اندازہ بخوبی لگا سکتی تھی۔ کیونکہ خود اس کے ساتھ بھی کچھ بیت چکا تھا۔ یہ درست تھا کہ اُسے تو آپ سے محبت تھی۔ لیکن اس کی شادی اس کے ساتھ نہ ہو سکی۔ وہ جانتی تھی کہ ایسے موقعوں پر انسان کے دل پر کیا گزرتی ہے۔ اب وہی حال اس کی چہیتی سہیلی کا ہونے والا تھا۔ اب اس کے والدین اسے جلدی سے کسی نہ کسی جگہ دھکا دے ڈالیں گے اور اس کی زندگی تباہ و برباد ہو جائے گی۔ وہ ساری عمر نصیبوں کو روتی رہے گی۔ اُس نے سرتوں کی طرف دیکھا جو مسلسل سسکیاں بھرے جاتی تھی۔

"سرتوں! آخر تیری عقل کو کیا ہو گیا۔ تو چٹھیاں اپنے ساتھ ساتھ کیوں لئے پھرتی تھی۔ تجھے معلوم نہیں تھا کہ اگر کسی کے کان میں اس بات کی بھنک بھی پڑ گئی۔ تو کہیں کی نہ رہے گی۔ تم ننھی بچی تو نہیں۔ تمہیں اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہئے تھا۔ اب تو سب کچھ تمہاری آنکھوں کے سامنے آ گیا ہے۔ ذرا سوچو کہ اب تمہارا کیا بنے گا۔ ۔ ۔ ۔"

پیار اور ہمدردی کی بجائے یہ نصیحتیں اور لعن طعن سُن کر سرتوں نے آنسو بھری بڑی بڑی آنکھیں اُٹھائیں اور اس کی طرف شکایت آمیز نظروں سے دیکھا۔

"میں تو ہر چٹھی چھپا کر رکھتی تھی۔ بھلا اب میں تقدیر سے تو نہیں لڑ سکتی۔ وہ چٹھی کل ہی تو ملی تھی مجھے۔ میں نے بس ایک ہی بار پڑھی۔ میرا خیال تھا کہ ایک بار پھر پڑھ کر جواب دوں گی۔ ہر وقت، سوتے جاگتے وہ چٹھی میرے سینہ کے ساتھ لگی رہتی تھی بھلا مجھے کیا معلوم تھا کہ اس طرح بے خبری میں گر جائے گی۔

تم بھی تو میرے پاس ہی تھیں۔ تمہیں بھی کچھ پتہ نہ چلا۔ ۔ ۔ ۔"

"میں نے کوئی کاغذ گرتے ورتے نہیں دیکھا"

"بس تو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب تم تسلی دینے کی بجائے مجھی پر خفا ہو رہی ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا پہلے میرے ساتھ کچھ کم ہوئی ہے جو تم رہی سہی کسر نکال رہی ہو۔ ۔ ۔ ۔"

"کبھی میں نے تم سے کوئی بُری بات کہی نہیں۔ ۔ ۔ ۔"

"بُری بات تو کسی نے نہیں کہی سبھی اچھی کہہ رہے ہیں۔ ۔ ۔ ۔"

"ہاں اب تم مجھی پر نکالو گی سارا غصہ۔ ۔ ۔ مجھے تو بس اتنا ہی دکھ ہے کہ تو نے ہی چھوٹی سی بات سے تم نے سارا کام۔ ۔ ۔ ۔ "

اتنے میں جنداں اندر آگئی۔ رکھی چپ ہو گئی اور سرکوں منہ پھیر کر دیوار کی طرف دیکھنے لگی۔

جنداں جانتی تھی کہ وہ دونوں گہری سہیلیاں ہیں لیکن اسے اس بات کا علم نہیں تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کی راز داں ہیں۔ وہ سمجھتی تھی کہ رکھی آج کے واقعہ سے قطعاً بے خبر ہے۔ چنانچہ اس نے ہنس کر بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا:

"کہو بیٹی اب سر کے درد کا کیا حال ہے"

سرنوں نے مدھم آواز میں جواب دیا۔

"اب تو ٹھیک ہے بے بے"

رکھی نے بن کر پوچھا:

"ماں کیا بات ہے۔ آج تو سرنوں بہت سست سی دکھائی دے رہی ہے۔"

جنداں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں رکھی کے چہرے سے اس کی دلی کیفیت کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا کہوں بیٹی۔ یونہی طبیعت خراب ہے۔ تم کب آئی ہو"

"بس آکر بیٹھی ہی تھی کہ تم آگئیں۔ ۔ ۔ ۔ "

جنداں نے ادھر اُدھر بے معنی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا بیٹی تم باتیں کرو۔ اس کا دل بہلا رہے گا۔ ۔ ۔ ۔ سرنوں بیٹی جو نیند آئے تو سو جاؤ۔ ۔ ۔ بھوک ووک لگی ہو تو بتاؤ۔ میں تمہیں دودھ لا دوں یا کچھ اور۔ ۔ ۔ ۔ ؟"

"نہیں بے بے" سرنوں نے نظریں ملائے بغیر جواب دیا "ابھی تو کچھ بھی کھانے کو جی نہیں چاہتا"

جنداں نے قدرے سکوت کیا۔ اسے کہنے کے لئے کوئی خاص بات نہیں سوجھ رہی تھی۔ چنانچہ وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔

سرنوں چپ چاپ دیوار کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی

بہت ہی گہرا مسئلہ حل کرنے میں منہمک ہے۔ رکھی بھی جلا کچھ کہے اس کی صورت کی طرف دیکھتی رہی۔ . . . . . اسے خود کچھ نہیں سُوجھ رہا تھا۔

دفعتاً سرتوں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"رکھی!"

"کہو۔"

"ایک کام ہے۔ کرو گی؟"

سرتوں کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ کوئی مصمم ارادہ کر چکی ہو اور دُنیا کی کوئی قوّت اسے اس کی انتخاب کردہ راہ سے نہیں ہٹا سکتی۔

رکھی پھر اپنا چہرہ اس کے چہرے کے قریب لے گئی۔

"ضرور کروں گی۔ اگر میرے کرنے کی ہوئی تو . . . . ."

سرتوں نے کچھ تامل کیا۔

"تم کسی نہ کسی طرح اس سے ملو . . . . ابھی ایک دم . . . . اور کہو کہ آج شام کو سُورج ڈھل جانے کے بعد وہ مجھے پُرانی جگہ پر ملے۔"

"وہ کہاں ہوگا اس وقت . . . . ."

"اپنے گاؤں ہی میں ہوگا . . . . . اسے تلاش کر کے میرا پیغام دو۔"

"بس اور کوئی بات نہیں کہنی؟"

"نہیں بالکل نہیں . . . . آج کی بات کا ذکر کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ بس یہی کہنا کہ بہت ضروری کام ہے۔ جس طرح بھی ہو سکے وہ مجھ سے ملے۔"

رکھی سر جھکا کر کچھ سوچنے لگی۔ سرتوں نے بے صبری سے پوچھا۔

"کیا سوچنے لگی ہو۔ کوئی گڑبڑ ہے کیا؟"

"نہیں میں تو یہی سوچ رہی ہوں کہ گھر میں کیا بہانہ بناؤں؟"

"لو اور سنو — تم کنواری لڑکی تو نہیں ہو کہ گھر والے خواہ مخواہ شک کرنے لگیں۔"

"لوگ باگ باتیں کرنے سے کب چُوکتے ہیں . . . . خیر کوئی حرج نہیں۔ میں کوئی

نہ کوئی ترکیب ضرور نکالوں گی۔"

یہ کہہ کر وہ سوچنے لگی کہ کیا بہانہ گھڑے۔ پھر بولی۔

"اچھا تم بے پھکر رہو۔ میں تمہارا یہ کام جس طرح بن پڑے گا کر ڈالوں گی۔ یہ تو کہو کہ اب کیا آئی ہے تمہارے جی میں ......"

"اس وقت مت پوچھو۔"

"بتا دو نا مجھ سے چھپانے سے کیا پھائدہ۔"

"دیکھو اب تم ضد مت کرو۔ دھرم سے میں تمہیں بتلا دوں گی۔ لیکن اب وقت بہت کم ہے تم بھاگم بھاگ چلی جاؤ۔ یہ نہ ہو آج ملاقات ہی نہ ہو سکے۔"

"اچھا تو لو میں چلی ......"

یہ کہہ کر رکھی اُٹھ کر چل دی اور سرتوں نے اپنے دُکھتے ہوئے بازوؤں کو سہلاتے ہوئے کسلمندانہ انداز سے ٹانگیں پھیلا دیں۔ تھوڑی دیر بعد ماں اندر آئی اور پلنگ کے قریب پیڑھی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"کہو سرتی بیٹیا۔ اب کیسی طبیعت ہے؟"

سرتوں نے کمزور آواز میں جواب دیا۔

"اچھی ہوں۔"

"ذرا میری طرف کروٹ بدل کر تو دیکھو۔"

سرتوں نے کروٹ بدل کر آہستہ آہستہ پپوٹے جھپکتے ہوئے ماں کی جانب دیکھا اور ماں اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

"دیکھ میری بیٹی! تُو شاید نہ سمجھتی ہو کہ تُو نے ہماری عزت اور آبرو کو کس قدر خطرے میں ڈال دیا ہے۔ ماں باپ یہ جانتے ہوئے کہ لڑکیاں پرایا دھن ہیں انہیں لاڈ چوچلے سے پالتے ہیں۔ ان کا بھی یہ فرض ہونا چاہیئے کہ اگر وہ والدین کی خدمت نہ کر سکیں تو کم از کم کوئی ایسی حرکت بھی تو نہ کریں، جس سے خواہ مخواہ ان کی بدنامی ہو ...."

اس طرح اس کی ماں نے پند و نصائح کے دفتر کھول دیئے۔ لیکن لاڈلی سرتوں کو گالی گلوچ اور مار پیٹ سے اس قدر زیادہ دھکا پہنچا تھا کہ اس کے دل پر ان باتوں

کا کچھ اثر نہیں ہُوا مگر اس وقت اسے اپنا کوئی ہمدرد اور خیر خواہ دکھائی دیتا تھا تو وہ پرتھی پال سنگھ تھا۔ اس کا دُنیا میں کوئی اور سہارا نہ تھا۔ نہ کوئی اُس کے دل کی کیفیت کا صحیح اندازہ لگا سکتا تھا۔

ماں باتیں کرتی رہی، بیٹی چپ چاپ سُنتی رہی۔ بیٹی کی خاموشی سے ماں نے یہی نتیجہ نکالا کہ وہ اُس کی ہر بات سمجھ رہی ہے اور آئندہ اس پر عمل بھی کرے گی۔

ایک مرتبہ پھر سرنوں کو غنودگی سی محسوس ہونے لگی۔ یہ دیکھ کر جنداں اُٹھ کر باہر چلی گئی۔

وقت گزرتا گیا۔ یہاں تک کہ جب شام کے وقت سرنوں کو رکھی نے آن جگایا اور خوشخبری سُنائی کہ سُورج ڈوبنے کے بعد اندھیرا پڑتے ہی پرتھی پال سنگھ اسے ملنے کے لئے آجائے گا۔

سرنوں یہ سُن کر بہت خوش ہوئی۔

"کوئی اور بات بھی ہوئی"

"نہیں"

"اُس نے کوئی بات نہیں پوچھی"

"پُوچھتا کیا ——— میں نے کہہ دیا کہ بس تم ہی سے کہے گی جو کچھ اُسے کہنا ہوگا۔۔"

"بس؟"

"بس نہیں تو اور کیا . . . . تمہیں تو اپنی فکر پڑی ہے۔ یہ بھی تو پوچھو کہ آخر میں وہاں پہنچی کس طرح۔ کیا بہانہ بنایا، کس طرح اُسے تلاش کیا اور کیسے . . . ."

ہاں ہاں میری بہن یہ تو میں بھول ہی گئی تھی۔ ہاں تو بتاؤ یہ سب باتیں . . . ."

"ابھی چھوڑو ان باتوں کو بھلا اب پوچھنے سے کیا فائدہ ——— اب تو کام کی بات ہو سو کرو . . . اچھا دیکھو میں سیدھی تمہارے پاس چلی آرہی ہوں۔ اب مجھے فوراً گھر کو جانا چاہئے کوئی کام ہو تو بتا دو۔ نہیں تو ہمارا سلام قبول کرو۔"

"ہائے ری ابھی تیرا کام ختم کہاں ہُوا۔ گھر سے ہو کر واپس چلی آئیو۔ سُورج ڈوبنے کو ہے۔ اندھیرا پڑنے پر مجھے باہر کون جانے دے گا۔ اگر گئی بھی تو نہ معلوم میرے ساتھ کون چل دے تو آجائیو تجھ پر کسی کو کوئی شبہ بھی نہیں ہے۔ ہم دونوں چپکے سے چلی جائیں گی اور کام بھی بن جائیگا۔"

"اچھا رانی — میں تو باندی ہوں تیری۔ آج سارا دن تیرے کام اٹکانے ہی میں گزر گیا..... کہیں گھر والے بگڑ گئے تو میرا بھی وہی حال ہوگا جو تمہارا ہوا۔"

کچھ دیر غائب رہنے کے بعد رکھی لوٹ آئی۔ اس دوران میں سرنوں بھی اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ ان دونوں نے حاجت رفع کرنے کا بہانہ بنایا اور چل دیں۔

جنداں، سرنوں کو باہر نہ بھیجنا چاہتی تھی۔ فطرتاً وہ سخت مزاج نہیں تھی۔ اسی لئے یہ سوچ کر کہ اتنی سی دیر میں کونسی قیامت آجائے گی وہ چُپ رہی۔ البتہ جاتے جاتے اتنا ضرور کہہ دیا۔

"ہے رکھی...... سرنوں کا خیال رکھیو.... آج طبیعت خراب ہے اس کی....."

رکھی نے آنکھیں مٹکا کر جواب دیا

"ہے چاچی بے پھکر رہو۔ صبح سے میں ہی تو اس کی دیکھ بھال کر رہی ہوں۔"

یہ کہہ کر اُس نے سرنوں کی کمر میں زور کی چٹکی لی۔

لیکن سرنوں ہنسی مذاق کے موڈ میں نہیں تھی۔ وہ اپنے خیالات میں کھوئی ہوئی بڑھتی چلی گئیں۔

مکانوں کا سلسلہ ختم ہونے پر گلیوں کی سی تاریکی نہ رہی تھی۔

سُورج کبھی کا غروب ہوچکا تھا۔ اُفق پر دودھیا لکیر سی کھنچ کر رہ گئی تھی اور تاریکی کھیتوں میں اُگی ہوئی فصلوں میں رچ رہی تھی۔ درخت جیسے سیاہ لبادے اوڑھے کھڑے ہوں۔ دونوں لڑکیاں آڑی ترچھی مینڈھوں پر چلتی ہوئی منزلِ مقصود کی طرف بڑھتی جا رہی تھیں۔ جب دُور سے جوہڑ کے کنارے کھڑے ہوئے پھلاہ کے درختوں کا جھنڈ دکھائی دینے لگا تو سرنوں نے ہاتھ سے رکھی کو روک دیا۔

"رکھی ٹھہر تو یہیں پر میرا انتظار کر۔"

"ہے لاڈو۔ اتنی دُور۔ اری میں تیری دشمن تو نہیں۔"

"دیکھ میری بہن تو یہیں پر رُک رہ۔"

"اوئی اللہ! کتنی زور سے دبا دیا میرا ہاتھ۔ میں تو خیر رُکی رہوں گی۔ لیکن کہیں تجھے

اندھیرے میں کوئی اور آدمی اٹھا کر نہ لے جائے مجھے تو اتنی دور سے کچھ دکھائی بھی نہیں دے سکا۔"

سرتوں اسے وہیں پر چھوڑ کر آگے بڑھی۔ درختوں کے جھنڈ کے قریب پہنچ کر دیکھا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ پرتھی پال کو اس وقت تک پہنچ جانا چاہئے تھا۔ اس نے ادھر اُدھر نگاہ دوڑا کر دیکھا۔ پریتم کے گاؤں سے آنے والے راستے کے کنارے مدار کے پیڑ اُگے ہوئے تھے۔ جن میں انسان اوجھل ہو سکتا تھا لیکن اس کے محبوب کو چھپنے کی کیا ضرورت تھی۔

وہ ٹہلتی ہوئی جوہڑ کے کنارے کی طرف بڑھی اور پانی کو چومتی ہوئی ان اینٹوں پر کھڑی ہو گئی۔ جن پر گاؤں کی عورتیں کپڑے دھویا کرتی تھیں۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے پانی کی ننھی ننھی لہروں کا زیر و بم بہت بھلا معلوم ہوتا تھا۔ جوں جوں نظر آگے بڑھتی گئی۔ توں توں سطح آب پُرسکون دکھائی دیتی تھی۔ یہاں تک کہ بالآخر وہ پھیلی ہوئی سفید چادر کے مانند نظر آنے لگی۔

چند لمحوں تک وہ پانی کی طرف دیکھتی رہی پھر جب اُس نے گردن گھما کر مدار کے پیڑوں کی جانب دیکھا تو اسے اپنے پریتم کا بلند و بالا جسم دکھائی دیا۔ وہ سیدھا اُس کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ یہ بھی اسے دیکھتے ہی لپک کر اس کی جانب بڑھی اور دوسرے لمحہ میں اس کے گلے کا ہار ہو گئی۔

اُس نے اپنے دُکھتے ہوئے بدن پر پرتھی پال سنگھ کے بازوؤں کی گرفت کی سختی سے لذت انگیز درد کا احساس کیا۔ اس کا دل بھر آیا اور جسم کی پوری قوت کے ساتھ لپٹ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ پرتھی پال نے اپنے مخصوص عاشقانہ انداز سے اس کے رخساروں، ہونٹوں اور ابروؤں پر بوسوں کی بوچھار کر دی۔

"اوہ میری جان سے پیاری۔ . . . . تمہارے بغیر میں نہ رہ سکوں گا۔ کیا تمہیں کبھی میرا خیال نہیں آتا . . . . ." اس قسم کے الفاظ کا تانتا بندھ گیا اور سرتوں کو ان کی مٹھاس اور سحر کے باعث اپنے آپ کی سدھ بدھ نہ رہی۔ وہ کچھ نہ بولی لیکن محبوب کے سینہ پر رخسار رکھے اس کے سہارے کی اُمید میں اس کا دل مسرت اور اطمینان سے ہچکولے لینے لگا۔ آنسو تھے کہ تھمنے میں نہ آتے تھے۔

پہلے پہل تو پرتھی پال نے اس کی بے اختیار ہچکیوں کو ملاقات کی مسرت کا نتیجہ سمجھا۔ لیکن جب ہچکیوں کا سلسلہ ضرورت سے زیادہ طویل ہونے لگا تو اُس نے سرتوں کے نازک

اور لرزاں شانوں کو ملائمت سے دونوں ہاتھوں سے تھام کر پیچھے کی طرف ہٹایا۔ اس کی پُر آب آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پُوچھا۔

"سرنی ـــ میری جانب دیکھو۔ ذرا آنکھیں تو ملاؤ۔"

سرنوں نے بڑی مشکل سے پلکیں اُٹھائیں لیکن آنکھیں چار ہوتے ہی وہ دھاڑ مار کر پھر اس کے سینہ سے لپٹ گئی۔

پرتھی پال سنگھ نے محسوس کیا کہ ضرور کوئی خاص واقعہ پیش آیا ہے۔ اُس نے اُس کے کندھوں کو تھپتھپا کر تسلّی دیتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"جان من! آخر بات کیا ہے۔ کیا کوئی خاص واقعہ پیش آیا ہے۔ صاف صاف بتا دو۔"

لیکن وہ بلا کچھ کہے زور زور سے روتی رہی۔ پرتھی پال ڈر رہا تھا کہ کہیں کوئی آدمی سُن نہ لے۔ لیکن معلوم ہوتا تھا کہ یا تو سرنوں کو اس بات کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ یا پھر اسے اپنے آنسو روکنے پر کوئی اختیار نہیں تھا۔

پرتھی پال اسے اپنے ساتھ لپٹائے ہوئے ایک اونچی پینڈھ کی طرف بڑھا۔ زمین پر رومال بچھا کر اُس نے بڑے پیار سے سرنوں کو بٹھلایا اور خود بھی اس کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تک وہ سرنوں کو دلاسہ دیتا رہا۔ سرنوں نے جھک کر سر اس کے کندھے پر ٹیکتے ہوئے کہا:

"آج مجھے چاچا نے مارا ہے ۔ ۔ ۔ ۔"

"مارا ہے؟" پرتھی پال نے حیرت سے اچھل کر پُوچھا۔

"ہاں بہت زیادہ مارا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مار مار کر مجھے ادھ مُوا کر دیا۔ اسی لئے میں نے تمہیں بلوایا تھا۔

"آخر مار پیٹ کا سبب کیا تھا؟"

"گو اب سرنوں کی آنکھیں خشک تھیں لیکن وہ پھر ہچکیاں لینے لگی۔

پرتھی پال نے اس کا رخسار تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"دیکھو سرنی! بالکل بچّہ نہ بنو مجھے سارا قصہ تو سناؤ۔ آخر مارا کیوں چاچا نے ۔ ۔ ۔"

سرنوں نے اپنی دھن میں جواب دیا:

"پہلے کبھی نہیں مارا تھا اس طرح ۔ ۔ ۔ ۔"

"آخر ایسا کیا پاپ کر دیا تھا تم نے؟"

"تمہاری چٹھی انکے ہاتھ لگ گئی تھی"

پرتھی پال سنگھ کے چہرے پر اس بات کا خاص ردِ عمل ہوا۔ اُس نے قدرے تامل کے

بعد اس کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے دریافت کیا۔

"تم تو کہتی تھیں کہ میری چٹھیاں چھپا کر رکھتی ہو۔ پھر چاچا کے ہاتھ کیسے لگی؟"

"چاچا کے نہیں بے بے کے ہاتھ لگی تھی"

"اچھا تو بے بے کے ہاتھ کیسے لگی؟"

سرتوں نے چھاتی کی طرف اشارہ کر کے جواب دیا۔

"میں نے یہاں چھپا رکھی تھی۔ ایک ہی دفعہ پڑھی تھی سوچا کہ ایک دفعہ پھر پڑھ کر

جواب لکھوں گی۔۔۔۔"

"ہوں"

"صبح کے وقت جو نہانے لگی تو مجھے معلوم ہی نہ ہوا کہ کپڑے اتارتے وقت کاغذ کس

طرح گرا۔ نہ میں نے گرتے دیکھا اور نہ مجھے اس کا خیال ہی آیا۔ رکھی ملنے کے لئے آئی ہوئی تھی۔

وہ جسے میں تمہارے پاس کئی مرتبہ بھیج چکی ہوں۔۔۔۔"

"رکھی؟"

"ہاں"

"اچھا"

"میں اس سے باتیں کر رہی تھی۔ ہم دونوں باتوں میں مصروف تھیں اور دونوں میں سے

کسی نے چٹھی گرتی ہوئی نہیں دیکھی۔ نہا دھو کر میں نے کپڑے بدلے اور گھر کے اندر چلی گئی۔۔۔۔"

"پھر بھی تمہیں چٹھی کا خیال نہ آیا؟"

"نہیں"

"اُف۔۔۔۔ اچھا پھر؟"

"تھوڑی دیر کے بعد بے بے بھی اندر آ گئی اور مجھے ساتھ لے کر اندر والے کمرے میں جا

بیٹھی جب اُس نے ایک دم چٹھی میری آنکھوں کے سامنے کر دی، تو میں نہ کوئی بہانہ گھڑ

سکی اور نہ کچھ چھپانے کی گنجائش رہی۔ بے بے نے لال لال آنکھیں نکال کر میری طرف دیکھا اور بے تحاشا گالیاں دیتے ہوئے مجھے دُھواں دُھوں پیٹ ڈالا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور چاچا گھر آیا تو اُسے بھی بتلا دیا۔ اُس نے مجھے نوجی چھڑی سے اتنا مارا کہ میں بے ہوش سی ہوگئی۔"

یہ کہہ کر اُس نے محبوب کی جانب دیکھا۔ پرتھی پال کا حسین اور سُرخ چہرہ پھیکا پڑ گیا تھا۔ اس کی صورت سے گہری سوچ بچار کے آثار ہویدا تھے۔ سرتی نے اس کا ہاتھ تھام کر پوچھا:

"کیوں کیا سوچ رہے ہو؟"

"یہی سوچ رہا ہوں کہ اب معاملہ بہت بے ڈھب ہو گیا ہے اور کس کس کو معلوم ہے یہ بات؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرے خیال میں ــــ تو سارے علاقے میں ہماری بدنامی ہو جائے گی ۔ ۔ ۔ ۔ بہت بُرا ہُوا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"نہیں اور کسی کو کچھ معلوم نہیں۔ بے بے چاچا کے علاوہ رکھی کو علم ہے اس بات کا ۔ ۔ ۔ ۔"

"وہ تو نہیں بتا دے گی کسی کو؟"

"نہیں"

"کیوں ــــ تم کیسے کہہ سکتی ہو اتنے یقین سے؟"

"وہ میری سہیلی ہے۔ کسی سے اس بات کا ذکر نہیں کرے گی۔ لیکن آخر اس بات پر زور دینے کا کیا فائدہ ۔ ۔ ۔ ۔ جو میرا حال ہُوا۔ تمہیں اس کی بھی فکر ہے کچھ؟"

"اوہ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں ہاں سرتی۔ لیکن تمہیں احتیاط سے کام لینا چاہیئے تھا۔"

"تم بھی مجھی کو دھمکانے لگے ۔ ۔ ۔ ۔ میں سمجھتی تھی مجھے تسکین دو گے ۔ ۔ ۔ ۔"

اس پر پرتھی پال نے اسے اپنے قریب گھسیٹتے ہوئے کہا۔

"نہیں بھلا ایسا ہو سکتا ہے کہیں ۔ ۔ ۔ ۔"

"میرے جسم کا جوڑ جوڑ دُکھ رہا ہے۔"

"کس قدر تکلیف کی بات ہے۔ تم اس بات کا اندازہ نہیں لگا سکتیں کہ اس وقت میرے دل کو کس قدر دُکھ ہو رہا ہے۔"

"میں جانتی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن اب بتاؤ ۔ ۔ ۔ ۔ میں کیا کروں۔ تم مرد ہو۔ میں لڑکی

ہوں ۔ میں تو کہیں کی نہ رہوں گی ۔"

پرتھی پال چپ رہا ۔

"بتاؤ اب میں کیا کروں ؟"

اس نے تامل کے بعد کہا :

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اس بات کا تو خواب میں بھی خیال نہیں تھا۔ کیسے مزے میں دن کٹ رہے تھے ۔"

جو ہونا تھا سو ہو چکا۔ اسے دہرانے سے کیا فائدہ۔ اب تو آئندہ کی فکر کرنی چاہیئے ۔ تمہاری کیا رائے ہے ؟"

"سرتی میں کیا رائے دے سکتا ہوں ۔ اس وقت تو میری عقل کچھ کام نہیں کرتی ...... ابھی تو یہی ہو سکتا ہے کہ تم چپ چاپ گھر میں بیٹھو ...... "

سرتوں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا ۔

" چپ چاپ گھر میں کیسے بیٹھوں ۔ کس قدر سنگ دل ہو ۔ معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں میری باتوں کا یقین نہیں آیا ۔"

یہ کہہ کر سرتوں نے جوش میں آکر شلوار اوپر اٹھائی اور گداز ٹانگیں رانوں سے ننگی کر دیں ۔" یہ دیکھو چھڑی کی مار کے نشانات ۔ میرے پیٹ پر، پیٹھ پر، چھاتی پہ ہر جگہ کالے کالے اور سرخ سرخ نشان پڑ گئے ہیں ۔ میرا جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا ہے اور تم ...... نہیں اب میں اس گھر میں نہیں رہ سکتی ۔ ایک منٹ کے لئے بھی نہیں رہ سکتی ۔ میرا کون ہے، کوئی نہیں سوا تمہارے ۔ وہ لوگ تو ناک میں دم کر دیں گے میرا ...... بتاؤ ...... بتاؤ اب کیا کرنا چاہیئے ۔"

" میں کیا کہہ سکتا ہوں ۔ تم ہی بتاؤ کچھ ۔"

سرتوں نے نظر اٹھا کر تاریکی میں پرتھی پال کے حسین چہرے کے مدھم خطوط کا جائزہ لیا اور پھر مصمم ارادہ کر کے بولی :

" آؤ ہم دونوں بھاگ چلیں ۔ تم مجھے یہاں سے کہیں دور لے چلو ...... "

پرتھی پال نے کوئی جواب نہیں دیا اور سرتوں تاریکی میں اس کے چہرے کے جذبات

کا صحیح اندازہ نہ لگا سکی۔ لیکن اس کی خاموشی سے اس کا دل گھبرانے لگا۔ وہ بے تابی سے جواب کی منتظر تھی۔ ہر چہار جانب چھائے ہوئے سکوت سے لمحہ بہ لمحہ اس کی پریشانی بڑھنے لگی۔ معاً اس نے محسوس کیا جیسے وہ دلدوز چیخ مارنے سے اپنے آپ کو نہ روک سکے گی۔۔۔

۱۳
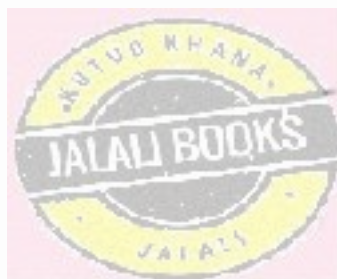
ان سب واقعات سے بے خبر پالا سنگھ دن بھر اپنی طیاریوں میں مصروف رہا۔ اور دوپہر کے وقت وہ میٹھی نیند سو گیا۔ رات پڑنے پر اُٹھا۔ منہ ہاتھ دھویا، کھانا کھایا اور جوالا سنگھ کے ہاں پہنچ گیا۔

گاؤں کی ایک جانب پالی کی محبوبہ سرنوں پرتھی پال سے ملاقات کر رہی تھی اور دوسری جانب پالی دیگر ساتھیوں کے ساتھ، تاروں کی چھاؤں میں سانڈنیاں اُڑاتے منزلِ مقصود کی طرف بڑھ رہا تھا۔

لمبا سفر تھا اور پھر سانڈنیوں کی سواری۔ پہلے پہل تو وہ ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے۔ لیکن پھر وہ پانچوں چُپ ہو گئے اور اپنے اپنے خیالات میں مگن سفر طے کرنے لگے۔

کھیتوں، درختوں، اور مدار کے پودوں میں سے ہو کر تیزی سے بڑھتے ہوئے سانڈنی سواروں کی پگڑیوں کے شملے ہوا میں لہرا رہے تھے۔ سانڈنیوں میں سے دو تو بُری طرح بلبلا رہی تھیں۔ ان کے چوڑے چوڑے پیروں سے گرد آسمان کی طرف اُٹھنے لگی تھی۔

پالی کو پہلے کبھی سانڈنی پر سوار ہونے کا اتفاق نہ ہُوا تھا۔ اسی لئے وہ جوالا سنگھ کے پیچھے بیٹھ گیا۔ بے ڈول جوالا سنگھ بلا کا پھرتیلا سوار تھا۔ پالی سمجھے بیٹھا تھا کہ وہ بچارا سانڈنی کے قدم اُٹھاتے ہی دھڑام سے زمین پر آن رہے گا۔ لیکن وہ اس وقت چٹان کی مانند جما بیٹھا تھا اور تارا اور جوالا سنگھ کی بہن جنتو بھائی سے بھی بڑھی ہوئی تھی۔ وہ سانڈنی پر اکیلی بیٹھی تھی۔ قیاس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کی سانڈنی بھی سب سے زیادہ بد دماغ اور اڑیل واقع

ہوئی تھی۔ یہ اسی کا دم تھا کہ وہ اسے قابو میں رکھے تھی۔

آدھی رات کے بعد سردی بڑھ گئی۔ سادھو سنگھ نے ایک بڑا نادُھسہ نکال کر جسم کے گرد لپیٹ لیا پچھلے پہر تقریباً سب لوگ اونگھنے لگے۔ سادھو سنگھ تو اونگھتے اونگھتے سچ مچ نیچے گرنے لگا۔ لیکن اس کے آگے بیٹھے ہوئے جیل سنگھ نے ہاتھ بڑھا کر اسے تھام لیا۔ اس جھپٹا جھپٹی میں اس کے سر سے پگڑی نیچے گر پڑی۔ اتفاق سے اس کا ایک سرا اس کے ہاتھ میں رہ گیا۔ وہ گھبراہٹ میں زور زور سے چلانے لگا۔ اس پر سبھی چوکنا ہو گئے اور اصل حال معلوم ہونے پر خوب قہقہے بلند ہوئے۔ چنتو نے ہاتھ ہوا میں لہرا کر کہا:

"ہے اب کوئی نہ سوئے۔ سورج نکلنے کو ہے ....."

جیل سنگھ نے جواب میں قہقہہ لگا کر کہا:

"ابھی سے سورج نکلنے کے سپنے دیکھ رہی ہو .... چاند کی روشنی سے دھوکا مت کھاؤ ....."

چنتو نے سانڈنی اُڑا کر اس کے قریب لاتے ہوئے للکار کر کہا: "کیوں شرط بدو گے ..... معلوم ہوتا ہے سچ مچ سو گئے تھے تم ..... ہم نے بھی دنیا دیکھی ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ سورج نکلنے میں اگرچہ دیر تھی۔ لیکن جس کسی گاؤں کے قریب سے ہو کر وہ گزرتے تھے۔ وہاں سے مُرغ کی بانگ دینے کی آوازیں سنائی دینے لگتیں۔ اس واقعہ کے بعد ان میں سے کوئی نہیں اونگھا بلکہ وہ ادھر اُدھر کی گپیں اُڑانے لگے۔ سب کی آنکھیں نیند سے بھری ہوئی تھیں۔ لیکن اس وقت فضا اس قدر خوش گوار تھی کہ دل خواہ مخواہ چہکنا چاہتا تھا۔

سورج نکلا تو دُور دور تک پھیلے ہوئے سرسبز کھیتوں پر سے سیاہ پردہ ہٹ گیا۔ جیل سنگھ نے سانڈنی روک لی اور اس کے ساتھ باقی سوار بھی رُک گئے۔ جیل سنگھ نے ذرا اُوپر کو اُٹھ کر ایک ہاتھ سانڈنی کے کوہان پر رکھا اور دوسرا آنکھوں پر دھر کر دُور تک نگاہ دوڑاتے ہوئے بولا:

"مدلو بھائی! وہ رہا چیری کا گاؤں ....."

"کہاں بھائی؟"

"ارے وہ . . . . . . ادھر کلر والی زمین کے ٹکڑے کی سیدھ میں نظر دوڑاؤ۔"

سب لوگ اُس طرف دیکھنے لگے۔

بہت دُور کہرے میں گھرے ہوئے گاؤں کے مکانوں کے دُھندلے خطوط دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں سے دو تین دفعتاً چلا اُٹھے۔

"او ہاں ہاں . . . . اب دکھائی دیا گاؤں۔ دُھند ہے نا اس لئے ٹھیک دکھتا نہیں۔"

جیل سنگھ نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے سب کی طرف دیکھا۔

"بس اب ہم آن پہنچے ہیں . . . . ."

یہ کہہ کر اُس نے سانڈنی کی نکیل کو جھٹکا دیا اور سب کو آنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا:

"اگر ہم سورج نکلنے سے پہلے وہاں پہنچ جاتے تو اچھا تھا۔ خیر اب بھی کوئی حرج نہیں۔ ہر طرف دُھند چھائی ہوئی ہے۔ ابھی گاؤں کے زیادہ تر آدمی گھروں ہی میں ہوں گے . . . . .
. . . آؤ لپک کر بڑھو۔"

ایک مرتبہ پھر سانڈنیاں ہوا سے باتیں کرنے لگیں۔ گھاس میں بے تحاشا دوڑتی ہوئی وہ بجائے گرد کے شبنم کے چھینٹے اڑانے لگیں۔ سواروں کے پیچھے جہاں جہاں سانڈنیوں کے پاؤں پڑتے تھے۔ وہاں شبنم ہٹ جانے سے نسبتاً گہرے رنگ کے نشانات پڑتے جا رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد وہ گاؤں کے نزدیک پہنچ گئے۔ جیل سنگھ نے ایک دفعہ پھر مہار موڑ کر کہا۔

"بیریوں کے جو درخت سامنے دکھائی دے رہے ہیں۔ ہمیں ان کے قریب سے ہو کر گزرنا ہوگا۔"

جب وہ بیریوں کے قریب سے گزرے تو پالا سنگھ نے دیکھا کہ تین چار بیریاں ایک دوسرے سے اس طرح گڈمڈ ہو رہی ہیں جیسے کشتی لڑ کر ایک دوسری کو نیچے گرانے کی کوشش کر رہی ہوں۔

اُمید کے خلاف گاؤں کے لوگوں کی کافی تعداد حاجت رفع کرنے کے لئے کھیتوں میں موجود تھی لیکن انتہائی سردی کے سبب وہ کمبل یا کھیس لپیٹے کچھ ایسے مگن تھے کہ ان

میں بہت کم نے نووارد سواروں کی طرف دھیان دیا۔

وہ گاؤں کے بالکل نزدیک پہنچے تو ایک کشادہ گلی میں داخل ہوئے۔ دراصل یہ گلی نہیں تھی۔ بالکل کاہن سنگھ کے گھر کا راستہ تھا کیونکہ دائیں بائیں اُونچی اُونچی دیواریں بنی تھیں کسی مکان کا دروازہ گلی کی طرف نہ کھلتا تھا اور گلی کاہن سنگھ کے گھر کے عریض و بلند دروازے تک پہنچ کر ختم ہو جاتی تھی۔

یہ دروازہ اس قدر بلند تھا کہ سانڈنی سوار بڑے مزے سے اس میں گزر کر طویل و عریض طویلے میں داخل ہو گئے۔

مُرغیوں کا ایک غول ان کی زد میں آنے سے بال بال بچ کر پر پھڑپھڑاتا اور کڑکڑاتا ادھر اُدھر کی اُونچی نیچی دیواروں کی طرف پرواز کر گیا۔ بیں بیں کرتی ہوئی چند بکریاں دفعتاً ممیانا بند کر کے اجنبیوں کی جانب دیکھنے لگیں۔

جیل سنگھ نے اردگرد نگاہ دوڑائی۔ اُس کی نظریں اپنے دوست کاہن سنگھ کو ڈھونڈ رہی تھیں۔

کاہن سنگھ دودھ کی لبریز بالٹی اُٹھائے چلا آ رہا تھا۔ اس کی مضبوط باہوں کے پٹھوں پر گاڑھے دودھ کی سوئی اور سفید بوندیں چمک رہی تھیں۔ اُس نے نظر اُٹھا کر اجنبیوں کی طرف دیکھا اور پھر جب جیل سنگھ سے نظریں ملیں تو اُس نے 'اخاہ' کا نعرہ لگا کر دودھ کی بالٹی وہیں زمین پر رکھ دی۔ ادھر جیل سنگھ نے بھی سانڈنی پر سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ دوسرے لمحہ میں وہ دونوں بغل گیر ہو گئے۔ اسی اثنا میں باقی لوگ بھی سانڈنیاں بٹھلا کر اُتر آئے اور پھر بانگورو جی کا کھالصہ، سری بانگورو جی کی فتح کے نعروں سے فضا گونج اُٹھی۔

جیل سنگھ کے سوائے کاہن سنگھ کسی کے نام تک سے آشنا نہیں تھا۔ تاہم وہ سب کو بڑی تکریم سے گھر کے صحن میں لے گیا۔ دیواروں کے ساتھ کھڑی ہوئی چارپائیوں کو اُٹھا اُٹھا کر صحن کے بیچ میں ڈال دیا۔ ان پر چارخانے یا حاشیے پر چوڑی چوڑی سُرخ لکیروں والے کھیس بچھا کر مہمانوں کو بٹھایا اور سب سے پہلے باسی روٹی کے ٹکڑوں پر مکھن کے گولے رکھ کر کھانے کے لئے پیش کئے اور پینے کے لئے ہاتھ ہاتھ بھر لمبے لمبے گلاسوں میں چھاچھ۔

ناشتے کے ساتھ ساتھ باتیں بھی ہوتی رہیں۔ کاہن سنگھ بڑا ہنسوڑ تھا۔ اسے اگر کچھ کہنا ہوتا تو ہنس کر کہتا اور اگر کوئی بات سننی ہوتی تو بھی ہنسے جاتا۔ باقی کو اس کی شخصیت میں

کشش محسوس ہوئی۔ اس کا رنگ گورا، سر اور داڑھی کے بالوں کا رنگ بھورا تھا عمر بیس اکیس برس کے لگ بھگ ہوگی۔ ناک خوب اونچی۔ دانت خوبصورت مضبوط اور چمکدار۔ جب وہ ہنستا تھا تو اُس کے منہ کے دہانے کے دونوں گوشے کانوں کی لوؤں کی جانب کھنچ جاتے تھے۔ اور اس کے دانتوں کی قطار بہت دُور تک نمایاں ہو جاتی تھی۔ اسے اس قسم کا منہ بہت پھبتا تھا۔ اس وقت اُس نے پگڑی بھی گوگوں کے انداز میں باندھ رکھی تھی۔ یعنی پگڑی کا ایک گوشہ پیشانی پر اور دُوسرا گدی پر ہونے کی بجائے دونوں کونے کانوں کے اُوپر بن گئے تھے اور پیشانی کا بہت سا حصہ پگڑی کی لپیٹ میں آگیا تھا۔

وہ عورت جس نے اسے متبنّیٰ بنایا تھا بھی ان کے قریب آن بیٹھی۔ عورت کی عمر ستائیس اٹھائیس برس سے زیادہ نہیں تھی۔ حرکات و سکنات سے ضرور سنجیدگی ٹپکتی تھی لیکن شکل و صورت سے وہ بالکل نو عمر دکھائی دیتی تھی — پائی نے جیل سنگھ کی زبانی ان دونوں کا قصہ سن لیا تھا۔ لیکن دونوں کی صورتوں سے اس خباثت کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔

کاہن سنگھ نے بآواز بلند کہا:

"جیل سنگھ مجھے تم نے کوئی کھبر نہ بھیجی۔ میں تو سمجھے بیٹھا تھا کہ اب تم نہیں آؤ گے۔"

"واہ ...... ارے ایسے موقعے پر بھی نہ آتا تو کب آتا۔ جرا ادھر اُدھر کے کاموں میں دیر ہوگئی۔ اب کے بیں اپنے ساتھ ایک نئے ساتھی کو بھی لے جانا چاہتا تھا" یہ کہہ کر اس نے پائی کی جانب اشارہ کیا۔ "بس اسی لئے ٹیک سمے پر نہیں پہنچ سکا۔ کھیر ایسی دیر بھی کیا ہوئی ہے۔ جیادہ سے جیادہ دو دن اُوپر ہوگئے ہوں گے .... کیا دیکھتے ہو، میرا دوست ہے پالا سنگھ!"

کاہن سنگھ نے مسکرا کر پالا سنگھ کی طرف دیکھا۔ جیل سنگھ پھر بول اُٹھا "ارے بھئی، اس کی عمر پر نہ جانا۔ بڑا پرچنٹ ہے یہ۔"

بچارا پائی ہزار کوشش کرے اس کی صورت سے حلم اور انکسار کے جذبات کا اظہار ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ جیل سنگھ کی بات سُن کر کاہن سنگھ قہقہہ مار کر ہنسا۔

"واہ یار، کھوب کہی ....."

اور پھر کاہن سنگھ نے مصافحے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا۔

پاپی کو اس کا یہ مشغول پسند آیا اور وہ اظہار خوشنودی کے طور پر مسکرانے لگا یہاں تک کہ اس کے دانتوں میں ٹھکی ہوئی سونے کی میخوں کے سر نظر آنے لگے۔

ان دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کر لیا تھا۔ دل سے دل مل گئے تھے۔

جیل سنگھ نے انگوچھے سے مونچھیں اور داڑھی صاف کرتے ہوئے پوچھا:

"اچھا یہ تو کہو سارا معاملہ طیار بر تیار ہے نا؟"

"کیا۔۔۔۔۔"

جیل سنگھ نے آنکھ ماری۔

"وہی۔۔۔ اپنے آدمی۔۔۔۔ اور ڈاچیاں (سانڈنیاں)۔"

"او ہاں۔۔۔۔ پرسوں تک تو سب کچھ طیار تھا۔ اب بھی طیار سمجھو میں یہ کچھ کر کر شاید تم نے وہاں جانے کا ارادہ ترک کر دیا ڈھیلا پڑ گیا تھا۔

۔۔۔ جرا آدمی بھیجنا پڑے گا۔ سو ابھی بھیجے دیتا ہوں۔"

"ہاں تو پھورا آدمی بھیج دو، کھبر کر دو سب کو۔"

"بے پھکر رہو۔ اچھا یہ تو بتاؤ۔ یہاں تو نہیں بلانا کسی کو۔۔۔۔"

"ارے نہیں۔۔۔۔۔"

"سب کو کس جگہ ملنا ہوگا۔۔۔"

"گوردوارہ لکھوا صاحب میں اکٹھے ہو جائیں گے سب۔ یہاں سب کو جمع کرنا تو بھول ہوگا نا۔ بس گوردوارے میں ارداسا سو دیں گے (دعا کریں گے) اور چل دیں گے۔" یہ کہہ کر اس نے باقی ساتھیوں کی طرف دیکھا "کیوں ٹھیک ہے جرا لا سنگھ۔۔۔ چنتو۔۔۔"

"ٹھیک، بالکل ٹھیک۔"

اس اثنا میں کاہن سنگھ منہ کھولے سب کی جانب دیکھتا رہا۔ پھر بولا:

"اور کون سے بکت پر اکٹھے ہونا چاہیئے۔"

جیل سنگھ نے قدرے تامل کیا۔

"آج ہمیں جس گاؤں میں جانا ہے۔ بھلا کتنی دور ہوگا یہاں سے؟"

"تم کدھ بھی تو دیکھ چکے ہو۔ آپ ہی بتاؤ نا۔"

"یہی ہوگا کوئی سات آٹھ کوس . . . کیوں؟"

"ہاں بس اتنا ہی ہوگا۔"

"اچھا اور چاند کب چھپے گا؟"

"دیکھ لو تم چوک گئے۔ ہیر پھیر میں اماوس کی رات بھی گنوائی۔"

"کاہن سنگھ میں نے تمہیں اتنی مرتبہ کہا ہے کہ جو بات ہو چکی۔ اس کو مت رویا کرو . . .

. . . ابھی کوئی کھاس پھرک نہیں پڑا۔ چندرماں آدھی رات سے پہلے ڈوب جائے گا۔ اور میں سمجھتا ہوں۔ ہمیں آدھی رات سے پہلے وہاں پہنچ جانا چاہئے۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ گاؤں میں لڑنے والے آدمی بہت کم ہیں اور جو ہیں وہ ہمارا مکابلہ کرنے سے ڈریں گے۔ اگر لڑنے آئیں گے بھی تو مُسیبت میں مارے جائیں گے۔ سمجھے نہ ہم چاند رہے۔ اپنا کام سر کر دیں گے . . . ."

چنتو نے ٹانگیں پھیلا کر کھڑے ہوتے ہوئے ہاتھ ہوا میں بلند کیا اور حسبِ معمول جوشیلی آواز میں بولی:

"ادھر ادھر چاند ڈوبے گا۔ ادھر ساہوکاروں کی تکدیر ڈوب جائے گی ہاہا۔"

اس پر سب لوگ "ہاہا" کرنے لگے۔

جیل سنگھ نے فیصلہ کُن لہجے میں کہا:

"رات کا کھانا کھا کر سب لوگ اکٹھے ہو جائیں۔ پھورا آدمی بھیج دو . . . ."

"ابھی پھورا ہی لو۔"

"ہاں اب سب لوگ باتیں بند کر دیں۔ کاہن سنگھ ہم نے ساری رات جاگ کر بہت لمبا سفر طے کیا ہے۔ آج رات بھر جاگنا ہوگا۔ اب ہم سب کے سونے کا بندوبست کر دو۔ دوپہر کو کھانے کے بکت سے پہلے مت جگانا۔ کھانا کھانے کے بعد ہم لوگ پھر سو جائیں گے . . . ."

یہ سُن کر کاہن سنگھ نے ان کے سونے کے لئے پسار میں چارپائیاں بچھوا دیں۔ اور ادھر رات کے تھکے ماندے مسافر لیٹے اور اُدھر خراٹے لینے لگے۔

دوپہر کو کھانا کھانے کے لئے انھیں جاگنا پڑا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ پھر سو گئے۔

کاہن سنگھ کی عورت نے پنکھا جھل جھل کر ان کی سیوا کی جیسے وہ بڑے مبارک کام کے لئے جانے والے ہوں۔

شام ہوئی تو کاہن سنگھ نے چھلے ہوئے بادام، چاروں مغز، مرچ سیاہ، الائچی خورد، سونف بھنگ، کھویا وغیرہ باہم گھوٹ کر اور اس میں دودھ ملا کر شردائی تیار کی اور پھر مہمانوں کو جگا دیا۔

جیل سنگھ نے شردائی دیکھ کر پوچھا:

"اے کڑاکے کی سردی میں شردائی کس بیا کو پینے بتائی ہے تجھے۔ اسے پی کر سب کے ہاتھ نہ پھول جائیں گے؟"

کاہن سنگھ نے پھبتی کستے ہوئے کہا:

"چاچا جوانی میں سردی کسے لگتی ہے۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ سردی ہو یا گرمی شردائی ضرور پیتے ہیں۔"

سب کو کاہن سنگھ کے اجڈپن پر تعجب ہوا۔ جوالا سنگھ بولا۔ "تو بھئی تم لوگ پی لو۔ میں بوڑھا آدمی ہوں۔ مجھے تو گرم چیز چاہئے۔"

"شاباش۔" کہہ کر جیل سنگھ نے جوالا سنگھ کی پیٹھ پر پیار سے ایک دھموکا دیا اور گٹھڑی کھول کر تین چار بوتلیں دیسی شراب کی نکالیں اور پکار کر بولا۔ "کاہن سنگھ گلاس یا گچے (آبخورے) لاؤ۔"

کاہن سنگھ نے بہتیرا شور مچایا کہ شردائی میں پانی بوند بھی نہیں، دودھ ہی دودھ ہے لیکن وہاں کون سنتا تھا۔ جیل سنگھ نے اس کے چوتڑوں پر لات مار کر کہا:

"جاوئے بھان چھو۔"

ہنسی ٹھٹھول میں کاہن سنگھ کی کسی نے نہ سنی۔ البتہ اس کے تیار کردہ بھنگ کے پکوڑے کام آگئے۔

بوتلیں ختم کرنے کے بعد جیل سنگھ نے مونچھیں چوس کر ڈکار لی۔ "بھئی شراب کم رہی — چلو اچھا ہی ہے ورنہ رات کو کام کرنے کی بجائے کسی جوہڑ کے کنارے کیچڑ میں لوٹ لگاتے ہوتے۔"

کھانا تیار ہوا تو سب نے پیٹ بھر کر کھایا اور قدرے آرام کرنے کے لئے چارپائیوں پر نیم دراز ہو گئے۔

کاہن سنگھ نے پُر معنی نظروں سے جیل سنگھ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا:

"کیوں بھئی وہ جیپ تو تیار ہے نا؟"

"وہی شخص۔"

جیل سنگھ سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ بندوق کی طرف ہے۔ "ہاں بھائی بالکل تیار ہے ...... بھلا وہ بھی بھولنے کی چیز ہے؟"

کچھ دیر تک ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ آخر وہ لوگ تہبند کس کر اُٹھ کھڑے ہوئے، صحن کے دروازے کے قریب رُک کر کاہن سنگھ نے حاضرین کو سرگوشی میں بتایا کہ اُس نے سانڈنیاں اور دیگر سامان گوردوارہ کھوا صاحب کو بھیج دیا ہے۔ تاکہ گاؤں سے روانہ ہونے پر کسی کو کوئی شبہ نہ ہو۔

سب نے اُس کی دُور اندیشی کی داد دی۔

ڈاکوؤں کا یہ چھوٹا سا گروہ پیدل چلتا ہُوا کوس ڈیڑھ کوس پرے گوردوارہ کھوا صاحب کے احاطے میں پہنچ گیا۔ یہ گوردوارہ ویران جگہ میں بنا ہُوا تھا۔ کسی پُرانے شہید کی سمادھ بنی تھی اور ایک نہائت بوڑھا گرنتھی جسے آنکھوں سے بہت کم سجھائی دیتا تھا، یہاں رہا کرتا تھا۔

جیل سنگھ کی صورت دیکھتے ہی دس گیارہ آدمی ان کے سامنے آن کھڑے ہوئے۔ عمریں مختلف تھیں لیکن تھے سب کے سب مضبوط اور طاقتور۔ ان میں تین سانہسی قوم کے مسلمان تھے اور ایک بازی گر۔ ایک ہندو جو اسی گاؤں کا رہنے والا اور بھیدی تھا اور باقی سکھ تھے۔

پالا سنگھ نے بھی بڑے بڑے کام کئے تھے۔ لیکن اس طرح منظم ہو کر ڈاکہ ڈالنے کا اتفاق کبھی نہ ہُوا تھا۔ اُس نے ایک ہی نظر میں تاڑ لیا کہ ان میں سے ہر شخص جھگڑالو مزاج ہے۔ لیکن ہر ایک اپنے فن میں کامل نہیں تھا۔ بلکہ بعض تو ایسے بھی تھے جو سونچی کھیل کر یا ودڑ لگا کر یا کسی میلے ٹھیلے پر چھوٹی موٹی لڑائی جیت کر قسمت آزمانے کے لئے چلے آئے تھے۔ اس میں شبہ نہیں تھا کہ جیل سنگھ نے نہایت احتیاط سے ان آدمیوں کو چُنا تھا وہ سب نہ صرف طاقتور تھے بلکہ دلیر اور قابلِ اعتبار بھی دکھائی دیتے تھے۔

جیل سنگھ نے سب کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ شاید وہ جانتا تھا کہ ان میں سے بہتیرے آج کی رات کے بعد ان کاموں سے توبہ کر لیں گے۔ لیکن اس کے ساتھ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جب ایسے موقعوں پر لڑائی شروع ہو جاتی ہے تو ہر آدمی کو اور نہیں تو اپنی جان بچانے کے لئے لڑنا ہی پڑتا ہے۔ اگر فرار ہونا پڑے تو اس کا اور جوالا سنگھ کا قاعدہ یہ تھا کہ ان

لاشوں کے سر کاٹ لیتے، جو بھاگ سکتے ان کو بھگائے جاتے، جو نہ بھاگ سکتے ان کو مُردوں میں شامل کر دیتے۔

اپنے ساتھیوں سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد جَیل سنگھ گاؤں کے بھیدی مُن ہَر کلال ۔۔ جسے سب محض کلال کہہ کر پکارتے تھے ۔۔ کی طرف متوجہ ہُوا۔

کلال کا سر اُسترے سے گھٹا ہُوا تھا۔ عمر پچاس سے کسی طرح کم نہ تھی۔ گردن موٹی اور کندھے مضبوط، پیٹھ چوڑی، ہاتھ وزنی اور انگلیاں موٹی تھیں۔ اُس کے گھٹے ہوئے سر پر چھویوں اور لاٹھیوں کی ضربوں کے متعدد نشان تھے۔ جنھیں دیکھ کر انسان اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ زندگی کے نشیب و فراز سے گزر چکا ہے۔

جَیل سنگھ سے نظریں ملتے ہی کلال نے اپنے مخصوص انداز میں اپنے ناہموار پیلے دانت نمایاں کیے۔ ہنستے سمے جالا سنگھ کی طرح اُس کی آنکھیں بھی گالوں اور ابروؤں کے درمیان ڈوب کر گُم سی ہو جاتی تھیں۔ جَیل سنگھ نے پوچھا:

"تمہارے کھیال میں اتنے آدمی کافی ہوں گے؟"

"ہو کافی سے بھی جیادہ" یہ کہتے ہوئے وہ جَیل سنگھ کے اور قریب چلا آیا۔ اس کا قد سردار کی نسبت چھوٹا تھا۔ چنانچہ اُس نے چُندھی آنکھوں سے جَیل سنگھ کی اونچی ناک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"وہاں ہئی کون؟ اتے جوان تو سارا گاؤں لُوٹ سکتے ہیں۔۔۔۔ ساہوکاروں کی مدد کو کون آئے گا۔"

"اور وہ بندوخ۔"

"بندوخ شہر میں بننے کے لئے گئی۔ ابھی تک نہیں آئی۔"

"تمہیں اچھی طرح معلوم ہے؟"

"ہو۔۔۔۔ کیوں نہیں۔۔۔۔"

"گاؤں میں اور کسی کے پاس تو بندوخ نہیں؟"

"نہ۔"

"ہمارے پاس کتنی سانڈنیاں ہیں کاہن سنگھ؟"

"دس ۔ ۔ ۔ ۔ اور سب کی سب اصیل۔ پاؤں کی پکی۔ کوسوں بنا تھکے چلی جاتی ہیں۔ بلی کی طرح پاؤں پڑتے ہیں جمین پر۔ کیا مجال جو جرا سی آواج بھی آئے ان میں ایک بھی ایسی نہیں جو جرا سا بھی بلبلائے۔"

"بس ٹھیک ہے۔"

کچھ دیر تک پھر ادھر اُدھر کے مشورے ہوتے رہے۔ آخر کار وہ اُرداس کے لئے کھڑے ہو گئے۔ ڈاکوؤں کے اس گروہ کا وہی حال تھا کہ جب پروردگار کے حضور میں حاضر ہوئے تو سب ایک ہو گئے۔ کوئی مذہبی تفرقہ نہ رہا۔ آنکھیں موند کر منتیں مانی گئیں۔

ارداس کرنے کا تو لونہی رواج پڑ گیا تھا۔ ورنہ اس رات تو کامیابی کی اُمید اس قدر پختہ تھی کہ کسی قسم کی دُعا کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

چاندنی چاندنی میں لمحہ بھر چھُوتیوں کی جگمگاہٹ پیدا ہوئی اور وہ ہٹ کر سانڈنیوں پر سوار ہو گئے۔ سانڈنیاں نکیل کا جھٹکا محسوس کرتے ہی چپ چاپ اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ اور چشم زدن میں ہوا سے باتیں کرنے لگیں۔

صبا رفتار سانڈنیوں کے لئے سات آٹھ کوس کا فاصلہ طے کرنا کچھ مشکل نہ تھا چنانچہ ناہموار راستے کے باوجود وہ تقریباً دس بجے منزلِ مقصود پر جا پہنچے۔

گاؤں سے ادھر ہی وہ قبرستان میں رُک گئے۔

یہ ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کی ملی جلی آبادی تھی۔ زیادہ تعداد مسلمانوں کی تھی جو غریب تھے۔ سکھوں کے صرف پانچ سات گھر تھے۔ البتہ ہندو ساہوکاروں کے سبب یہ گاؤں خاصا مشہور تھا۔

اس قسم کی تفصیلات بتانے کے بعد کلال نے زمین پر انگلی سے لکیریں کھینچ کھینچ کر گاؤں کی گلیوں کا نقشہ بنایا۔ مطلوبہ مکان گاؤں کے بیچوں بیچ بنا ہوا تھا۔ یہ سب سے زیادہ موٹی اسامی تھی۔ پہلے اسی پر ہاتھ صاف کرنے کا ارادہ تھا اور اس کے بعد حسب موقعہ دوسروں پر ہاتھ صاف کرنے کا بھی خیال تھا۔

سارا پروگرام بن جانے کے بعد جیل سنگھ نے چاند کی طرف دیکھا جس کے ڈوبنے میں ابھی کافی وقت باقی تھا۔

جیسا کہ پہلے طے ہو چکا تھا۔ سادھو سنگھ کو سانڈنیوں کی رکھوالی کرنی تھی چنانچہ اس نے اُونچی اور گھنی جھڑبیریوں کے بیچوں بیچ سانڈنیوں کو اس ترتیب سے بٹھایا کہ دیکھنے والوں کو بھی شک نہ ہو۔ ایک آدمی کو سامان باندھنے کے لئے بوریاں اٹھوادی گئیں۔ سب نے اپنے جوتے اتار کر مضبوطی سے سروں پر باندھ لئے۔ ٹھاٹھے کس لئے گئے تاکہ نہ صورت اچھی طرح پہچانی جا سکے اور نہ سر کی پگڑیاں گرنے پائیں۔ ہتھوڑیاں، تیشیاں وغیرہ بھی ساتھ لے لی گئیں اور جب وہ لوگ چھویاں ڈانگوں پر چڑھا کر بالکل تیار ہو گئے تو کاہن سنگھ نے پہلے تو ہر ایک شخص کو منہ میں رکھنے کے لئے آٹھ آٹھ دس دس منقے دئے۔ اس طرح دم نہیں پھولتا تھا۔ پھر اُس نے ہر ایک کو دو تین روٹیاں دیں اور ہدایت کی کہ خبردار! جو کتے تم پر بھونکیں تو ان کو نہ تو دھتکارو اور نہ انہیں مارو۔ اس طرح وہ اور زور سے بھونکنے لگتے ہیں۔ گاؤں والوں کے کان بھی کتوں کی آوازوں کی طرف لگے رہتے ہیں جو کتا بھونکے۔ آہستہ سے پچکار کر ایک ٹکڑا روٹی کا اس کے آگے ڈال دو۔

وہ لوگ قبرستان کے ایک سرے پر کھڑے ہوئے درخت کے سائے تلے چلے گئے۔ جیل سنگھ نے گاؤں کی جانب نگاہ دوڑا کر دیکھا۔

اس وقت ساری بستی پر شمشان کی سی خاموشی طاری تھی۔ کچی اینٹوں اور گارے کے بنے ہوئے مکانات ایک طویل قبر کی مانند دکھائی دے رہے تھے۔ درخت دم بخود کھڑے تھے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے گاؤں کا گاؤں ڈاکوؤں کی آمد پر سہم گیا ہو۔

ڈاکو منتشر ہو کر گاؤں کے عین سرے پر پھیلے ہوئے برگد کے گھنے درخت کی طرف دبے پاؤں بڑھنے لگے۔ جیل سنگھ کی ہدایت کے مطابق بالا سنگھ کی ڈیوٹی یہ تھی کہ وہ جیل سنگھ کے ساتھ ساتھ رہے۔ دوسروں کے نزدیک تو یہ قابلِ فخر بات تھی لیکن پاپی کو جیل سنگھ کا تحکمانہ انداز پسند نہیں تھا۔ شکر کا مقام ہے کہ اُس نے پاپی سے ترش کلامی نہیں کی۔ ورنہ دونوں مست ہاتھیوں کی طرح ایک دوسرے سے بھڑ جاتے۔

جوالا سنگھ، جھنتو، کاہن سنگھ اور کلال وغیرہ ایک دوسرے کو ہاتھوں سے اشارے کرتے ہوئے بڑھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ وہ سب بڑ کے درخت کے نیچے بخیر و عافیت پہنچ گئے۔

جبل سنگھ نے ایک مرتبہ اور اپنے گروہ کا جائزہ لیا۔ پھر اس نے چپکے سے اپنے لمبے چوڑے ہاتھ میں کلاں کی کھوپری تھام کر مذاقاً دھکیل کر گروہ کے آگے کر دیا۔ اب وہ دو دو تین تین آدمیوں کی ٹکڑیوں میں تقسیم ہو کر آپس میں فاصلہ رکھتے ہوئے گلی کی طرف بڑھے۔

دیواروں کے سایوں تلے سے چلتے ہوئے قدم بقدم وہ آگے بڑھتے جا رہے تھے اتنے میں چوکیدار کی پکار سنائی دینے لگی۔

"جاگدے رہو! ...... جاگدے رہو!"

در و دیوار پر پُراسرار خاموشی طاری تھی۔ گاہے بگاہے گروہ کے لوگ ایک دوسرے کی جانب پُرمعنی نظروں سے دیکھ کر اثبات میں سر ہلا دیتے۔ ان کی بغلوں میں چھویوں والے لٹھ دبے ہوئے تھے۔ کبھی کبھار چاند کی کرن پڑنے پر تیز چمکدار چھوی جگمگا کر بجلی کی طرح آنکھ دکھا دیتی۔

بالا سنگھ کا دل دھڑک رہا تھا۔ بیسیوں انسان ان بے حس مکانوں میں بند میٹھی نیند سو رہے تھے۔ نہ معلوم وہ کب جاگ اٹھیں اور کب چیخ و پکار اور قتل و غارت کا بازار گرم ہو جائے۔ دبے دبے جوش کے تحت بالے کا دل ضرور دھڑک رہا تھا مگر جسم میں چیتے کی سی پھرتی آ گئی تھی۔ بازوؤں پر اس قدر سردی کے باوجود پسینے کی ننھی ننھی بوندیں نمودار ہو گئی تھیں لیکن اسے بڑا لطف آ رہا تھا۔

اُمید کے مطابق دو چار مرتبہ کتوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ کاہن سنگھ کی ترکیب کارآمد ثابت ہوئی۔ تاہم ایک مرتبہ تو کتے اپنی مخصوص آواز میں کچھ ایسے بے طرح بھونکے کہ انہوں نے سمجھا کہ قریب کے لوگ ضرور جاگ اٹھیں گے۔ لیکن خیر گزری آدمی تو نہ جاگے۔ البتہ چوکیدار کی آواز کچھ قریب سنائی دی تو وہ بھاگ کر ادھر اُدھر چھپ گئے۔ گلی کے سرے پر چوکیدار نمودار ہوا تو وہ تنہا نہیں تھا۔ چند آدمی اس کے ساتھ موجود تھے۔ ڈاکو سمجھے کہ شاید کتوں کے بھونکنے کے باعث ان لوگوں کو شبہ ہو گیا لیکن کلاں نے تسلی دی کہ یہ بات لازمی نہیں۔ چوکیدار کے ساتھ عموماً گاؤں کے چند آدمیوں کا گروہ بھی پہرہ دیتا ہے اور اگر وہ لڑ بھی پڑیں تو انہیں بھاگتے ہی بنے گی۔

اصل معاملہ جو کچھ بھی تھا۔ وہ سب لوگ بالکل تیار ہو کر کھڑے ہو گئے۔ اور جبل سنگھ

نے دہکتی ہوئی آنکھوں سے سب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ اگر وہ لوگ ذرا سی بھی مشکوک حرکت کریں تو ایک دم پل پڑو اور چشم زدن میں ان کا صفایا بول دو۔

اپنی اپنی کمین گاہ میں چھپے ہوئے ڈاکو ہاتھوں میں چھوریاں لئے لڑ مرنے کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ گاؤں کے آدمیوں کی باتیں کرنے کی آواز قریب سے قریب سنائی دینے لگی۔ قیاس سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کے دل میں کوئی شک نہیں ہے وہ اپنی ہی باتوں میں مگن تھے۔ یہاں تک کہ وہ گلی کی دوسری طرف چلے گئے۔ اچھا ہی ہوا جو لڑائی کی نوبت نہیں آئی۔ ورنہ ابھی سے شور بلند ہوتا اور نہ معلوم اس کا کیا نتیجہ نکلتا۔

میدان صاف پاکر سب سے پہلے کلاں کمین گاہ سے باہر نکلا اور اس نے اپنے گرد جمع ہوتے ہوئے ڈاکوؤں سے کہا۔ چار آدمی اس طرف چھپے رہیں۔ اور چار مکان کی دوسری گلی کے پرے سرے کے طویلے میں پوشیدہ رہیں تاکہ مکان میں داخل ہونے والوں کو گاؤں والے باہر سے گھیرے میں نہ لے لیں۔

"لو بھائی جیل سنگھ اب تم وہ آدمی چن لو جنھیں تم اپنے ہمراہ لے جانا چاہتے ہو"۔

جیل سنگھ نے پالا سنگھ، جوالا سنگھ، چنتو، کاہن سنگھ، کلاں، شیرے اور بیجا سنگھ کو اپنے ہمراہ لیا اور باقی لوگوں کو ان کی کمین گاہوں میں پہنچا دیا گیا۔

یہ کام ہو چکا تو کلاں نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا:

"تم جرا ہوشیاری سے یہاں کھڑے رہو۔ میں دیوار پھاند کر اندر جاؤں گا اور ڈیوڑھی کا درواجہ کھول دونگا۔ تم سب اندر گھس آنا۔ بس پھر سمجھو کہ آدھی مسکل تو حل ہو گئی..."

چنتو نے انگلی گھما کر کوے کی چونچ کی طرح اُس کی گھٹی ہوئی کھوپری پر ٹھونگ لگاتے ہوئے کہا:

"بس بیٹا بے فکر رہو۔ باقی سب کچھ ہم پر چھوڑ دو۔ ہم سنبھال لیں گے"۔

کلاں نے کھوپری سہلاتے ہوئے پالا سنگھ سے کہا:

"بھئی پالا سنگھ تم لمبے ہو سب سے جرا صحن کی دیوار تک چڑھا دو مجھے"۔

پالی نے سہارا دے کر اسے اوپر چڑھا دیا۔

اب وہ دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگے۔ چنتو احتیاطاً بندوق لے کر دروازے کے

قریب کھڑی ہو گئی۔ اس وقت ان سب کو ایک ایک لمحہ گزارنا بھاری ہو رہا تھا۔ آخر دروازے کے تختے جنبش کرنے لگے۔ وہ سنبھل گئے۔

دروازہ کھلا اور انہوں نے فوراً اندر گھس کر ڈیوڑھی کے دروازے کی کنڈی چڑھا دی۔

کلاّں انہیں راستہ دکھاتا ہوا آگے بڑھا۔ سردی کے باعث گھر کے سب لوگ اندر سو رہے تھے۔ کلاّں نے مسکرا کر کہا۔

"پہلے ڈیوڑھی میں ایک بوڑھا سویا کرتا تھا۔ اسے لالہ نے نکال دیا۔ مجھے ڈر تھا کہ کوئی دوسرا آدمی نہ رکھ لیا ہو۔ معلوم ہوتا ہے آج پرماتما بہت ہی مہربان ہے ہم پر۔"

کاہن سنگھ نے مسکرا کر سرگوشی میں کہا:

"ارے بھئی ایسے نیک کام میں تمہارے پرماتما مہربان نہ ہوں گے تو اور کب ہوں گے۔"

کلاّں نے ایک مرتبہ تہمند کو پھر کس کر باندھتے ہوئے کہا:

"لو استاد جیل! ہمارا کام تو پورا ہوا۔ اب تم آگے بڑھو!"

جیل سنگھ نے آگے بڑھ کر چپ چاپ اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ اس وقت لوگ دیوار کے سائے تلے کھڑے تھے۔ جیل نے کہنا شروع کیا:

"اچھا تو کلاّں یہ بتاؤ کہ چھت کی طرف سے کوئی ڈر تو نہیں ۔ ۔ ۔ ۔"

کلاّں نے قدرے تامل کیا:

"ڈر تو ہو سکتا ہے۔ تم جانو چھت سے چھت ملے ہوئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کوئی ہمت کر کے ادھر چلا آئے اور ہاں پسار کے اندر سے ایک سیڑھی چھت پر چڑھتی ہے۔ وہاں ممٹی بنی ہوئی ہے۔ اس کا دروازہ تو اندر سے بند ہوگا۔ لیکن ایک دو آدمی اس دروازے کے سامنے بھی جرور ہونے چاہئیں۔ اگر گھر کا کوئی آدمی ادھر سے بھاگنا چاہے تو اسے کابو میں کر لیا جائے۔"

یہ سن کر جیل سنگھ بولا:

"مطلب یہ کہ چھت پر بھی پکا بند و بست ہونا چاہیئے۔ اچھا تو جوالا سنگھ میں بالا سنگھ کو لے کر چھت پر بھیج دوں گا۔ میرا کھیال ہے کہ اگر سارا گاؤں اکٹھا ہو کر آجائے تو

بھی ہم دونوں نبٹ لیں گے۔۔۔" یہ کہہ کر اُس نے فخریہ نظروں سے پاٰنی کی طرف دیکھا اور پاٰنی نے خوش ہوکر جواب میں نتھنے پھلائے اور تھوک کی پچکاری چھوڑ دی۔

جیل سنگھ نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ "بندوق چنتو کے پاس رہے گی۔ کارتوس کی پیٹی بازو پر پست لٹکاؤ، آر پار پہن لو۔ کاّل تم چھپے رہو۔ چنتو دروازے سے ہٹ کر تنور کے پاس بیٹھی رہے گی، تاکہ گولی چلانے میں آسانی رہے۔ دیکھو چنتو گولی یا تو اس وقت چلانا جب گھر کا کوئی آدمی لڑنے مرنے پر آمادہ ہو جائے یا جب گاؤں والے جاگ کر شور مچانے لگیں۔ اس وقت دو تین ہوائی فیر کر دینا۔ جوالا سنگھ تم باقی آدمیوں کو لے کر گھر کا دروازہ کھلوا کر یا توڑ کر اندر داخل ہو جاؤ۔ آگے تم خُد ہوشیار رہو۔۔۔۔"

سب طیاریاں مکمل ہوگئیں تو جیل سنگھ پاٰنی کو ساتھ لے کر نچلی چھت کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔ سیڑھیوں کے اوپر پہنچ کر جیل سنگھ نے پاٰنی کی جانب دیکھا۔ ذہنی طور پر اب وہ ایک دوسرے کے بہت قریب ہو چکے تھے۔ اس وقت پاٰنی کے دل میں عظیم الجثہ ڈاکو کے لئے دوستانہ جذبات پیدا ہو چکے تھے۔

جیل سنگھ نے سب کو طیار پاکر اوپر کھڑے کھڑے گردن ہلا کر اشارہ کیا۔ جولا سنگھ بھی اسی کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اشارہ پاتے ہی اُس نے دروازے پر زور سے لات رسید کی۔

"دروا جا کھولو۔۔۔۔ ہو"

سب کی آنکھیں دروازے کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ جوالا سنگھ نے دستک جاری جاری رکھی۔ اندر سے دھیمی سی زنانہ آواز سنائی دی

"کون ہے؟"

جوالا سنگھ نے بھاری بھرکم آواز میں خرا کر کہا۔

"بیٹیا دروا جا کھولو۔۔۔۔ تمہارے سُسر آئے ہیں۔"

یہ کہہ کر جوالا سنگھ حاضرین کی طرف اپنی گدلی آنکھوں سے ایک نظر دیکھ کر مسکرایا۔

جیل سنگھ نے پاٰنی کی طرف مخاطب ہو کر کہا:

"دیکھ لیا حرام جادے کو۔"

اور پھر وہ چھت پر چلے گئے۔ یہ اصل میں نہیں بلکہ پہلو کی چھوٹی اور نچلی چھت تھی گھر

کی بڑی چھت اس سے چھ سات ہاتھ بلند تھی۔ بڑی چھت کا تقریباً دو تین ہاتھ چوڑا چھجا آگے بڑھا ہوا تھا۔ پالی نے چھجے کے نیچے کی جانب نگاہ دوڑائی۔ لکڑی کی متعدد شہتیریاں آگے تک بڑھی ہوئی تھیں۔ پالی نے کہا:

"میرے کھیال میں ہمیں اُوپر والی چھت پر جانا چاہیے۔"

"ہاں لیکن یہاں سیڑھی تو ہے نہیں۔"

"بھئی اصل سیڑھیاں تو اندر سے اُوپر جاتی ہیں۔ یاد نہیں جوالا سنگھ نے کیا بتایا تھا"

جیل سنگھ ادھر اُدھر نگاہ دوڑا کر بولا:

"ہوں . . . . ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن اوپر جانے کا انتجام کیا ہو . . . . یُوں بھی ہو سکتا ہے کہ صحن میں سے کوئی لمبا سا بانس لے آئیں۔ اس کی مدد سے پھلانگ کر اُوپر پہنچ جائیں گے۔"

نیچے صحن سے جوالا سنگھ کی بھاری آواز سنائی دے رہی تھی۔ اب وہ گالیوں اور دھمکیوں پر اُتر آیا تھا۔

"درواجا کھولو . . . . تمہاری بھان کو، تمہاری دھی کو . . . . ہیں . . . . کھولو نہیں توڑ ڈالیں گے۔"

"یوں معلوم ہوتا تھا کہ گھر کے اندر کہرام مچ گیا ہے۔ عورتوں، مردوں اور بچوں کی ملی جلی آوازیں سُنائی دے رہی تھیں۔

پالی نے جھک کر دونوں ہاتھ گھٹنوں پر ٹیکتے ہوئے کہا:

"اب بانس کہاں ڈھونڈتے پھریں گے۔ لو میری پیٹھ پر پاؤں جما کر چڑھ جاؤ چھت پر۔"

جیل سنگھ ہنس پڑا۔

"واہ کیا ترکیب ہے۔ مجھے اس کا کھیال اس لیے نہیں آیا کہ بہت کم لوگ میرا بوجھ اُٹھا سکتے ہیں۔ میں یہ تو بھول ہی گیا تھا کہ آج میرے ہمراہ پالا سنگھ ہے۔"

چشم زدن میں جیل سنگھ اس کی پیٹھ پر چڑھ کر کھڑا ہو گیا۔ پہلے اُس نے چھوی اُوپر والی چھت پر پھینکی اور پھر خود بھی وہاں پہنچ گیا اور گھوم کر کہنے لگا:

"دیکھو پالی! جوالا سنگھ کو کھو کہ اب درواجا توڑ ڈالے۔ نری دھمکیوں سے کام نہ

چلے گا۔"

یہ سُن کر پاگی فوراً سیڑھیوں کی طرف لپکا۔ اُس نے دیکھا جوالا سنگھ دروازہ توڑنے کی تیاری کر رہا ہے۔ دو آدمی صحن کے پرے کونے سے ایک بڑا شہتیر اُٹھائے چلے آرہے تھے۔ جوالا سنگھ گھر والوں کو آخری مرتبہ خبردار کر رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ بلا زیادہ شور وغل کیے دروازہ کھلوالے۔ یہ دیکھ کر پاگی لوٹ آیا۔ وہ زور سے اُچھل کر جٹی چھت پر ہاتھ ڈال کر لٹک گیا اور پھر بازوؤں کے زور پر سارا دھڑ کھینچ کر اُوپر سے گیا۔ اُس نے دیکھا کہ جیل سنگھ منی سے بہت پرے کھڑا کرتے کے بٹن کھول رہا ہے۔ اُسے متوجہ کرنے کے لئے اس نے "ہشش" کی آواز نکالی۔

غالباً اُس نے اس کی آواز نہیں سُنی۔

"ہشش۔"

اب کے اُس نے اس کی طرف دیکھا۔

"مجھے بھی تو اُوپر کھینچو پہلے میں چھوی پھینکتا ہوں۔"

"ارے ٹھہرو، میں پکڑے لیتا ہوں۔ ذرا کرتا اتار لوں۔"

"اس قدر سردی میں کرتا کیوں اتار رہے ہو؟"

"ارے مجھے سردی نہیں لگتی۔ اس طرح چھوی اچھی طرح گھوم سکتی ہے۔"

پاگی اسی طرح لٹکا رہا۔ اس کی ناک دیوار کو چھو رہی تھی۔ مٹی کی بُو اس کے دماغ تک پہنچ رہی تھی۔

جب جیل سنگھ نے کرتا اتار پھینکا تو پاگی نے دیکھا کہ اس کا بدن اگرچہ بہت بھاری تھا۔ لیکن بہت ہی خوبصورت تھا۔ لوہے کی بھٹی کی مانند مضبوط سینہ، بازوؤں کی اُبھری اُبھری مچھلیاں۔ سارے بدن کی نس نس میں بجلی دوڑتی معلوم ہوتی تھی۔ کرتا اتار کر جیل سنگھ نے گھما پھرا کر تہبند کسا۔ چاندنی رات میں وہ دیو پیکر انسان بڑا خوفناک دکھائی دے رہا تھا۔

اتنے میں صحن سے دروازہ توڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔ پاگی نے سوچا۔ ممکن ہے قریب کے گھروں کے بعض لوگ جاگ اُٹھے ہوں۔ ڈر کے مارے باہر نہ آتے ہوں۔

جیل سنگھ ایک مرتبہ تو تن کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے شاہین کی طرح سر ادھر اُدھر گھما کر دُور دُور تک نگاہ دوڑائی اور جب وہ پاتی کی طرف بڑھنے ہی کو تھا۔ دفعتاً بندوق چلنے کی آواز ساری فضا میں گونج گئی۔

خوفناک گرج دار آواز کے ساتھ ہی جیل سنگھ دُہرا ہو گیا۔

پاتی نے پہلے تو یہی سمجھا کہ چنتو نے گولی چلائی ہے۔ لیکن پھر اسے احساس ہوا کہ آواز دوسری جانب سے آئی تھی اور جب اُس نے جیل سنگھ کو دُہرا ہوتے دیکھا تو سمجھ گیا کہ کسی نے اس پر فائر کیا ہے۔ غالباً ممٹی کے دروازے میں سے گولی آئی تھی۔

گولی کھاتے ہی جیل سنگھ پھرتی سے ایک جانب ہو کر ممٹی کے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ غالباً ایک پہلو سے ہو کر ممٹی کے دروازے تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔

پاتی نے سر قدرے نیچا کر لیا۔ وہ حیران تھا کہ اب کیا کرے خطرناک لمحہ آن پہنچا تھا۔ وہ چھت پر بھی نہ چڑھ سکتا تھا۔۔۔۔۔ معاً پھر گولی چلی اور اس مرتبہ جیل سنگھ پھڑک کر نچلی چھت پر آن گرا اور بُری طرح تڑپنے لگا۔

ممٹی کا دروازہ ذرا سا کھلا اور پاتی نے اس میں سے بندوق کی نالی آگے بڑھتی دیکھی۔ اُس نے فوراً ڈھیلے ہاتھ چھوڑ دیئے اور نچلی چھت پر گرتے ہی اُس نے سوچا کہ وہ لپک کر جیل سنگھ کو پیٹھ پر لادے اور صحن میں اُتر جائے۔

اس نے ایک قدم بڑھایا ہی تھا کہ اوپر والی چھت پر جھپٹ کر بڑھنے والوں کے پاؤں کی چاپ سُنائی دی اور وہ فوراً پیچھے ہٹا اور چھجے کے نیچے دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔

پاؤں کی چاپ سے اُس نے اندازہ لگایا کہ بندوقچی عین چھجے کے اوپر کھڑا ہوا تھا۔ غالباً ایک اور آدمی اس کے ساتھ تھا۔

جیل سنگھ گرم ریت پر پڑی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔ پہلی گولی کا تو کچھ پتہ نہ چلتا تھا کہ کہاں لگی ہے۔ البتہ دوسری پیٹ پر لگی تھی۔ اس کا بدن بالکل دُہرا ہو رہا تھا۔ پھیکی چاندنی میں اُس کے تڑپتے ہوئے بدن کی اُوپر تلے ہوتی مچھلیاں اور پٹھے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ چہرے سے درد اور اذیت کے آثار ہویدا تھے۔ چند قدم کے فاصلے پر وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ لیکن پاتی اس کی مدد کرنے سے

معذور تھا۔

اُوپر سے باتوں کی آواز آنے لگی۔کسی نے جلدی سے پُوچھا۔

"تمہیں کوئی اور آدمی بھی دکھائی دیتا ہے؟"

پاتی نے گردن اُٹھا کر چھجے کی شہتیریوں کی طرف دیکھا اور پھر اُچھل کر وہ ایک شہتیری سے لٹک گیا۔

دوسری آواز آئی

"مجھے تو اور کوئی دکھائی نہیں دیتا"

تیسری مرتبہ پھر گولی چلی۔نشانہ ٹھیک بیٹھا اور تڑپتا ہُوا جیتل سنگھ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ٹھنڈا ہو گیا۔

"مجھے ڈر ہے کہ کوئی اور نہ ہو چھت پر۔۔۔"

"روشنی میں تو نہیں چھجے کے نیچے نہ چھپا ہُوا ہو"

"دکھائی تو نہیں دیتا کوئی بھی۔۔۔۔۔"

بندوق کے دھماکوں سے سارا گاؤں جاگ اُٹھا تھا۔دُور دور سے لوگوں کے چلاّنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔صحن میں بھی کھلبلی مچ گئی تھی۔جیتو نے بندوق چلانے کی کوشش کی لیکن وہ نہ چلی۔وہ زور سے چلاّ کر بولی:

"بندوق کا گھوڑا خراب ہو گیا ہے،یہ نہ چلے گی"

یہ سُن کر سب ڈاکوؤں میں کھلبلی مچ گئی۔انہیں یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ گھر والوں کے پاس بندوق ہے۔وہ اس کی آواز سُن چکے تھے۔ادھر دروازے کے آگے گھر والوں نے نہ معلوم کیا روک لگا دی تھی۔پے در پے ٹھوکروں کے باوجود مکمل طور پر نہ ٹوٹ سکا۔

چھت والے دونوں آدمی بندوق لے کر جلد از جلد صحن کی طرف جانا چاہتے تھے۔پاتی نے ٹانگیں اُٹھا کر پاؤں ایک اور شہتیری میں اس انداز سے پھنسا دئے کہ اس کا بدن چھت سے لگ گیا۔اُوپر سے آواز آئی:

"دیکھو تم چھت پر گرد جاؤ اور دیکھو کہ چھجے کے نیچے تو کوئی نہیں ہے نا اگر کوئی آگے بڑھے تو میں گولی سے اُڑا دوں گا"

دُوسرے آدمی نے نچلی چھت پر چھلانگ لگا دی

پالی دم روکے چھت سے چپکا ہوا تھا۔ یوں بھی وہاں تاریکی تھی۔ گھبراہٹ اور عجلت میں آدمی نے بھی نگاہ اوپر نہ اٹھائی۔ اور چلا اٹھا:

"آجاؤ یہاں کوئی نہیں ہے۔"

پالی نے سوچا کہ موقعہ ہوا تو دفعتاً جھپٹ کر بندوق چھین لوں گا۔

لیکن بندوقچی بھی بہت چوکنا دکھائی دیتا تھا۔ اس لئے پالی کا داؤ نہ چل سکا، بلکہ اس کی اپنی جان بال بال بچی۔

دونوں آدمی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئے تو پالی نے اطمینان کا سانس لے کر "تچ" کی آواز کے ساتھ تھوک کی پچکاری چھوڑی اور پاؤں ہٹا کر پہلے نیچے کی جانب لٹک گیا اور پھر زمین پر آن رہا اور پیچھے کے نیچے دیوار سے لگا لگا سیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگا۔

ابھی وہ تین چار قدم آگے بڑھا ہوگا کہ پھر گولی چلنے کی آواز آئی۔ اس نے چھوی مضبوطی سے پکڑ لی۔ وہ ڈرا کہ کہیں بندوقچی واپس نہ لوٹ آیا ہو۔ ابھی وہ کشمکش و پیچ ہی میں تھا کہ پھر گولی چلی۔ دفعتاً بہت سے آدمی زور زور سے چلانے اور للکارنے لگے۔

صحن میں کھڑے ہوئے ڈاکوؤں میں دو آدمیوں کو گولی لگی۔ گلی کے دونوں سروں پر بھی لڑائی شروع ہو گئی تھی۔ صحن میں بھی افراتفری مچ گئی۔ مکمل خاموشی کے بعد دفعتاً اس قدر زور کا شور بلند ہوا کہ مانو قیامت آگئی ہو۔ ڈاکوؤں کو یوں محسوس ہوا جیسے اب ان کے لئے وہاں سے نکل بھاگنا ناممکن ہے۔ ایک تو مکان گاؤں کے بیچوں بیچ، دوسرے گرد ..
کی بوچھار، تیسرے گاؤں کے آدمیوں کی للکار ــــ پالی چھت کے سرے پر پہنچ گیا۔ اس نے دیکھا کہ دونوں آدمی سیڑھیوں پر کھڑے گولیاں برسا رہے ہیں۔ سب آدمی ڈیوڑھی کی طرف بھاگ نکلے۔ بندوق والوں نے ان کا تعاقب کیا۔ پالی کو بڑی چھت پر بھی شور سنائی دینے لگا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اب وہ واپس بھی نہیں جا سکتا تھا۔ چنانچہ وہ قدم ناپتا ہوا ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ وہ دونوں اکہرے بدن اور پست قد کے آدمی تھے۔ لیکن چونکہ ان کے پاس بندوق تھی کم بختوں نے سب کو آگے لگا لیا۔

طویل صحن کے بیچوں بیچ مویشیوں کا حصہ علیحدہ کرنے کے لئے ایک چھوٹی سی دیوار بنی تھی۔ باقی لوگ تو دوسری طرف بھاگ گئے، تنور کے قریب ایک سایہ سا ہلتا ہوا دکھائی دیا۔ بندوقچی نے بندوق اس کی طرف تان کر پوچھا:

"کون ؟"

یکایک گھٹا ہُوا سر چاندنی میں چمکنے لگا اور ایک ملتجیانہ آواز آئی ؛

"چھوٹے بابو مجھے گولی مت مار لیو۔ میں کلال ہوں کلال ؟"

"تیری کلال کی ایسی کی تیسی ؟"

پھر گولی چلی اور کلال وہیں ٹھنڈا ہو گیا۔

باالی کے ذہن میں خیال آیا کہ اب موقعہ ہے ان پر جھپٹنے کا۔ ان کا درمیانی فاصلہ بہت زیادہ تھا۔ پالی بڑی تیزی سے آگے بڑھا۔ لیکن چھوٹے سیٹھ نے فوراً بندوق بھرلی اور آہٹ پاکر اُس نے فوراً بندوق کی نالی اس کی طرف تان دی۔ پالی کے بڑھتے ہوئے قدم رُک گئے۔ لٹھ کے ساتھ بندھی ہوئی چھوی اُٹھی کی اُٹھی رہ گئی۔ اور اُس کو اپنی آنکھوں کے سامنے موت ناچتی ہوئی دکھائی دینے لگی۔ بس ایک لمحہ میں اُس کی کُل امیدوں کا خاتمہ ہُوا چاہتا تھا۔ سرکنوں کو یہ بھی معلوم نہ ہو سکے گا۔ کہ کسی نے اس کی خاطر پردیس میں جان دے دی۔

چھوٹے سیٹھ نے اپنے سامنے پر پھیلائے ہوئے بڑے گودھ کی مانند بلند و بالا جوان کو کھڑا پایا۔ اُس کی اُنگلی بندوق کی لبلبی کو دبایا ہی چاہتی تھی کہ پچھلی دیوار کی اوٹ سے جنتو بجلی کی سی تیزی کے ساتھ باہر نکلی۔ اُس کی بندوق تو بگڑی ہوئی تھی۔ البتہ اُس نے اُس کی نالی پکڑ کر اس کے بٹ سے جو چوٹ لگائی تو بندوق کا نشانہ چُوک گیا گو گولی چل گئی۔ پالی نے بلا کی تیزی سے اسے دبوچ لیا اور اس طرح رگیدا جیسے جنگلی بلا چوہے کو مروڑ ڈالے۔

چھوٹے سیٹھ کے ساتھی نے جرأت کرکے خالی بندوق اُٹھائی۔ کارتوسوں کی پیٹی چھوٹے سیٹھ کے گلے میں تھی۔ وہ خالی بندوق لے کر واپس بھاگ نکلا۔ اتنے میں جوالا سنگھ بھی آگیا۔ اُس نے جو للکارا تو سیٹھ کے ساتھی نے بندوق گھما کر بڑی چھت پر پھینک دی اور خود سیڑھیاں پھلانگتا ہُوا نچلی چھت پر چڑھ گیا۔

بڑی چھت پر بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ ان کا اور تو کوئی بس نہ چلا۔ البتہ اینٹیں برسانے لگے۔ وہ چاہتے تو کچھ نہ کچھ لوٹ لیتے۔ لیکن چاروں طرف گھر جانے کا ڈر بھی تھا۔ یُوں بھی جوالا سنگھ محتاط آدمی تھا۔ اُس نے پالی کو آواز دے کر کہا:

"پالی اب ہمیں بھاگ نکلنا چاہیئے کام بگڑ گیا ہے . . . . جنیل سنگھ کہاں ہے ؟"

• مارا گیا :

"اُف :" یہ کہہ کر جوالا سنگھ دوڑتا ہُوا چھوٹی چھت پر چڑھ گیا۔ سیٹھ کے ساتھی کی چیخوں سے ساری فضا گونج اُٹھی۔ اُونچی چھت پر کھڑے ہوئے لوگوں نے اسے جلدی سے چھت پر کھینچ لیا جب جوالا سنگھ چھوٹی چھت پر چڑھا تو بڑی چھت والے لوگ ڈر کے مارے پیچھے ہٹ گئے۔ وہ سمجھے شاید وہ ان سے لڑنے کے لئے آ رہا ہے لیکن جوالا سنگھ نے چھوی کے ایک وار سے جیل سنگھ کی گردن کاٹی اور سر کو بالوں سے پکڑ کر لوٹا۔ کلال اور ایک آدمی اندر مرا تھا۔ چنتو نے ان کے سر بھی کاٹ لئے بچے کھچے آدمی ڈیوڑھی میں جمع ہو گئے۔ جوالا سنگھ نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا:

"اب ہم لوگوں کو ٹولی بنا کر بھاگنا ہوگا۔ کوئی شخص اکیلا بھاگنے کی کوشش نہ کرے۔"

ڈیوڑھی کا دروازہ کھولا گیا تو معلوم ہُوا کہ ان کے باہر والے بہادروں نے کسی کو اندر نہ آنے دیا تھا جوالا سنگھ نے ہانک لگا کر ایک طرف کے آدمیوں کو بُلایا اور گلی کی دوسری جانب والے مورچے میں جا ملے۔ پھر وہ سب لوگ تندی سے چھویاں گھماتے ہوئے بڑھے۔ اب ان کے قریب بھلا کون آتا۔ جیل سنگھ کا کٹا ہُوا سر دیکھ کر تو سب کی ہمت ٹوٹ گئی۔

خیر وہ کسی نہ کسی طرح سے گاؤں سے باہر نکلے اور جوالا سنگھ کی ہدایت کے مطابق قبرستان کے عین مخالف سمت کو بھاگ نکلے۔ گاؤں کے لوگوں نے ان کا تعاقب کیا۔ لیکن کھیتوں میں پہنچ کر اُن کو اور زیادہ آگے بڑھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

جب وہ بھاگم بھاگ چلے جا رہے تھے۔ معاً جوالا سنگھ نے پُوچھا "شیرا کہاں ہے؟"
کسی نے بتایا کہ صحن میں اسے بھی گولی لگی تھی۔ بھاگا تو تھا۔ لیکن راستے میں گر پڑا۔

جوالا سنگھ نے پالی کو واپس دوڑایا کہ اگر وہ دوڑ سکتا ہو تو بہتر ورنہ اس کا سر کاٹ لاؤ۔ مبادا وہ پولیس کے سامنے ان کا پتہ بتا دے یا مر بھی جائے تو اس کی صورت پہچان کر پولیس انہیں گرفتار نہ کرے۔ پالی واپس بھاگا تو چنتو بھی ساتھ ہو لی۔

"ایک اور ایک گیارہ ہوتے ہیں پالی!"

جب وہ شیرے کے پاس پہنچے تو وہ بُری حالت میں تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ وہ کیوں آئے ہیں۔ اُس نے منت کی: "مجھے مت مارو چنتو!"

لیکن زیادہ گفتگو کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ چینتو کی چھوری ہوا میں گھومی اور اس کا سر گاجر کی طرح کٹ کر زمین پر لڑھکنے لگا۔

چنتو نے سر اٹھایا کہ پھر گولی چلی۔ لیکن وہ بھاگ نکلے۔ سارا گروہ ان کا منتظر تھا۔ وہ لوگ بہت بڑا چکر کاٹتے ہوئے قبرستان میں پہنچے اور ایک لمحہ ضائع کئے بغیر سانڈنیوں پر بیٹھ کر ہوا ہو گئے۔

۱۴
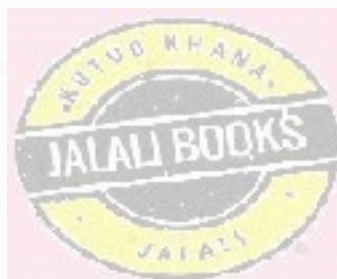
جوالا سنگھ کو عمر بھر اس بُری طرح سے پسپا نہ ہونا پڑا تھا۔ راستے میں زیادہ گفتگو بھی نہیں ہوئی۔ البتہ جوالا سنگھ نے دو ایک مرتبہ کلاآں کو گالی دے کر کہا۔

”حرام جادہ کہتا تھا ان کے پاس بندوک نہیں ہے اور پھر چلّانے لگا چھوٹے بابو مجھے مت مارو، میں کلال ہوں۔ بھلا کوئی پُوچھے کہ تو ان کا سالا تو نہیں لگتا نا جو وہ تجھے چھوڑ دیں۔ اور اگر وہ نہ بھی مارتے تو کیا میں چھوڑ دیتا۔ ۔ ۔ ۔“ پھر اُس نے پالی کی طرف مخاطب ہو کر کہا ”آج تک ہم اس طرح کبھی نہ بھاگے تھے۔ انتجام ٹھیک نہیں تھا۔ بھیدی اچھا ہو، اپنے بنئے۔“

کاہن سنگھ بولا:

”پر چاچا یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ بندوک بن کر آگئی ہو۔ اور کلاآں کو اس بات کا پتہ نہ چلا ہو۔“

”ہاں ہو سکتا ہے۔“ دو تین آوازیں آئیں۔

پالی کہنے لگا:

”اس چھوٹے بابو کی گردن تو میں نے مروڑ ڈالی ہوتی۔ بچ گیا۔ سالے نے ایسی تڑا تڑ گولی چلائی کہ بس۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے بھی مار دیا ہوتا۔ وہ تو بھلا ہو چنتو کا اُس نے کچھ ایسا ہاتھ مارا کہ اس کا نشانہ چوک گیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔“

چنتو نے اٹھتے ہوئے بالوں کو کانوں کے پیچھے دباتے ہوئے کہا:

”ہے! نہ معلوم کہاں سے لایا تھا بندوک جیل سنگھ۔ بندوک ٹھیک ہوتی، تو میں

وہاں ایک ایک آدمی کو بھون ڈالتی ۔۔۔۔۔"

جوالا سنگھ نے سر ہلا کر کہا:

"بچارے جیل سنگھ کی موت کا بہت افسوس ہے۔ پر ہم بدلا لئے بنا نہیں رہیں گے۔ اب کے اور بھی پکا انتظام کر کے جائیں گے۔"

کاہن سنگھ بولا:

"بندوبست تو آج بھی بہت اچھا تھا۔ پر ایک تو ان کے ہاں بندوق نکل آئی جس کا ہمیں پتہ ہی نہیں تھا۔ دوسری ہماری بندوق خراب ہو گئی۔ نہیں تو ہم انہیں مچا چکھا دیتے"

چنتو نے سانڈنی اور بھی تیزی سے اُڑائی اور کاہن سنگھ کے قریب پہنچ کر بولی:

"برخوردار، فکر نہ کرو۔ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ جرم جیسے چھوٹا یا بڑ تو کتے کی موت مارا جائے گا۔"

کاہن سنگھ کے گاؤں کے قریب پہنچ کر جوالا سنگھ نے پالی کو مشورہ دیا کہ اگر وہ سیدھا اپنے گاؤں کو چلا جائے تو بہتر ہو کیونکہ اس طرح کسی کو شک نہ گزرے گا۔ دو چار روز بعد وہ بھی وہاں پہنچ جائیں گے۔

ان سے رخصت ہو کر جب پالی اپنے گاؤں کی طرف چلا تو رفتہ رفتہ اسے اپنی ناکامی کا احساس ہونے لگا۔ اس وقت تک گرما گرمی میں دیگر اُمور زیر بحث رہے۔ لیکن درحقیقت اس کی سب اُمیدیں خاک میں مل گئی تھیں۔ جو جو ہوائی قلعے اس نے اپنے ذہن میں تعمیر کئے تھے آن واحد میں خاک میں مل گئے۔

پالی کا دل بوجھل ہو رہا تھا۔ اب غیر واضح مستقبل اس کے سامنے تھا۔ اس کا ذہن کچھ کام نہیں کرتا تھا۔ سردست اور کسی ذریعے سے روپیہ حاصل ہونے کی امید نہیں تھی اور روپے کے بغیر اس کی دال ہی نہیں گل سکتی تھی۔ ایک نہایت حسین اور جمیل حریف سے مقابلہ تھا جو دُنیاوی جاہ و جلال میں بھی اس سے کئی گنا بڑھا چڑھا تھا۔ شاید جلد ہی ڈاکے کا کوئی نیا پروگرام بن جائے۔ لیکن اس بات کی امید نہیں تھی۔ جب تک قضیہ بالکل ختم نہ ہو جائے۔ اس وقت تک جوالا سنگھ جیسے دُور اندیش شخص سے یہ اُمید رکھنا کہ

وہ کوئی نیا بکھیڑا شروع کر دے گا محض حماقت تھی۔

اسی اُدھیڑبن میں وہ اپنے گاؤں کی جانب بڑھ گیا۔ اس نے اپنے ساتھی سے بھی کوئی بات چیت نہ کی۔ بے توجہی کے سبب ان کی رفتار بھی کم رہی۔ چنانچہ نصف راستہ طے کرنے پائے تھے کہ سورج نکل آیا۔ پالی نے گاؤں سے ایک کوس ادھر سانڈنی روک لی اور اپنے ساتھی سے کہا "بس اسی جگہ اُتر جاتا ہوں یہاں سے پیدل گاؤں پہنچ جاؤں گا۔ دن چڑھ آیا ہے کسی نے ہم دونوں کو ساتھ ساتھ دیکھ لیا تو مفت میں شک ہوگا اسے۔"

اُس نے ٹانگ سے لگی ہوئی چھوی بھی اُتار کر اسے دے دی اور خود محض لٹھ اُٹھائے گھر کو چل دیا۔

گھر والے یہی سمجھے بیٹھے تھے کہ وہ امرت سر اشنان کرنے کے لئے گیا ہوا ہے۔ اُس نے وہاں پہنچتے ہی کہا:

"رات سونے کا موقعہ نہیں ملا۔ لاؤ کچھ کھانے کو دو تاکہ میں جلدی سے سو جاؤں اور پھر جب تک میں خود نہ جاگوں مجھے کوئی نہ جگائے۔"

باسی روٹی اور مکھن کھا کر اوپر سے دو تین چھنّے (بڑے کٹورے) لسّی کے پی کر اُس نے ایسی لمبی تانی کہ شام تک کروٹ نہ لی۔

سورج ڈھلنے کو ہوا تو سنداں نے اسے جگانا چاہا۔ لیکن تایاں نے منع کر دیا۔

"سونے دے بے بے۔ جب اُس نے کہہ رکھا ہے کہ اسے کوئی نہ جگائے تو پھر کیوں جگاتی ہو۔"

"ہاؤ ہائے۔" سنداں منہ پھیلا کر بولی "ہم تو بڑے بوڑھوں سے یہی سنتے آئے ہیں کہ شام کے سمے نہیں سونا چاہیئے . . . . ."

"تو بے بے اُٹھ کر جو گالی بکنے لگے گا تو کیا بھائیہ۔"

پالی کافی دیر سو چکا تھا۔ اُس نے بھابی کی یہ ڈانٹ سُن لی۔ لیکن اُس نے نہ تو آنکھیں کھولیں اور نہ کروٹ بدل کر ان کی طرف منہ ہی کیا۔

بے بے جھنجلا کر بولی:

"ہے تو سہی۔ اچھی بات بھی کہو اور جلی کٹی بھی سنو ان کی . . . . ہاں نہیں تو۔"

بھابی کی آواز آئی:

"تم تو یونہی بگڑ جاتی ہو بے بے۔ جلی کٹی کیا سناتی۔ ببی تو کہا نا کہ بچارا بھر جاڑ میں رات بھر سو نہیں سکا۔ اب سونے دو۔ جب جی چاہے جاگے۔ یہاں کون جہاج رکا ہے اس کے جاگے بگیر۔۔۔۔۔۔"

"نہیں منو، تیرا کوئی قصور نہیں۔ جمانہ ہی ایسا ہے۔ کل جگ ہے کل جگ۔ بڑوں اور چھوٹوں میں کوئی تمیج ہی نہیں رہی۔"

"تو تو سٹھیا گئی ہے۔ جب بیٹھے بٹھائے بکھیڑا کرنے کو جی چاہے تو یونہی بکنے لگتی ہے۔"

سنداں گرم ہو کر بولی:

"اے منہ کو لگام دے ری چھو کری ــــ میں نے کوا تو نہیں کھایا کہ بکھیڑا کرنے لگوں۔ بڑی سگھڑ بن بن بیٹھتی ہے۔ بات کرنے کا ڈھنگ تو سیکھ لے"

"بات کرنے کا ڈھنگ تو کوئی تجھ سے سیکھے۔۔۔۔"

اتنے میں لہنا سنگھ بھی آن پہنچا۔ پنجابی ایک کونے میں ٹکا کر بولا:

"ارے بھائی! یہ کیا چیں چیں لگا رکھی ہے۔ کبھی تو چپکی بیٹھ جایا کرو۔۔۔"

سنداں بولی:

"چپکا بیٹھنے بھی دے کوئی"

لہنا سنگھ نے سمجھ لیا کہ ساس بہو میں جھپٹ ہو رہی ہے۔ مسکرا کر کہنے لگا:

"چپکے رہنے میں بھی کوئی جور لگانا پڑتا ہے۔ بیٹھی رہو تو کون منع کرتا ہے۔"

"منع کرتی ہے یہ بہو رانی"

لہنا تھکا ماندہ آیا تھا لیکن اس وقت بڑے خوشگوار موڈ میں تھا۔ اسے ساس بہو کی لڑائی سے کوفت محسوس ہونے کی بجائے لطف محسوس ہونے لگا۔ بیوی کی طرف مخاطب ہو کر بولا:

"کہو ری بہورانی! کیا بات ہے"

"بات کیا ہے بے بے کہتی تھی کہ پالی کو جگا دو۔ میں نے کہہ دیا کہ بچارا رات بھر شاید کھانے میں پڑا ہو گا۔ نیند آئی ہے تو سونے دو۔ جاگ کر اسے کوئی کام تو کرنا ہے نہیں۔۔۔"

"اے میں تو کہتی ہوں کہ سورج ڈوبے سونا نہیں چاہیئے۔ بس اتنی سی بات مُنہ سے نکلنے کی دیر تھی کہ یہ جنگلی بلی کی طرح پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ گئی ۔ ۔ ۔ ۔"

"پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑنے کی کیا جرورت تجھے ۔ میں نے بھی تو دھیرج سے بات کہی تھی تو آپ ہی آپ گرم ہو گئی۔ گسّہ تو رہتا ہے ناک پر ۔ ۔ ۔ ۔"

"بے سُن بے ۔ کوئی ایک بات کہی ہے اس نے ناں جی اس بچاری کا کیا کسُور۔ یہاں تو سارا آوا ہی اُوت گیا ہے ۔ کسے کہئے کسے نہ کہئے "

اب لہنا سنگھ صحن میں بچھی ہوئی چارپائی پر بیٹھ چکا تھا۔ بچوں نے گود میں چڑھ کر اُس کی لمبی داڑھی کے بال آپس میں بانٹ لئے تھے۔ اُس نے اپنے تھکے ہوئے پاؤں کو سہلاتے ہوئے کہا:

"جرا اُٹھ جگو کی ماں مجھے پانی تو پلا دے ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں تو بے بے کیا کہہ رہی تھیں تم"

"میں تو بس ایک ہی بات کہتی ہوں کہ آج کل تو بس چپ ہی بھلی ۔ ۔ ۔ ۔ اب اس سرنوں ہی کو دیکھو ۔ ندیدی ہمارے ہاتھوں میں پلی ۔ بڑی ہوئی ۔ منہ تو دیکھو کیسی بھولی بھالی ۔ جیسے منہ میں دانت ہی نہیں ۔ ۔ ۔ ۔"

لہنا سنگھ نے پانی کا چھنّا ہاتھ میں لے کر کہا:

"ہاں بے بے نہ ملوم کیا بھید ہے کئی اُلٹی سیدھی باتیں سُننے میں آ رہی ہیں"

پاآی کے کان کھڑے ہو گئے۔

سندآں بولی:

"اے ہماری بلا سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُلٹی سیدھی باتیں بھی یُونہی نہیں اُڑا کرتیں۔ کیا مجال بھی ہے کسی کی کہ کسی بھلے گھر کی بہو بیٹی کے بارے میں ایک پیچ بھی کہہ سکے جب دال میں کچھ کالا ہوتا ہے۔ تبھی لوگ باگ باتیں اڑاتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ پر جی واہگورو سے ڈرنا چاہئے۔ بے بہو بیٹا، پانی تو مجھے بھی پلا دے نہ جانے ایسی شروع میں پیاس کا ہے کو لگتی ہے "

لہنا سنگھ نے دل ہی دل میں کہا "لیجئے ابھو رانی پر مہربان بھی ہو گئیں "

بھو رانی نے بھی فرماں برداری سے پانی کا چھنا ساس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

"بے بے کو یہ بھی یاد نہیں رہا کہ آج دوپہر بیسن کی روٹیاں کھائی تھیں۔ پیاس اب
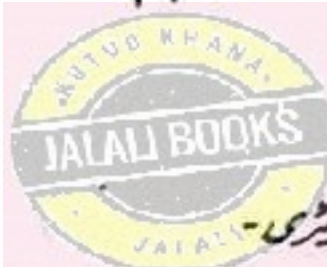
نہ لگے گی تو اور کب لگے گی "

یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگی۔

لبنا سنگھ نے پھر بات چھیڑی۔

"تو بے بے تجھے تو ملوم ہوگا۔ مرد تو جز بہی الول جلول ہوتے ہیں اور تجھے تو سارے گاؤں بھر کی کھبر رہتی ہے "

اس بات پر سنداں خوش ہوئی۔

"ارے ہاں، مجھے کھبر تو رہتی ہی ہے اور پھر سرتوں کی کھبر نہ رہے گی تو کس کی رہے گی۔ پر بیٹا ہمیں کسی سے کہنے کی جرءت بھی کیا ہے "

"ہم کوئی گیر تو نہیں نا۔ گھر کی بات گھر ہی میں رہے گی "

"اے ہے تو تو پیچھے ہی پڑ گیا ہے میرے "

تاباں بولی:

" ہاں بے بے آج کل بڑی کھسر پھسر ہو رہی ہے سرتوں کی بابت۔ یوں تو سرتوں سے بڑی کھلی بات چیت ہے میری۔ لیکن ملوم ہوتا ہے کہ وہ مجھ سے بھی کچھ چھپانے لگی ہے "

" ہاں بے بے بتانا "

لبنا بچوں کی طرح اصرار کرنے لگا۔

اس کی گود میں بیٹھے ہوئے بچے بھی باپ کی نقل اتارنے لگے۔

" ہاں بے بے ہاں "

" چپ رہو بے۔۔۔۔ " باپ نے انھیں کھدیڑ کر باہر بھگا دیا "جاؤ گلی میں کھیلو — ہاں بے بے "

" پالی بھی ہمہ تن گوش تھا۔

سنداں نے سر کھجا کر اس پر دوپٹہ کھینچ لیا۔

"تم تو یونہی پیچھے پڑ گئے۔۔۔۔ آکھر کیا بتاؤں "

لبنے نے آگے کو منھ بڑھا کر پوچھا۔

" اچھا تو یہ بتاؤ کہ جو یہ کھبر مشہور ہو رہی ہے کہ سرتوں کا اس پھٹین سے میل جول ہے

اور پرسوں شام کو ایک آدمی نے ان دونوں کو جوہڑ کے کنارے دیکھا بھی ہے۔ کیوں یہ بات سچ ہے کیا؟"

"ہاں سچ ہے۔"

پالی کے کانوں میں جیسے کسی نے گرم گرم سیسہ انڈیل دیا ہو وہ لیٹا نہ رہ سکا۔ وہ اُٹھ کر بیٹھا تو لینے نے پوچھا:

"درست سری اکال پالی! تمہارے جانے کے بعد تو یہاں بڑے بڑے کارنامے ہوگئے ہیں۔"

پالی نے ماتھے پر بل ڈال کر جواب دیا۔

"دو راتیں تو میں باہر رہا ہوں مجھے دو برس تو نہیں ہوگئے۔"

"واہ واتم بھی بھولے بادشاہ۔ دو دن بہت ہوتے ہیں۔ یہاں پل بھر میں دنیا بدل جاتی ہے۔"

پالی نے ہاتھ سے جوڑا ٹٹولتے ہوئے پوچھا:

"آخر ہو کیا گیا ہے مجھے بھی تو بتاؤ۔"

"ارے بھئی سرتوں ہے نا ــــ وہ اس پٹھیلن سے میل جول کئے ہوئے ہے۔"

"کب سے۔"

"نہ جانے کب سے، پرسوں ہی تو دیکھا ہے انہیں ایک آدمی نے۔"

تو پالی کا شبہ درست نکلا؟ لیکن ممکن ہے یہ بات غلط ہو، محض افواہ ہو، وہ دونوں یونہی کھڑے ہوں۔ . . . ."

"تو کیا وہ روج ملتے ہیں۔"

"ہاں بھائی روج ملتے ہیں۔" لینے نے جواب دیا۔

سندر نے ہاتھ جھٹک کر کہا۔

"ارے واہی تباہی کیوں بکتا ہے۔"

"کیا جھوٹ کہتا ہوں بے بے۔"

"جھوٹ ہو نہ ہو پر تجھے کیا علوم وہ روج ملتے ہیں یا کبھی کبھی ملتے ہیں۔"

"ہاں ٹھیک تو ہے اصل بات تو بے بے کو معلوم ہو گی۔ ہم کیا جانیں بھلا۔" تاباں

نے لقمہ دیا۔

سندل نے محسوس کیا کہ وہ اس سے اصل حال جانے بغیر نہ رہیں گے۔

"اصل بات یہ ہے کہ چٹھی پکڑی گئی ہے ایک۔"

"کس کی چٹھی؟"

"ٹھیک ملوم نہیں ــــ پتہ نہیں پرتھی پال کی ہے یا سرتوں کی۔ ماں کے ہاتھ چٹھی لگی۔ اُس نے پڑھی تو ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ اُس نے اپنے گھر والے کو بتا دیا۔ نرنجن نے لونڈیا کو ایسا مارا کہ سارے بل نکال دئے۔"

"ہائے کیا سرتوں کو مارا . . . . . تبھی تو کہوں۔ کل جوان کے ہاں گئی تو سرتوں کچھ ڈھیلی سی پڑی تھی۔ پوچھا تو کہنے لگی۔ جرا طبیت (طبیعت) کھراب ہے۔"

"موئی چڑیل۔ طبیت کیا کھراب جس روح مار کھائی۔ اُسی روج شام کو یار سے ملنے کو چل دی۔"

"اچھا ہے؟" لبھنے نے حیرت کا اظہار کیا۔ "بڑی بے شرم ہو گئی ہے۔"

"بے شرم تو ہے ہی۔ ماں باپ کی ناک کاٹ کر رکھ دی ڈائن نے۔ میری لڑکی ہو تو اٹھا کر کنوئیں میں پھینک دوں۔"

تاباں نے دونوں ہاتھ گالوں پر رکھ کر کہا:

"اف! ہمارے تو کھواب میں بھی یہ بات نہیں۔ کیسی سیدھی کیسی بھولی . . . . . .

ارے توبہ میری۔ کام یہ کرتی ہے۔ بے بے مجھے تو ایکین (یقین) نہیں آتا۔"

"ایکین آئے نہ آئے۔ مجھے اس کی کھاص سہیلی کی جبانی ملوم ہوئی ہیں سب باتیں۔ اری میرے سامنے تو اس کی ماں بھی مان گئی . . . . پر ہاتھ جوڑنے پر میں نے صپھا (صاف) کہہ دیا کہ بولو جس کے جیسے کرم ہوں گے سو کھد ہی بھگتے گا۔ ہم لگائی بجھائی کیوں کریں . . . . . ہاں بیٹا اور کیا۔"

پالی کا سر چکر کھا رہا تھا۔

لہنا سنگھ کو جھٹکا دے اور بھوک فراموش ہو گئی۔ چونچ آگے بڑھا کر بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"بے بے سب مار کھا کر بھلا وہ اسے ملنے کے لئے کیوں گئی۔ . . . . . ہم نے سنا ہے کہ اس نے اس سے کہا کہ مجھے یہاں سے بھگا کر لے چلو تو پھینین نے کہا بے فکر رہو جو ہم دونوں کے راستے میں کھڑا ہو گا اسے پستول سے مار ڈالوں گا۔"

بابی کے سینہ میں آگ سی لگ گئی۔

"ارے نہیں" سنداں نے رازدارانہ لہجے میں کہا "اصل بات مجھ سے پوچھو۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ مار کھا کر جب شام کو پرتھی پال سے ملی تو اس سے کہا کہ مجھے اپنے ساتھ بھگا کر لے چلو۔ لیکن وہ بھی ایک ہی حرام جادہ ہے۔ بدمعاش تو ہے نا . . . . ."

"ہاں بے بے بدماش تو ہیئی۔ اری بگیچی میں سبھی تو کہتے ہیں کہ بڑا بدماش ہے کئی عورتوں کو کھراب کر چکا ہے . . . . ."

تاباں نے حامی بھری۔

"جب وہ بدماس ہی ٹھہرا تو کل کی چھوکری کو بھلا وہ کیا سمجھتا ہو گا . . . ."

"بس تو اُس نے ٹرخا دیا . . . . ."

تاباں کو سرلوں پر واقعی بڑا غصہ آ رہا تھا۔ وہ اسے بھولی بھالی اور بالکل معصوم لڑکی سمجھتی تھی۔ لیکن اُسے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ اس کے دیور کو چھوڑ کر پرتھی پال سے پریم پینگیں بڑھائے گی۔ جل کر بولی:

"اچھا ہی ہوا بڑی آئی تھی وہاں سے پریم لڑانے . . . . . ."

بابی کے دل پر اس وقت جو گزر رہی تھی۔ اس کا کسی اور کو بھلا علم ہی کیا۔ لہٰذا بولا:

"ہاں تو بے بے پھر"

"دن کو مار کھانے کے بعد بھی جب لاڈو رانی یار کو ملنے کے لئے پہنچی۔ جوہڑ کے کنارے۔ تو وہاں گاؤں کے ماچھی نے دیکھ لیا اور اس نے دو اور آدمیوں کو بھی دکھا دیا۔ بات سارے گاؤں میں پھیل گئی . . . . ."

"ہاں بے بے۔ مردوں میں تو یہ بات مشہور ہو گئی ہے۔ اری ایک دو نے تو ماچھی کو جوتے سے مار کر جھوٹ بولتا ہے۔ بھلا اسے جھوٹ بولنے کی کیا جرورت۔ برجن سنگھ کے رشتے دار اُڑا رہے ہیں کہ ماچھی بھی جھوٹا اور دوسرے دو آدمی بھی جھوٹ بولتے

ہیں۔ کسی کی بہو بیٹی کا معاملہ ہو تو لوگ زیادہ بولتے نہیں کسی کی عزت پر۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

سندل نے چمک کر کہا:

"نرنجن سنگھ کے رشتہ دار جو جی چاہے کہتے پھریں۔ لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ ادھر گاؤں میں بات پھیلی ادھر جنداں نے پتی دیو کو پرتھی پال کے باپ کے پاس بھیجا کہ جو بات ہونی تھی سو ہو چکی۔ آؤ اب ان دونوں کا بیاہ کر دیں۔ ۔ ۔ ۔"

"اچھا؟ بے شرم کہیں کے۔ لڑکی کو زہر کیوں نہ دے دیا۔ جب میں گھر میں تھی تو میرا باپ کہا کرتا تھا۔ چڑیل جو تو نے دروازے سے باہر جھانکا بھی تو آنکھیں نکال لوں گا۔"
تاباں بولی۔

"کل جگ ہے کل جگ۔ یہ تو جنداں کی ترکیب ہوگی۔ نہیں بھلا نرنجن سنگھ تو ایسا آدمی ہے کہ اس لڑکی کا خون پی جائے۔"

لہنا بولا:

"تو یوں کہو اب دونوں پریمیوں کا بیاہ رچایا جائے گا۔"

"نہیں بیٹا لڑکے نے دل لگی میں لڑکی پھسلا لیا۔ کہاں کا پریم کہاں کی شادی اگر وہ بیاہ کرے گا بھی تو کسی کرسٹان سے کرے گا۔"

"اچھا تو پرتھی پال کے باپ نے بیاہ نامنظور کر دیا۔"

"باپ کیا نامنظور کرتا۔ لڑکے نے انکار کر دیا۔ بڑی منت سماجت کی۔ ناک رگڑی۔ لیکن وہ نہ مانے۔"

تاباں کو سرتوں کے باجی پن پر غصہ آ رہا تھا۔ بولی:

"میں تو کہتی ہوں اچھا ہی ہوا۔ چیونٹی کے مرنے کے دن آتے ہیں تو اس کے پر نکلنے لگتے ہیں۔"

لہنے نے ملامت کرتے ہوئے کہا:

"ہمیں کھش ہونے کی کیا جرورت ہے۔ کوئی مرے کوئی جئے ہماری بلا سے۔ کیوں بے بے؟"

"ہاں بچہ۔"

"اب کیا کریں گے وہ لوگ" تاباں نے پوچھا۔

"اب تو سنتے ہیں، نہر پار والے حوالدار سے بات چیت ہو رہی ہے۔"

"ارے وہ حوالدار؟ مگر بے بے اس کی عمر تیس برس سے کم تو کیا ہوگی۔"

"ہاں مجبوری جو ٹھہری ـــ آج صبح جنداں نے آپ ہی آپ یہ بات بتائی تھی۔ میں نے بھی سنا کر کہہ دیا کہ بہن اب کسی پردیسی سے بواہ ہوگا۔"

تاباں بولی:

"ٹھیک تو ہے۔ . . . . چلو جی چھٹی ہوئی۔ جب ہمیں کچھ لینا دینا ہی نہیں تو کیوں بھول میں ان کی باتیں کریں۔"

"ہاں جی ان کی باتیں کریں۔"

"ہاں جی" سنداں نے بزرگانہ لہجے میں کہا: "ہم سے تو نہ صلاح لی۔ نہ کچھ پوچھا۔ ہماری طرف سے چاہے لڑکی کو کنوئیں میں دھکیل دیں۔"

تاباں نے کہا:

اور بے بے ایک دن جنداں بڑے غصے سے کہنے لگی: "ہم تو اپنی لاڈو کی شادی ایسے آدمی سے کریں گے جو نکھٹو نہ ہو بلکہ کچھ کماتا بھی ہو۔ ہم نے اسے چاؤ چونچلوں سے پالا ہے تو شادی کرتے سمے آنکھوں پر پٹی تو نہ باندھے رہیں گے۔"

"بہو بیٹا بڑے بول کا سر نیچا ہوتا ہے۔"

"میں تو سوچتی رہی کہ شاید ہمارے پالی کی طرف اشارہ تھا اس کا۔"

سنداں دل میں تو سرنوں کو بہو بنانے کی خواہاں تھی لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ لوگ یہ رشتہ کرنے کے لئے تیار کیوں نہیں ہیں اور یہ بات اسے بہت بری طرح کھلتی تھی۔ بظاہر تاؤ کھا کر بولی:

"در ہمارا چاند سا لڑکا ہے، ہمیں لڑکیوں کا گھاٹا ہے کیا۔ . . . ."

"نانا ہمیں گھاٹا کاہے کو ہونے لگا۔ میں تو یونہی کہہ رہی ہوں۔ پہلے بھی مجھ سے پوچھتی رہتی تھی، کیوں تاباں، پالی کہتا تھا کہ زمین خرید دوں گا ـــ تو پھر اس نے خریدی نہیں کیا؟ میں کہتی مرجی کا مالک ہے کیا جانے زمین خریدے گا، یا کوئی کاروبار کرے گا۔"

سنداس ماتھے پر بل ڈال کر بولی: "اُکھڑا ہے کیا مجھ ہماری جبین سے۔ وہ اگر میرے پائی کے لئے میرے آگے ناک بھی رگڑے تو بھی میں نہ مانوں۔ بھلا ایسی بدماش لڑکی سے بیاہ کروں گی اپنے پائی کا۔ ہمارے لونڈے کو تو دنیا کی ہوا تک نہیں لگی۔ اور وہ ٹھہری چنڈال۔ بھلا دونوں کا جوڑی کہاں ہے۔"

اس دوران میں پائی دم بخود بیٹھا رہا۔

۱۵
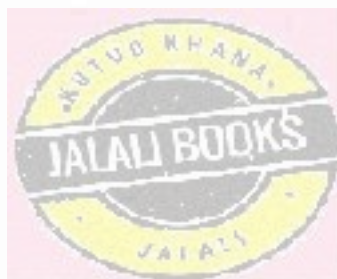
پالا سنگھ کے دیکھتے دیکھتے حالات نے ایسا پلٹا کھایا جس کا اسے خواب و خیال تک نہ تھا۔

سرتوں کے والدین کو حقائق کا اس قدر شدید احساس ہُوا کہ انھوں نے فوراً خاندان کے چند نیک اور معزز بزرگوں کو مشورے کے لئے جمع کیا اور سارے حالات ان کے سامنے کھول کر رکھ دیے۔ اتفاق رائے سے یہ طے پایا کہ جلد از جلد لڑکی شادی کر دی جائے اور اس دوران میں لڑکی کی کڑی نگرانی کی جائے۔

پرتھی پال سنگھ کے باپ نے تو انکار کر دیا تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ شادی کس کے ساتھ کی جائے۔ نرنجن سنگھ اور جنداں کمرے میں بند خفیہ مشورے کرتے۔ اور یہ ایسا معاملہ تھا کہ اور زیادہ تاخیر کی گنجائش ہی نہ رہی تھی۔

نرنجن سنگھ نے دبی زبان سے پالی کا ذکر کیا۔

" اب یہ اپنا لڑکا پالی ہے۔ آخر اس کا کیا کیا جائے کہ اوّل تو خاندان نیکنام نہیں۔ خیر اس کو بھی چھوڑو۔ باپ کے مرنے کے بعد لہنا سنگھ تو بھلے آدمیوں کی طرح زندگی بسر کر رہا ہے۔ باقی رہا پالی۔ سو اس کی بابت بھی کوئی ایسی ویسی بات سننے میں نہیں آئی۔ لیکن ہے نکھٹو۔ اتنے دنوں پردیس میں نہ جانے کیا کرتا رہا ہے۔ پلّے پھوٹی کوڑی نہیں۔ اتنے مہینوں سے یہاں آوارہ گھوم رہا ہے۔ کوئی کاروبار ہی شروع کر دیتا۔ زمین خریدنے کو کہہ رہا تھا۔ وہ بھی نہیں خریدی۔ میں تو سمجھتا ہوں یہ بھی ڈھکوسلہ تھا ۔ ۔ ۔ ۔ اُف کیا مشیت

ہے لڑکیوں کی کس لاڈ اور پیار سے پالا تھا اسے۔ خیال تھا کسی اچھے گھرانے میں شادی کریں گے جہاں آرام سے زندگی بسر کرے گی۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اسے کہیں نہ کہیں دھکیل کر رہی سہی آبرو بچالیں۔ ۔ ۔ ۔ ؟

جنداں بولی:

"جو ہو سو ہو، اب پالی کا نام نہ لو۔ لڑکی پھر گاؤں کی گاؤں ہی میں رہے گی اگر پھر کوئی بات اُٹھی تو کون ذمہ دار ہوگا اور اس کا نتیجہ بھی کیا جانئے کیا نکلے۔ اس مردود کا تو اب کہیں پردیس میں مُنہ کالا کرو۔ تمہارا کیا سب باتیں تو عورتوں کو سہنا پڑتی ہیں۔ خود چلی جائے گی تو جان بھی چھوٹ جائے گی۔ ۔ ۔ ۔ پالی پر مجھے بھی شک ہے۔ نہ کوئی کام کرتا ہے، نہ اس کی جیب میں پیسہ ہے۔ نہ کوئی ہُنر جانتا ہے۔ یہ تو سوچو کہ وہ روپیہ کیسے کمائے گا۔ آپ کہاں سے کھائے گا۔ لڑکی کو کیا کھلائے گا۔ ابھی تو گھر میں بیٹھا کھا رہا ہے۔ لیکن شادی ہو جانے پر تو یہ بات نہ رہے گی۔ پھر تو بڑا بھائی بھی کہے گا کہ بھیّا اپنا کماؤ اور کھاؤ۔ اور زمین بھی تو بہت نہیں ان کے پاس ہے"

اس پر دونوں طرف خاموشی طاری رہی۔ پھر جنداں کو جو خیال آیا تو کہنے لگی:

"وہ جو حوالدار کا ذکر کر رہے تھے تم۔ اس میں کیا حرج ہے تم اسے چٹھی کیوں نہیں لکھ دیتے۔"

"ہاں خوب یاد دلایا۔ لیکن تمہیں معلوم ہے نا کہ وہ دو سال سے رنڈوا بیٹھا ہے۔"

"کوئی بچّہ وچہ ہے پہلی عورت سے؟"

"نہیں — ایک تھا سو مر گیا۔"

"بس تو پھر کیا حرج ہے۔"

"عمر چالیس کے لگ بھگ ہوگی۔ صورت بھی کچھ ایسی ویسی ہی ہے لیکن ایسی بُری بھی نہیں۔"

"کماتا ہے۔"

"ہاں بتایا نا۔ حوالدار ہے سرکاری نوکری بالکل پکّی۔ اور یوں بھی جس سے پوچھو یہی کہتا ہے کہ بڑا نیک، بڑا گورمکھ ہے۔ ہر روز صبح اُٹھ کر پاٹھ کرتا ہے گوردوارے میں متھا ٹیکتا

ہے۔ نوجیوں والی کوئی علت نہیں۔ شراب اور بدمعاش عورتوں سے کوسوں دُور بھاگتا ہے یقین جانو۔ سب لوگ اس کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ میں اسے مل چکا ہوں۔ واقعی لوگ جو اس کی تعریف کرتے ہیں تو جھوٹ نہیں میں نے سنا ہے کہ پہلی بیوی کو وہ پھول کی طرح رکھتا تھا کیا مجال جو ایک مرتبہ تو بھی کہا ہو اسے۔ حالانکہ وہ بڑی لڑاکا تھی۔ دیکھنے والے کہتے ہیں۔ کہ اگر کوئی اور مرد ہوتا تو چوٹی سے پکڑ کر نکال باہر کرتا۔ لیکن وہ کہتا میری عورت جھگڑالو ضرور ہے پر دل کی بُری نہیں۔ نہ اس میں کوئی عیب ہے۔ اس کی صحبت میں تو عورت بھی کافی سدھر گئی تھی۔ دراصل بچارا بچپن ہی میں یتیم ہو گیا تھا۔ بچارے کو گھر بسانے کی بڑی تمنا ہے اُس نے دو ایک مرتبہ اور آدمیوں کی معرفت کہلوایا بھی ہے۔"

"اچھا؟ کب کی بات ہے یہ؟"

"لو اور سنو تمہارے سر میں دماغ یا گوبر بھرا ہے ـــــ میں نے پچھلے سال تم سے اس بات کا ذکر بھی کیا تھا اور تم نے کہا تھا کہ میں اپنی چاندی لڑکی کے لئے بہت ہی خوبصورت اور امیر دولہا لاؤں گی۔ رنڈوے سے لڑکی کی شادی ہرگز ہرگز نہیں کروں گی۔"

"بھئی مجھے تو کچھ یاد نہیں۔ نہ میں پوچھتی ہوں۔ اب اس کی شادی تو نہ ہوئی ہوگی۔"

"کیا جانے!"

"اچھا تو ہے بُرا بھی اور کیا چاہئیے چالیس برس کی عمر بہت زیادہ تو نہیں نا۔ جب پہلی سے بچہ نہیں نہ...... ارے ہاں یاد آگئی بات۔ تم نے ذکر کیا تھا۔ مگر مجھے تو زیادہ اعتراض بچے پر تھا۔ اب کہتے ہو کہ وہ مر گیا......"

"ہاں ہاں اب کوئی حرج نہیں۔ بن بچے کا رنڈوا بھی تو کنوارا ہی سمجھنا چاہیئے"

"ہاں اب اس موقعہ اس سے ہو جائے سنجوگ تو ہماری خوش نصیبی سمجھو۔ دیکھئے کہیں شادی نہ ہو گئی ہو اس کی۔"

"چٹھی لکھ دو نہ کہ اگر شادی نہ ہوئی ہو تو ہمیں وہ فوراً اطلاع دے دے۔"

آپس میں اچھی طرح مشورہ کر لینے کے بعد نرنجن سنگھ نے بکرم سنگھ حوالدار کو چٹھی لکھ دی۔ چار روز بعد جواب آیا تو لفافہ نرنجن سنگھ کے ہاتھ میں کانپنے لگا۔ اُس نے بیوی کو بُلایا اور اندر والے کمرے میں جا کر اسے کھولا اور جلدی جلدی پڑھنا شروع

گیا پھیکے چہرے کی سرخی عود کر آئی۔

"لو مبارک ہو کام بن گیا۔"

جنداں کی چھاتی پر سے بھی مانو پتھر کی سل ہٹ گئی۔ ہنس کر بولی:

"تمہیں بھی مبارک ہو۔ اچھا ہوا۔ اب آٹھ دس روز تک لڑکی کو دفان کرکے چین کی سانس لیں گے۔ میں نے تو پہلے ہی مشہور کر دیا تھا۔ ہم حوالدار سے شادی کر رہے ہیں سرتوں کی۔"

"احمق کہیں کی۔ اگر اس کی شادی پہلے ہی سے کہیں ہو چکی ہوتی تو پھر۔"

جنداں دانت نکال کر بولی:

"میرا دل جو کہتا تھا کہ ہمارا کام بن کر رہے گا۔ میں گھبرا گئی تھی۔ لوگوں کو کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی تھا۔ . . . خیر اب رٹتے سے کیا فائدہ۔ اب تو شادی کی فکر کرو۔"

ان تین چار دنوں کے اندر ایک طرف تو نرنجن سنگھ اور دوسرے بزرگوں نے اصلی واقعات پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی اور دوسری طرف جنداں کی چرب زبانی نے لوگوں کے دل موہ لئے۔ جس ماچھی نے سرتوں اور پرتھی پال کو ساتھ ساتھ دیکھا تھا اُسے بُلا کر نہ صرف دھمکیاں دی گئیں بلکہ اسے اور اس کے ساتھیوں کو کچھ روپے بھی دے کر ان کے منہ بند کر دئے۔ اب ان کا بیان یہ تھا کہ ہم نے اچھی طرح پہچانا نہیں۔ ممکن ہے کوئی اور عورت ہو۔ چونکہ کافی اندھیرا تھا۔ اس لئے غلطی کا امکان بھی تھا۔ ادھر حوالدار بکرم سنگھ کو جھٹ منگنی اور پٹ بیاہ کی پیشکش پر کچھ شک گزرا۔ اُڑتی ہوئی افواہیں بھی پہنچیں۔ لیکن گاؤں کے چند نیک طینت بزرگوں نے بیچ میں پڑ کر سب شکوک رفع دفع کر دئے۔ حوالدار بھی سخت ضرورت مند تھا۔ فطرتاً نیک بھی تھا۔ چنانچہ وہ اللہ پر ایمان لے آیا۔

جنداں کی یہ خاص خوبی تھی کہ ایک مرتبہ جو سر پر مصیبت آن پڑتی تو پھر وہ حالات کا مقابلہ بڑی جرأت اور خندہ پیشانی سے کرتی تھی۔

گھر میں شادی کی چہل پہل پیدا ہو گئی۔ جنداں نے اپنی گفتار، حرکات اور سکنات سے غیر معمولی بات کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ اُس نے ہنسی مذاق سے سب کو خوش رکھا

اور گاؤں میں اگر کسی عورت کے دل میں میل تھا بھی تو جنداں خاندانی پندار کو بالائے طاق رکھ کر ان میں سے ہر ایک کے گھر میں پہنچی۔ بڑی خوشامد اور منت سے انہیں اپنانے کی کوشش کی۔ جب شادی سے آٹھ دس روز پہلے رات کو گانا بجانا شروع ہوا تو جنداں سنداں کے ہاں پہنچی۔ جنداں بہت ذہین تھی۔ اسے معلوم تھا کہ سنداں کے دماغ میں کیا خیالات ہیں۔ اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ کس طرح اس کے دل کو رام کیا جا سکتا ہے۔ جنداں کی پیار بھری باتیں سُن کر سنداں کا دل پسیج گیا۔ وہ سوچنے لگی کہ بچاری دُکھیا ہے۔ سر پر مصیبت پڑی ہے ایسے موقعہ پر بَیر کمانا ٹھیک نہیں۔ رخصت ہونے سے پہلے جنداں نے پالی کے کندھے پر بڑے پیار سے ہاتھ پھیر کر کہا:

"بیٹا پالی! اب تو بہن کی شادی ہیں تجھے ضرور مدد کرنی چاہیئے۔"

اس وقت جنداں کی صورت اس قدر مظلوم اور معصوم بنی ہوئی تھی کہ پالی انکار نہ کر سکا۔ اور پھر اُس نے یہ بھی سوچا کہ بچاری جنداں چاچی کو کیا معلوم کہ میں سرتوں کی محبت میں گرفتار ہوں۔ ڈوبتے کو تنکے کے سہارے والی بات تھی۔ اُس نے یہ بھی سوچا کہ اس بہانے سے ان کے وہاں بلاتکلف جانے آنے کا موقعہ ملتا رہے گا۔ عین ممکن ہے اس دوران میں سرتوں سے بات چیت ہو جائے اور اگر اب بھی وہ اس کی جانب توجہ کرے تو پھر اسے ہمیشہ کے واسطے اپنا لینے کی کوئی صورت بھی نکالی جا سکے گی۔

ادھر اس کے ذہن میں یہ خیالات تھے تو ادھر اس کی ماں بڑے اخلاص سے بولی:

"ہاں بہن کیوں نہیں آئے گا۔ بچپن سے ساتھ ساتھ کھیلے ہیں۔ بھلا اب اس کی شادی میں یہ مدد نہ کرے گا تو اور کون کرے گا۔"

جب راتوں کو بیاہ کے گیت گانے کے لئے بُلاوا آیا تو سنداں اور تاباں جھٹ پٹ چوکے برتن سے فرصت پا کر خراماں خراماں بیاہ والے گھر کو چل دیں۔

پہلی رات کو ہی وہاں بڑی چہل پہل ہو گئی تھی۔ سرتوں کی سہیلیاں رنگ برنگ کی چُندریاں اوڑھے ڈھولک لے کر بیٹھ گئیں۔ ایک لڑکی نے ڈھولک پر بجانے کے لئے ٹھیکرا ہاتھ میں پکڑا تو بڑی بوڑھی عورتیں بولیں:

"ٹھہرو چھوکریو! پہلے سہاگ گیت گانے دو ہمیں۔"

لڑکیاں چلا کر بولیں:

"اچھی بات گاؤ۔ ہم ڈھولک بالکل نہیں بجائیں گی۔"

چنانچہ دو چار بوڑھی عورتوں نے بینڈکیوں کی سی ٹرّاتی ہوئی آواز نکال کر سہاگ گیت شروع کیا:

ہے میرے بابلا دے میرا کاج رچیا

دھرمی راجیا دے

میرا کاج رچیا

رفتہ رفتہ چند خوش گلو عورتوں اور لڑکیوں کی ملی جلی آوازیں بلند ہوئیں تو خاموش فضا گیت کے درد اور کسک سے تھرتھرانے لگی۔ اس طرح سات سہاگ گیت گا چکیں۔ تو اب لڑکیوں کا ہنگامہ شروع ہوا۔ وہ بھی بس اشارے کی منتظر بیٹھی تھیں۔ فوراً ڈھولک دھم دھمائی اور ٹھیکرا بجانے لگیں۔

بڑی بوڑھیوں نے منہ سے ایسے زور کی سانس چھوڑی جیسے انھوں نے بڑا بھاری کام انجام دیا ہو۔ چند بول اٹھیں "بے بہن جنداں، انگیٹھیوں کے اُپلے تو راکھ ہوگئے۔ اب اور ڈالو، اُپلے توڑ کر۔"

جنداں تو بات بات پر ہنستی اور سر تسلیم خم کرتی۔ مجال کیا جو کسی کو شکایت کرنے کا موقعہ دے۔ سبھوں کے دل پر ایسا جادو کر ڈالا تھا اُس نے کہ وہ سرتوں کی بابت افواہوں کو بے بنیاد سمجھنے لگیں۔ وہ خود اٹھ کر اپلے لینے کے لئے پسار سے باہر نکل گئی۔ چند بڑھیوں نے جو دبی زبان میں سرتوں کا تذکرہ کر رہی تھیں۔ اتفاق رائے سے یہ نتیجہ نکالا کہ کیا جنداں اور کیا سرتوں، دونوں بہت ہی نیک ہیں۔ لوگوں پر باہگورو کی مار ہو، نہ معلوم کیوں جلتے ہیں ان کے گھرانے سے۔

اس بات کی بھنک جنداں کے کان میں بھی جا پڑی اس کا دل مارے خوشی کے ناچ اٹھا۔ اُس نے نہ صرف انگیٹھی دہکا دی بلکہ سب عورتوں اور خصوصاً بوڑھیوں کو ٹانگوں پر ڈالنے کے لئے کمبل اور کھیس بھی دیئے۔

لڑکیوں نے ڈھولک اور اس پر ٹھیکری بجا بجا کر چٹکیلے گیت گانے شروع کئے۔

مٹھی جاندی گوری دے منائے نہ آئیدا را

ایک گیت ختم ہوا تو دوسرا شروع کر دیا گیا۔ شریر لڑکیوں نے گیتوں کی آڑ لے کر اپنے دلوں کی بھڑاس بھی نکالی۔ گاتے سمے ان کی چندریاں سروں سے کھسک کھسک جاتیں، دانت نکل نکل پڑتے، چھتیاں دھڑک دھڑک جاتیں۔ محبت اور فرقت، شرارت اور چھیڑ چھاڑ غرض ہر نوع کے گیتوں سے فضا گونجتی رہی۔

رات کے بارہ ایک بجے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ بالآخر جب محفل برخاست ہوئی تو جنداں نے پاؤ بھر کی بجائے ڈیڑھ ڈیڑھ پاؤ گڑ ہر عورت کی جھولی میں ڈال دیا۔ حاضرین پر بہت خوش گوار اثر ہوا۔ نوخیز لڑکیوں میں بعض ایسی بھی تھیں۔ جنھوں نے سرتوں کی بابت کوئی افواہ نہیں سنی تھی۔ انہوں نے جاتے جاتے سرتوں کے بھرپور کولھوں کی چٹکیاں لینے سے بھی احتراز نہیں کیا۔

جوں جوں دن گزرتے گئے توں توں ان کے گھر میں پالی کے ہیرے پھیرے بھی بڑھنے لگے۔ وہ سارے گھر میں بے مہار اونٹ کی طرح گھوما کرتا۔ لیکن لہنا ہر جنداں کو اس پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ ادھر اُدھر کے بھاگ دوڑ والے کاموں میں پالی مدد بھی بہت کرتا اور گھر یا گلی میں جب کبھی جنداں سے مڈبھیڑ ہوتی تو وہ بڑی شفقت کے ساتھ مادرانہ انداز میں مسکرا دیتی۔ یہاں تک کہ پالی کو یقین سا ہونے لگا کہ اگر چاچی جنداں کو اس کے دل کی کیفیت کا علم ہو جائے تو وہ فوراً موجودہ شادی رکوا کر اپنی لڑکی کا اس کے ساتھ بیاہ رچا دے۔

پالی کو اپنی ماں پر بھی غصہ آنے لگا۔ ایک تو اسے ڈھب سے بات کرنی ہی نہیں آتی تھی۔ اگر اسے تھوڑی بہت عقل ہوتی تو سرتوں ان کے ہاتھ سے جنگلی چڑیا کی مانند پھر سے اُڑ نہ جاتی۔ پھر اسے اس بات کا خیال آیا کہ سرتوں کو اس سے محبت ہی نہیں تھی۔ اس نے گٹھ جوڑ بھی کیا تو کس سے نپھٹین پرتھی پال سنگھ سے۔ وہ تو صورت ہی سے شہدا دکھائی دیتا تھا۔ لیکن گاؤں کی ناتجربہ کار لڑکیوں کو اس بات کا علم ہی کہاں ہوتا ہے۔ ظاہرہ ٹیپ ٹاپ پر جان دیتی ہیں اور آخر کار ساری دنیا کی رسوائی اور جگ ہنسائی کا نشانہ بن کر بیٹھ رہتی ہیں گھر پر۔ بھابی کی خوش فہمی بھی حماقت پر مبنی تھی۔ عین اس کی ناک تلے سرتوں غیر سے پریم کا کھیل کھیلتی رہی۔ لیکن وہ یہی سمجھتی رہی کہ پرتھی پال سنگھ بڑا شریف

آدمی ہے اور بچاری سرنوں بہت ہی بھولی بھالی ہے۔ اسے ان باتوں کی ہوا ہی نہیں لگی۔ اب کوئی پوچھے کہ کیا ہوئی وہ شرافت ان دونوں کی! . . . . درحقیقت کیسے چالاک نکلے یہ دونوں۔ سب کی آنکھوں میں دھول ڈال کر محبت کی پینگیں بڑھاتے رہے۔ سرنوں کو تو ناتجربہ کار سمجھ کر معاف کیا جا سکتا ہے لیکن پرتھی پال سنگھ کی حرامزدگی قابلِ نفرین ہے۔ کس قدر پاجی پن کا ثبوت دیا ہے اس پھٹیچن کے بچے نے۔ کان پکڑ کر پوچھے اس حرامزادے سے کہ جب تجھے اس لڑکی سے کوئی محبت ہی نہیں تو پھر بچاری کی آبرو کیوں برباد کرتا ہے ۔۔ اس طرح پالی نے اخلاق اور شرافت کا نام لے کر دل ہی دل میں ہزاروں گالیاں سنائیں پرتھی پال سنگھ کو۔

ان دنوں سرنوں کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ اُس نے کسی سے بھی بات کرنا بالکل بند کر دیا تھا۔ نہ اس کے چہرے سے کسی جذبے کا اظہار ہوتا تھا۔ یہ سب سے زیادہ پریشان کُن چیز تھی۔ وہ ہر شے سے الگ تھلگ ہو بیٹھی تھی میلے کچیلے پھٹے پُرانے کپڑے پہنے وہ اوندھے منہ لیٹی رہتی تھی۔ اس کے بدن کا جوڑ جوڑ دُکھ رہا تھا۔ دل کی گہرائیوں سے اک ہوک سی اُٹھتی تھی لیکن وہ اسے دبا کر رہ جاتی۔ اُس کی ہمجولیاں، رشتے دار، حتّےٰ کہ والدین اس کے لئے بالکل اجنبی بن کر رہ گئے تھے۔ گھر کی گہما گہمی سے بے پروا الگ تھلگ گوشے میں مُنہ چھپائے سرنوں کو جب پالی دیکھتا تو اُس کی کنپٹیاں جلنے لگتیں، آنکھوں میں ریت کے ذرّے محسوس ہونے لگتے۔ حالات کی نئی کروٹ پر وہ دانت پیس کر رہ جاتا۔ آخر یہ بھی کوئی تُک ہے۔ لیکن آخر وہ کر ہی کیا سکتا تھا۔

عجیب سماج تھا یہ . . . . . . عجیب قوانین تھے اس کے۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے اور پھر وہ زیادہ دُور تک سوچ بھی نہیں سکتا تھا عجیب قسم کی مجبوری اور لاچاری نے اسے بے دست و پا بنا دیا تھا۔ اُس نے سرنوں سے بات چیت کرنی چاہی لیکن سب بے سُود۔ کیوں کہ اوّل تو وہ جواب ہی نہیں دیتی تھی اور اگر مجبور ہو کر جواب دیتی بھی تو بہت مختصر۔ ٹال مٹول۔ اس کی بے رخی دیکھ کر پالی کے حوصلے پست ہو گئے تھے۔ وہ سارا دن گھر میں اِدھر سے اُدھر گھومتا رہتا تھا جیسے خواب دیکھ رہا ہو یا کوئی شخص راہ گم کر کے ٹھوکریں کھاتا پھر رہا ہو۔

شادی کے دن قریب آ رہے تھے۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ ہر پل پانی کے بُلبلے کے مانند بنتا اور پھر نابید ہو جاتا تھا۔

بالا سنگھ کو بعض اوقات یہ دیکھ کر تعجب ہوتا تھا کہ ہر شخص، ہر عورت، ہر لڑکی، ہر بچّہ اپنے اپنے کام میں مگن خوش خوش گھوم رہا ہے۔ وہ لمحے جو پالی کے سینے پر چکّی کے پتھر کے مانند اسے روندتے ہوئے گزر رہے تھے۔ وہ ان سب لوگوں پر کچھ بھی اثر نہیں کرتے تھے۔

انسان ایک دوسرے سے کس قدر دُور ہے۔

بڑے بڑے چُولہے کھُد گئے۔ انھیں گوبر اور بھُس ملی مٹّی سے لیپ دیا گیا۔ بڑے بڑے کندے ان میں ٹھونس کر آگ بھڑکا دی گئی اور ان پر بھاری بھر کم کڑاہے چڑھا دیئے گئے۔ حلوائی بڑے بڑے کاوچوں سے کھانڈ کا شیرہ ٹپکانے لگے۔ چوکور مٹھائیاں اور نمکین مٹھریاں تلی جانے لگیں۔ ان کی بُو باس جو ہوا میں اُڑی تو گاؤں کے کالے پیلے کتوں نے بیاہ والے گھر کا رُخ کیا اور اسی کے دروازے پر بڑی بے نیازی سے اُداس سنیاسیوں کی طرح دھونی رما کر ڈیرے لگا دیئے۔

شگن کے روز مرنوں ایک پیڑھی پر بٹھلا دی گئی۔ سُسرال سے آیا ہُوا لال لال ایک پھول دار کپڑا) اس پر اوڑھا دیا گیا۔ سنتو، ہستاں، پیارو، میلو، پرمیو اور اس کی دیگر بے شمار سہیلیوں اور عورتوں نے اسے گھیر لیا۔ سگن یعنی ناریل کھیلیں، کھانڈ کے کھلونے، کشمش، چھوہارے، بتاسے وغیرہ اس کی جھولی میں ڈال دیئے گئے اور پھر سکھیاں مطالبہ کرنے لگیں کہ لاؤ ہمیں دو بتاشے، کشمش۔ مرنوں کو ان رسوم سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ پہلے تو وہ سہیلیوں کی چہلوں سے بے پرواہ اور ان کے تقاضوں سے بے نیاز چُپ چاپ بیٹھی رہی اور اپنی بے کیف آنکھوں سے زمین کی جانب تاکتی رہی اور جب اُنھوں نے بہت زیادہ پریشان کیا تو انتہائی روکھے پن سے اُس نے کشمش، بتاشے جھولی میں سے نکال کر سب میں بانٹ دیئے۔ یہاں تک کہ اس کی جھولی خالی ہو گئی۔

مرنوں کے دل کی کیفیت کو سوا اس کے اور کون سمجھ سکتا تھا۔

جب مرنوں پیڑھی سے اُٹھ کر سر نیوڑائے اندر والے کمرے کی جانب لڑکھڑاتے ہوئے

قدموں سے بڑھی تو رکھی بھی ساتھ ہولی۔ اُس نے سرتوں کا بے حس ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ اس ہاتھ کی نرمی اور لوچ نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔ اب تو وہ ہاتھ سرد تھا۔ محض سرد۔

اندر پہنچ کر سرتوں دھڑام سے پلنگ پر اوندھے مُنہ گر پڑی۔ رکھی سمجھی شاید رونے کو ہے۔ وہ کچھ دیر تک چپ چاپ کھڑی رہی۔ پھر اُس نے اُس کے لمبے اور بوجھل بالوں کو ایک جانب ہٹا کر اور اُس کے چہرے کا رُخ پھیر کر اپنے سامنے کر لیا۔ لیکن رونا دھونا کہاں۔ اُس کی آنکھوں میں نام کو بھی آنسو نہیں تھے بلکہ وہ بے نم اور بے کیف سی نظر آتی تھیں۔

رکھی نے اس کے رخسار پر ہلکے سے ہاتھ پھیر کر کہا،

"سرتوں۔"

سرتوں کچھ نہیں بولی۔ اور پھر اس کے تین چار مرتبہ بُلانے پر بھی جب اس نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ سرتوں کے رُخسار پر رُخسار رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ آخر اس کی چلبلی سہیلی کو یہ کیا ہو گیا تھا۔ بچاری پر یہ کیا مصیبت ٹوٹ پڑی تھی۔ وہ ڈرتی تھی کہ کہیں سرتوں اپنی جان نہ گنوا دے۔ وہ جانتی تھی کہ ایک جانب اُس کی شادی ایسے انسان سے ہو رہی تھی۔ جو در اصل اس کا اہل نہیں تھا اور دوسری طرف اس کے محبوب نے جس کے نام کی وہ مالا جپتی تھی۔ اسے دھوکا دیا تھا۔ ایسے نازک موقعہ پر اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا، یہ دُکھ کوئی معمولی دُکھ نہیں تھا۔ اس اذیت کو تو کچھ اسی کا دل سمجھ سکتا تھا جس کے دل پر گزری ہو۔

شادی کو دو دن باقی رہ گئے تو سرتوں کو مایاں بٹھایا گیا۔ شادی بیاہ کے موقعہ پر سارا گاؤں ہر خبر سے واقف رہتا ہے۔ چنانچہ مایاں والے دن بھی کئی سہیلیاں اور رشتے دار عورتیں آن جمع ہوئیں۔ ہاتھی دانت کا سُرخ چوڑا دودھ کی لسی میں دھویا گیا اور پھر لڑکی کے ماموں نے اسے ایک ایک کر کے چوڑا پہنانا شروع کیا۔ سب لوگ بڑے انہماک سے دلھن کو چوڑا چڑھتے دیکھ رہے تھے۔ حالانکہ ابھی سرتوں کے کپڑے جوں کے توں میلے تھے۔ شاید اس نے مُنہ بھی نہ دھویا ہو، بال تو خیر خشک پڑے تھے۔ کہنیوں تک گوری گوری باہنوں میں سُرخ سُرخ چوڑا چڑھ جانے پر دلھن

کی صورت نکھر آئی تھی۔ کئی عورتوں کے منہ سے بے اختیار تعریفی کلمات نکل گئے۔

"باگورو باگورو جوڑا کیسا پھب کر آیا ہے۔۔۔۔"

یہ باتیں سن کر جنداں پھولی نہیں سماتی تھی۔ وہ بیٹی کے دل سے قطعاً بے خبر نہیں تھی۔ لیکن اس پر کس کا زور تھا۔ یا ئے کسے معلوم تھا کہ یہ شادی ایسی افراتفری میں ہوگی۔ وہ خود ان چیزوں کے لئے کب طیار تھی۔ لیکن حالات نے کچھ ایسا پلٹا کھایا کہ اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار ہی نہیں رہا تھا۔

سرتوں اور پالی کے لئے اذیت دہ لمحے بھونڈے پن سے گزر رہے تھے۔ یہاں تک کہ شادی کا دن آن پہنچا۔ اس روز دھرم شالہ میں بارات کے اُترنے کے انتظامات مکمل کر دئے گئے۔

بیاہ والے گھر میں تقریباً سارا گاؤں جمع تھا۔ اس معاملے میں جنداں کو امید سے بڑھ کر کامیابی ہوئی تھی۔ بچے بچے کی زبان پر بارات کا نام تھا۔ بارات کب آئے گی۔ پھر اندازے لگائے جاتے کہ فلاں وقت تک بارات ضرور پہنچ جائے گی۔ بالآخر دن ڈوبے بارات دھرم شالہ میں پہنچ گئی۔ ان کے ناشتے کے لئے بوندی کے بڑے بڑے لڈو اور گرم گرم دودھ کے دو بھنے وہیں بھیج دئے گئے۔

باراتیوں کی خاطر مدارات کرنے میں پالی بھی شامل تھا۔ اس کی حرکات سکنات میں تیزی و تندی نہیں تھی۔ لیکن وہ اپنا کام کئے جا رہا تھا۔

وہ خاموش تھا۔ اُس کے دل کو یقین نہیں ہوتا تھا کہ یہ شادی ہو جائے گی۔ اُسے یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے آخری وقت پر بھی کوئی ایسی بات پیدا ہو جائے گی۔ کہ یہ شادی رُک جائے گی۔ یہ شادی ہو نہیں سکے گی۔ کس قدر عجیب خیال تھا۔ بھلا یہ کیوں کر ممکن تھا۔ اس کے ذہن میں تو کوئی ترکیب آئی نہیں تھی۔ جہاں تک سرتوں کا تعلق تھا۔ اسے کسی بات سے بھی کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ وہ تو جیسے نہ کچھ سنتی تھی، نہ دیکھتی تھی اور نہ کچھ محسوس ہی کرتی تھی، جیسے وہ اس دُنیا کی مخلوق ہی نہ ہو۔ جیسے وہ محض ایک بے جان پتھر ہو۔

رات کے وقت باراتیوں کو کھانا کھانے کے لئے گھر پر آنا تھا۔ گھر کے طویل و عریض

صحن میں صفیں بچھا دی گئی تھیں۔ سردیوں کا موسم تھا۔ اس لئے یہی طے پایا کہ جس قدر جلد ہو سکے باراتیوں کو کھانا کھلا دیا جائے۔

براتیوں کی آمد بجائے خود ایک ایسا واقعہ ہوتا ہے جسے دیکھنے کے لئے لوگ بے چین ہوتے ہیں۔

بالآخر دھرمشالہ سے بارات چلی۔

جب وہ بیاہ والی گلی میں گھسے تو لوگ اپنے اپنے کچے مکانوں کی چھتوں کی منڈیروں سے انھیں تاکنے لگے۔ جب وہ مکان کے قریب پہنچے تو دیگر آدمیوں کے ساتھ بالی بھی انھیں دیکھنے کے لئے مکان سے باہر آگیا۔

باراتیوں میں لڑکے، جوان اور بوڑھے سبھی شامل تھے۔ گیس کی تیز روشنی میں باجے والوں کے پیتل کے ساز اور وردیاں جگمگا رہی تھیں۔ باراتی دیہاتیوں کے دستور کے مطابق اچھے اچھے کپڑے پہنے رنگین پگڑیاں باندھے تھے۔ وہ لوگ زیادہ میلے کچیلے کپڑوں میں رہنے کے عادی تھے۔ اس لئے نئے کپڑے پہنے وہ کچھ الوکھے سے دکھائی دیتے تھے۔ ان میں سے بیشتر کے ہاتھ میں لمبی کرپان تھمی تھی۔ بعض کے پاس موٹر یا ٹرک کے اسٹیرنگ کی نالی کی بنی ہوئی بغیر لائسنس کی دیسی بندوقیں بھی تھیں۔ بعض نے تہبندوں کے اندر دیسی ساخت کے پستول جن میں بارہ بور کے کارتوس ہی چلاتے تھے ٹھونس رکھے تھے۔ ان کے موٹے چمڑے کے بنے دیسی جوتے واقعی قابلِ دید تھے۔ سفر کی وجہ سے ان میں سے بیشتر کی چھوٹی بڑی داڑھیاں گرد میں اٹی ہوئی تھیں۔

مکان کے قریب پہنچ کر بینڈ والے تو چپ ہو گئے۔ البتہ تھوڑی سی قیں قیں اور ٹیں ٹیں کے بعد ڈھولکی اور چھینے بجنے لگے اور کسی نے بینڈ مک کی سی ٹراتی ہوئی آواز میں گانا شروع کیا:

ہم گھر ساجن آئے ساچے میل ملائے

بالی گانے والوں کے بے تحاشہ کھلے ہوئے منھ کے دہانے دیکھتا رہا۔ کس قدر بڑا پاکھنڈ تھا:

ساچے میل ملائے

انھیں یہ کہتے ہوئے شرم محسوس ہونی چاہئے۔ ادھر لڑکی کا دل رو رہا تھا۔ اس بچاری کے کلیجے پر چھریاں چل رہی تھیں۔ ادھر یہ مردود سانچے میں ملا رہے تھے۔ پاآی کا جی چاہتا تھا کہ لٹھ گھما کر ان سب کے منہ توڑ دے اور انھیں اس گلی سے اُلٹے پاؤں بھگا دے۔

ایک شبد ختم ہوتا تو دوسرا شروع ہو جاتا لیکن پاآی کا دھیان شبدوں کی جانب نہیں تھا وہ تو محض ان کی ہلتی ہوئی داڑھیوں کو دیکھ دیکھ کر ان سے نفرت کر رہا تھا۔

جب بارات کھانا کھانے کے لئے بیٹھی تو دُلھن کے کھانے کی تھالی جس میں در اصل کئی لڑکیوں کے لئے کھانا موجود تھا۔ دُولھا کے پاس بھیج دی گئی۔ اس پر پچیس روپے رکھ کر تھالی واپس لوٹا دی گئی۔ دُلھن نے وہ کھانا اپنی سکھیوں میں تقسیم کر دیا سب کے اصرار پر کچھ کھانا خود بھی زہر مار کیا۔

ادھر جب کہ باراتی کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ لڑکیوں نے گیت گانے شروع کر دئے۔ اُدھر چند سہیلیوں نے سرتوں کو گھیر لیا۔ مہندی گھول دی گئی، اور سکھیوں نے زبردستی اس کے ہاتھوں اور پاؤں پر مہندی رچانی چاہی تو معمولی احتجاج کے بعد سرتوں ماتھے پر بازو رکھ کر چارپائی پر لیٹ گئی۔ اُنھوں نے اس کے ہاتھوں کی ہتھیلیوں انگلیوں کے آگے پیچھے مہندی تھوپ دی اور پھر اس کے پاؤں کے تلووں اور ان کی انگلیوں پر بھی گاڑھی گاڑھی مہندی رچا دی۔

رات گھسٹتی رہی۔

دوسرے دن علی الصبح کھارے بٹھانے کی رسم ادا کی گئی۔ دلھن کو نہانے کی چوکی پر بٹھا کر سہیلیوں اور رشتے دار عورتوں نے اس کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ مٹی کے بڑے برتن میں باری باری دہی لے کر دُلھن کے سر میں ڈالتی گئیں۔ اس کام میں ہر ایک نے حصّہ لیا۔ یہ کام ہو چکا تو دلھن کو نہلایا گیا۔ اس کے پاؤں کی میل جھانوے سے رگڑ رگڑ کر صاف کی گئی۔ یہاں تک کہ وہ مکھن کے پیڑے کے مانند نکل آئی۔

جب نہا چکی تو اُس وقت تک اس چوکی سے نہیں اتر سکتی تھی جب تک کہ اُس کا ماموں اس کے ہاتھ میں کچھ رکھنے نہ پائے یا اسے گائے بھینس دان میں نہ دے۔

یہاں پر خوب بے دے ہوئی۔ بالآخر یہ مرحلہ بھی طے ہوا اور دُلہن کھارے سے اُتر آئی
نہلانے کے بعد دُلہن کو کپڑے پہنائے گئے۔ کپڑوں سے دُلھن کا حُسن اور نکھر آیا
اور پھر جھلمل کرتے زیورات نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ دُلہن کے حُسن میں چار چاند
لگ گئے۔ سر پر سونے کا چونک۔ کنپٹیوں پر تو تیڑیاں۔ ماتھے پر ٹیکا۔ ناک میں نتھ گلے
میں سونے کا ہار۔ کلائیوں پر گوکھڑو۔ کانوں میں بندے۔ بغرض ہر قسم کے زیورات سے
لدپھند کر جب دُلہن طیار ہوگئی تو اس پر نگاہ نہیں ٹکتی تھی۔

پالی نے سرتوں کو اب دیکھا تو جمالِ یار کی تاب نہیں لا سکا۔

اس کے بعد دُلہن کو کپڑوں میں لپیٹ کر گڑیا سی بنا کر گورو گرنتھ صاحب کے روبرو
لے گئے۔ جہاں دُولہا و دیگر لوگ پہلے سے جمع تھے۔

اب پھر شبد و کیرتن کا دور چلا۔ بالآخر دلہن کا دامن دُولہا کے دامن سے باندھ دیا
گیا اور اب لڑکی کے رشتے دار گرنتھ صاحب کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے۔ آگے آگے
دُولہا اور پیچھے پیچھے دُلھن گورو گرنتھ صاحب کے چکر کاٹنے لگے۔ گٹھڑی بنی ہوئی دُلہن کو
حلقے میں کھڑے ہوئے آدمی باری باری سہارا دیتے تھے۔ اس حلقے میں خود پالی بھی کھڑا
تھا۔ جب اس نے سرتوں کے شانوں کو تھام کر اسے اگلے آدمی تک سہارا دیا تو سوچا کہ شاید
سرتوں کو اس بات کا احساس ہو کر یہ ہاتھ میرے ہیں۔ آج وہ سرتوں کو اپنے ہاتھوں سے
ایک غیر مرد کے سپرد کر رہا تھا۔

ساری رسوم پوری ہو چکیں تو دلہن کے دُولہا کو بھی اس کے سسرال والوں کے
وہاں لے جایا گیا۔ وہ شخص میانہ قد، اکہرے بدن اور بالکل سیدھی سادی صورت
کا مالک تھا۔ لیکن وہ بھلا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ ایک گھریلو قسم کا اپنی ذمہ داریاں سمجھنے
اور پھر انھیں پورے طور سے نبھانے والا انسان۔

یہ ساری رسوم اور واقعات جو پالا سنگھ کی نظروں سے گزرے تو وہ نڈھال سا ہو گیا۔
اس کا بدن جلنے اور ٹوٹنے لگا۔ وہ بیاہ والے گھر سے جان چھڑا کر اپنے گھر کو چلا آیا۔

دُولہا کے ساتھ گاؤں کی لڑکیوں نے خوب ہنسی مذاق کیا۔ وہ سارا دن ہنستے کھیلتے
گذر گیا۔ شام کو رخصتی کے وقت بھائیوں نے بہن کو ڈولی میں بٹھا دیا۔

سب رشتے داروں نے دُلھن کے سر پہ ہاتھ پھیر کر نہ صرف اشیر باد دی بلکہ کچھ نہ کچھ نقد روپیہ بھی اس کی مٹھی میں تھما دیا۔

ڈولی کے اُٹھتے وقت عجب دردناک سماں بندھا تھا۔ سرتوں اپنی سہیلیوں کو بے حد محبوب تھی۔ ہر سہیلی اُس کے گلے سے لپٹ لپٹ کر رو تی تھی خصوصاً رگھی کو سرتوں نے اس قدر بھینچ کر گلے سے لگایا کہ علیحدہ ہونے میں نہ آتی تھی۔ بہرکیف یہ گھڑی بھی گزر گئی۔

دُلھن پرائے دیس کو روانہ ہو گئی۔

اس گہما گہمی میں پالا سنگھ کی سارے دن کی غیر حاضری کو کسی نے محسوس تک نہیں کیا۔

ڈولی کے چلے جانے کے بعد جنداں سب سے آنکھ بچا کر گھر کے اندر آئی۔ سنسان... ... سنسان۔ جہاں پہلے اس کی چہیتی بیٹی کے حُسن کی شمع روشن رہتی تھی۔ اب وہاں چراغ ٹمٹما رہا تھا۔

جنداں مٹیالے رنگ کی دیواروں کو دیکھ کر بے اختیار پھوٹ پڑی۔ وہ بچوں کے مانند دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ لیکن شکر ہے اس کی آواز باہر تک نہیں پہنچی۔

براتیوں کو پکی سڑک تک پہنچنا تھا۔ وہاں سے لاری میں بیٹھ کر شہر اور شہر سے ریل گاڑی میں بیٹھ کر دولہا کے دیس کو جانا تھا۔

بارات ڈنگا گاؤں سے ایک میل دُور نکل آئی۔ رنگین کپڑوں والے آدمی لپکے ہوئے چلے جا رہے تھے۔

دفعتاً اُن سے کچھ فاصلے پر ویرانے میں ایک صورت نمودار ہوئی — وہ پالا سنگھ تھا۔ وہ اس پگڈنڈی کی جانب دیکھ رہا تھا۔ جدھر سے وہ دل میں اُمنگوں کی دُنیا آباد کئے اپنے گاؤں کو آیا تھا۔ اب اسی راہ سے اُس کی امیدوں کا جنازہ اپنی منزل کی جانب تیزی سے بڑھتا جا رہا تھا۔ ڈولی اُٹھائے ہوئے کہاروں کی کالی، پتلی لیکن مضبوط ٹانگیں بڑی پھرتی سے اُٹھ رہی تھیں۔

لمحہ بہ لمحہ ڈولی اس کی نظروں میں دُھندلی ہوتی جا رہی تھی۔

اِدھر وہ بھوکے بھیڑیئے کے مانند تنہا کھڑا تھا اور دوسری جانب پُورا زرد چاند [illegible] کی اوٹ سے طلوع ہو رہا تھا۔

۱۶

چاند جوبن پر تھا۔

خاصی سردی پڑنے لگی تھی۔ اس لئے لوگ باگ جلد ہی کھانے پینے سے نپٹ کر بستروں میں جا دبکتے تھے۔ البتہ بعض مرد جنھیں راتوں کو بھی کھیتوں میں کام کرنا ہوتا موٹے موٹے کھیس لپیٹے مینڈوں پر چلتے پھرتے دکھائی دیتے تھے۔

اس چاندنی رات میں پرتھی پال سنگھ شہر سے واپس آ رہا تھا۔ لاری سے اتر کر وہ نہر کے کنارے کنارے چل دیا۔ اگر وہ کھیتوں میں سے ہو کر جاتا تو راستہ کم ہو جاتا۔ لیکن وہ ان پگڈنڈیوں کے پیچ و خم سے زیادہ واقف نہیں تھا اس لئے اس نے طویل لیکن سیدھے اور صاف ستھرے راستے کو ترجیح دی۔

کچھ دُور تک نہر کے کنارے کنارے چلنے کے بعد وہ اس چوڑے راستے کے قریب پہنچ گیا۔ جسے لوگ 'پیاہ' کہتے تھے۔ اس کے دونوں کنارے اٹھے ہوئے تھے اور بیچ میں ریت اور گرد کی بھرمار تھی۔ جہاں سے ہو کر جب چھکڑے گزرتے تھے تو بیلوں کا کھُر نکل جاتا تھا۔ پیدل اور گھوڑ سوار اس کے کنارے کنارے چلا کرتے تھے۔

پرتھی پال سنگھ نے رُک کر ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ چاندنی رات میں دُور دُور تک کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ بھوسے کی دھڑیں دُور دُور تک دکھائی دے رہی تھیں۔ کہیں کہیں کھیتوں میں کام کرتا ہوا کوئی آدمی یا کوئی سانڈنی سوار سائے کے مانند دکھائی دے جاتا تھا۔ ہر چہار جانب خاموشی کا راج تھا۔ چاندنی راتوں کے کیا کہنے۔ بہت دُور سے الغوزوں کی رَتی

ہوئی صدائیں سنائی دے جاتی تھیں۔ سب سے نمایاں منظر اس چوڑے راستے کا تھا۔ جس کے دونوں کناروں پر ایک دوسرے کے متوازی ببول اور شرینہ کے اُونچے اُونچے درخت میلوں دُور تک چلے گئے تھے۔ ذرا پرے ہٹ کر دیکھنے والوں کو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی طویل کنکھجورا کھیتوں کا سینہ چیرتا ہُوا اُفق کی دُھندلاہٹ میں گم ہو گیا ہو۔

پرتھی پال سنگھ گورے چٹے رنگ کا اکہرے بدن کا نازک سا انسان تھا۔ وہ بلند و بالا ہی سہی۔ اس کی صحت بھی بہت عمدہ سہی لیکن اس کے بدن میں وہ توت اور کس بل نہیں تھا جس کی توقع کسی دیہاتی نوجوان سے کی جا سکتی ہے۔

طویل پیاہ، چند لمحوں کے لئے اس کی نگاہ کے سامنے رہا اور پھر اُس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ دس بجے تھے۔ وقت کچھ زیادہ نہیں ہُوا تھا۔ لیکن یُوں معلوم ہوتا تھا جیسے آدھی رات کا سماں ہو۔ بہرحال اب تو اسے گھر پہنچنے کی فکر تھی۔ چُنانچہ وہ جلد جلد قدم اُٹھاتا ہُوا چل کھڑا ہُوا۔

بلند و بالا پھیلی پھیلی شاخوں والے درختوں کے نیچے تقریباً مکمل تاریکی طاری تھی۔ کہیں کہیں زمین پر بکریوں کی مینگنوں کے قریب روشنی کے سفید دھبے دکھائی دیتے تھے۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا سفر طے کرتا گیا۔

چلتے چلتے پرتھی پال سنگھ فوراً رُک گیا۔ حالانکہ وہ اپنے خیالات میں ڈوبا ہُوا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں ــــــ وہ رُک گیا۔ چند لمحوں تک رُکا رہا۔ اور پھر خود بخود ہی ہنس کر چل دیا۔ لیکن ابھی آٹھ دس قدم ہی چلا ہوگا کہ پھر دفعتاً ٹھٹک کر رہ گیا۔ اُس نے گھوم کر پیچھے کی جانب دیکھا۔ لیکن درختوں تلے گہری تاریکی تھی۔ اور کہیں کہیں جہاں پتوں میں سے چھن کر آنے والی چاندنی کے چھوٹے موٹے دھبے دکھائی دیتے تھے۔ آنکھوں کو اور بھی بھیانک معلوم ہوتے تھے۔

کچھ دیر تامل کرنے کے بعد اُس نے پھر قدم بڑھایا۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی شخص اس کا پیچھا کر رہا ہو۔ اس کے اپنے پاؤں کے علاوہ ان دیکھے پاؤں کی چاپ بھی سُنائی دے جاتی تھی۔ شاید یہ اُس کا وہم ہو۔ لیکن اسے وہ اس قدر واضح طور سے سنائی دی تھی۔ . . . . لیکن پھر بھی . . . . پھر بھی . . . . ممکن ہے اور ہاں ـــ

وہ پھر رُک گیا۔ کس قدر واضح آواز تھی۔ لیکن کس کے پاؤں کی آواز ہو سکتی ہے۔ کیا وہاں بھوت پریتوں کا ڈیرہ ہے اور شاید جس وقت سے وہ اس راستے پر چلا ہے۔ اسی وقت سے یہ انجانے قدم بھی اس کے ساتھ چل دیئے ہیں۔ اور شاید اُس نے اپنی دُھن میں اس آواز کی جانب دھیان ہی نہیں دیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس خیال کے آتے ہی اس کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور جسم میں سے جان سی نکل گئی۔ ۔ ۔ ۔ لیکن نہیں ایسا نہیں ہو سکتا وہ پڑھا لکھا انسان تھا۔ وہ اس قسم کے توہمات میں یقین ہی نہیں رکھتا تھا۔ یہ قطعی مضحکہ خیز بات تھی۔

وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ آخر کون ہو سکتا ہے۔ چور؟ لیٹرے؟ — لیکن اس وقت اس کی جیب میں تھا ہی کیا۔ وہ تو یُونہیں گھومنے گیا تھا شہر میں۔ دو ایک چھوٹے موٹے کام بھی کرنے تھے۔ آخر وہ بنک سے روپیہ نکلوانے تو گیا نہیں تھا۔ اور اگر بالفرض چور ہی اس کا پیچھا کر رہے ہوں تو پھر انہیں قدم ناپ ناپ کر اس کے پیچھے پیچھے چلنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ وہ حملہ کر کے اس سے جو کچھ چاہیں چھین سکتے ہیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آئی یہ بات۔ اب وہ اتنی دیر سے کھڑا تھا لیکن پتہ تک نہیں کھڑکا تھا۔ آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ ۔ ۔ ہو سکتا ہے۔ اس کے کان ہی بج رہے ہوں۔ کتنی دیر سے خاموشی طاری تھی۔ ۔ ۔ ۔

ایک مرتبہ پھر وہ چل دیا۔ لیکن پھر وہی بات! لیکن وہ رُکا نہیں۔ ۔ ۔ پھر اجنبی آواز ۔ ۔ ۔ اب پھر اجنبی آواز۔ ۔ ۔ ۔ ۔ معاً وہ پھر رُک گیا اور اُس نے گھوم کر دیکھا۔ ایک لمبا تڑنگا سایہ لمحہ بھر کے لئے جھلملاتا سا دکھائی دیا۔ یقیناً یہ اُس کا وہم نہیں تھا۔ وہ کوئی لڑکی یا وہی بڈھا نہیں تھا۔ یہ تو اُس کی آنکھوں دیکھی بات تھی۔ ہو نہ ہو۔ اس میں ضرور کوئی بھید ہے۔ یہ چور یا لٹیرا نہیں ہے مگر اس معاملے کو اس قدر طول دینے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اور وہ بھوت بھی نہیں تھا۔ اس میں ضرور کوئی بھید ہے۔

تاریکی میں سائے دکھائی دینا بھی کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ وہ عجب ذہنی کشمکش میں گرفتار ہو گیا۔ کئی قسم کے شکوک دل میں پیدا ہوئے۔ اُس نے اس سوال کے ہر پہلو پر غور کیا۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا شاید وہ سایہ

دوبارہ دکھائی دے جائے۔ نہیں اب کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا لیکن کیسا عجیب قسم کا احساس تھا۔ ایک اجنبی جان دار چند قدم کے فاصلے پر کھڑا سانس لے رہا تھا۔ شاید اس کے نتھنے پھولے ہوئے تھے۔ شاید وہ چھپی نظروں سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ شاید اُس کی لمبی لاٹھی کے سرے پر تیز چھوی چمک رہی تھی۔ جس کے ایک ہی بھرپور وار سے انسان کی آنتیں اُبل کر باہر آن گریں۔۔۔۔

شاید۔۔۔۔ یہ آوازیں یہ سایہ۔۔۔۔ سب کچھ محض اس کے زرخیز دماغ کی پیداوار ہیں۔ حقیقت کچھ بھی نہ ہو۔ اس نے ایک مرتبہ پھر اپنے دل کو یقین دلایا کہ فی الحقیقت اس کے وہم کے سوا کوئی شے نہیں ہے۔

اس طرح دل کی تشفی کرنے کے بعد وہ آہٹ لیتا ہوا قدم بقدم آگے بڑھنے لگا۔ ذرا کان دھر کر سنا تو بہت قریب سے پیچھے کی جانب اجنبی کے پاؤں کی پُراسرار چاپ سنائی دینے لگی۔ اُس نے گھوم کر دیکھنے کی بجائے آواز اور بھی زیادہ توجہ سے سننے کی کوشش کی اور اب آواز اُسے اس قدر صاف طور پر سنائی دینے لگی جیسے اُس کا پیچھا کرنے والے کو بھی اس کی پرواہ نہیں تھی۔ کچھ دیر بعد وہ آواز اور بھی قریب سے سنائی دینے لگی رفتہ رفتہ آواز اور اُس کے درمیان فاصلہ کم ہونے لگا۔ اس کا دل زور زور سے دھک دھک کرنے لگا وہ حیران تھا کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے۔ ایسا کون شخص ہو سکتا ہے جو اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ یا واقعی کوئی بھوت ہے جو اسے پریشان کرنے پر تُلا ہُوا ہے۔ کس قدر عجیب بات تھی!۔۔۔۔۔ اُس نے رفتار اور بھی تیز کر دی پیچھے سے پاؤں کی چاپ کی آواز میں بھی تیزی پیدا ہو گئی۔ اب گھوم کر دیکھنا فضول تھا۔ اب شک و شبہ کا امکان ہی باقی نہیں رہا تھا۔ اس کا پیچھا کرنے والا بہت قریب پہنچ گیا۔۔۔ اُس نے لپک کر بڑی تیزی سے آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ راستے کے نشیب و فراز سے ہوتا ہُوا تیزی اور تُندی کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ پتے اس کے پاؤں تلے کچلے جا رہے تھے اور ان کی آواز اجنبی کے قدموں کی آواز میں گھل مل کر عجیب قسم کے اذیت دہ شور میں تبدیل ہو چکی تھی۔ پرتھی پال سنگھ کا دم پھول رہا تھا۔ تاریکی میں اُچکتا اور بھاگتا ہُوا اس طرح آگے بڑھ رہا تھا جیسے کوئی جن اس کی گردن ناپنے کو چلا آ رہا ہو۔ ہر آن اُسے یہی وہم ہوتا تھا

کہ پُراسرار اجنبی نے بس اس کا ٹینٹوا دبایا کہ دبایا۔

معاً اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ کیوں نہ پیادہ چھوڑ کر کھیتوں میں سے ہو لے۔ اب تو گاؤں سامنے دکھائی دے رہا تھا۔ اس کو یاد آیا کہ کھال (چھوٹی اور تنگ نہر) کا پل بھی قریب ہی تھا۔ یہاں تک تو وہ صبح کے وقت سیر کرنے چلے آیا کرتے ہیں۔

معاً وہ اونچے کنارے سے چوڑے راستے کی جانب کود پڑا۔ پیچھے سے بھی کودنے کی آواز آئی۔ لیکن اس نے پیچھے کی جانب گھوم کر نہیں دیکھا، پھر جب وہ پھلانگ کر دوسرے کنارے پر چڑھا تو پیچھے سے بھی اسی قسم کی آواز سنائی دی۔ سامنے کھال کا چھوٹا سا پل دکھائی دینے لگا۔ وہ پوری قوت سے اس کی جانب دوڑ پڑا۔ اس قدر تیز کہ ہوا کو بھی پیچھے چھوڑ کر پل کے نیچے پانی کے قل قل کرنے کی صدا سن کر اس کے دل کو گونہ تسکین حاصل ہوئی اس نے زور زور سے سانس لیتے ہوئے اچٹتی ہوئی نظر سے پیچھے کی جانب دیکھا۔ لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ سچ مچ کوئی نہیں تھا۔ . . . لیکن اب وہ اپنے دل کو یہ فریب بھی نہیں دے سکتا تھا کہ یہ سب کچھ اس کا وہم تھا بلکہ یہ حقیقت تھی۔ کہ اس کا بڑی تیزی اور تندی سے تعاقب کیا گیا تھا۔ لیکن وہ بال بال بچ گیا تھا۔ پیچھا کرنے والا کون شخص تھا۔ اس کا پیچھا کرنے سے اس کی کیا غرض تھی۔ کیا وہ اسے جان سے مار دینا چاہتا تھا یا اس وہم میں تھا کہ اس کی بغل میں نوٹوں کا پلندہ دبا ہوا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اب طویل درختوں کے سایوں کی تاریکی نہیں تھی۔ بلکہ کھلی فضا اور دور دور تک پھیلے ہوئے کھیت اور ان میں ساکن کھڑے ہوئے پودے تاحدِ نگاہ دکھائی دے رہے تھے۔ اب خوف کی بھی کوئی بات نہیں تھی۔ بدنام علاقہ تو تھا ہی۔ لیکن ہے کسی نے شرارت کرنے کے خیال سے اس کا پیچھا کیا ہو۔ لیکن اس پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہو سکی ہو۔

بہر کیف اب خواہ مخواہ دیر کرنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ سولوس کا ٹائم ہو چکا تھا۔ گاؤں کے مٹیالے مکانوں کے خطوط نمایاں طور سے دکھائی دینے لگے تھے۔ اس نے ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ اس پُراسرار واقعہ کا اس کے ذہن پر گہرا اثر ہوا تھا لیکن کھلی چاندنی میں فکر کی کوئی بات نہیں تھی۔

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہُوا گاؤں کی جانب بڑھنے لگا۔

کبھی پگڈنڈیوں اور کبھی کھیتوں کے بیچ سے ہوتا ہُوا وہ تیزی سے چلا جا رہا تھا۔ آگے ایک سُوکھا جوہڑ تھا۔ جہاں برسات کے دنوں میں پانی جمع ہوجایا کرتا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ پانی گدلا ہوتا رہتا اور ہوا میں تحلیل ہوتا رہتا یہاں تک کہ سارا پانی خشک ہوجاتا اور اب ایک طویل و عریض گڑھے کے سوا اور کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ بعض گوشے گاؤں کی عورتوں نے کھود ڈالے تھے وہ لوہے کے تسلوں میں مٹی بھر بھر کر گھروں کو لے جاتیں۔ وہاں اس میں گوبر اور بھُس ملا کر صحن کے فرش اور دیواروں کی لپائی کیا کرتیں۔ جہاں سے کھدائی نہیں ہوئی تھی۔ وہاں زمین پر مویشیوں کے کھُروں کے گہرے گہرے نشان پڑ گئے تھے۔ جلد پہنچنے کے خیال سے پرتھی پال سنگھ جوہڑ میں سے چل نکلا۔ ناہموار زمین پر چند قدم ہی چلا ہوگا کہ اس کی نظر اُٹھی اور اُس نے دیکھا کہ جوہڑ کے کنارے پر۔ ۔ ۔ ۔

وہاں کوئی اجنبی کھڑا تھا۔

دفعتاً پرتھی پال سنگھ کے قدم رُک گئے۔ اور چند لمحوں کے لئے وہ بالکل خالی الذہن ہو کر رہ گیا۔

گھٹنوں سے کچھ اُوپر تک پہنچتا ہُوا گرتا پہنے، تہبند لپیٹے اور سر پر پٹکا لہرائے ہوئے ایک لمبا تڑنگا مضبوط مرد کھڑا تھا۔ وہ بالکل جامد و ساکن تھا۔ ہوا تک بند تھی۔ اس کے لباس کا گوشہ تک نہیں ہل رہا تھا۔ لیکن اس کی آنکھیں شکرے کی آنکھوں کے مانند دہک رہی تھیں پرتھی پال سنگھ کو نہ جانے کیوں یقین سا ہونے لگا کہ اس کا پیچھا کرنے والا وہی شخص تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔ وہ بزدل نہیں تھا۔ لیکن اس پُراسرار واقعہ کے باعث اس کے ہوش قائم نہیں رہے تھے۔

اس وقت پرتھی پال سنگھ نے پہلے تو یہ سوچا کہ پہلو بچا کر چپکے سے نکل جاؤں لیکن پھر اُسے یوں محسوس ہُوا جیسے اجنبی کہہ رہا ہو میاں! اتنی دیر سے تمہارا پیچھا کر رہا ہوں۔ اب آنکھ بچا کر کہاں کو چلے۔

وہ آہستہ آہستہ اجنبی کی جانب بڑھا۔ کھُلے میدان اور چاندنی رات میں وہ اتنی جراُت کر سکتا تھا۔ حالانکہ اجنبی کا رویہ بہت مشکوک اور عجیب تھا۔ اسے تعجب ہو رہا تھا کہ آخر اس پُراسرار خاموشی میں کیا راز ہے۔ باوجود اس کے آگے بڑھنے کے اجنبی کی خاموشی

اور بھی تعجب خیز تھی۔ معاً اسے یوں محسوس ہوا جیسے اُس نے اُسے کہیں دیکھا ہو۔ کہاں؟

یہ نئی اُلجھن پیدا ہو گئی تھی۔ اس کی پیشانی پر پسینے کی ہلکی ہلکی بوندیں پھوٹ پڑیں

اُس نے اپنی خشک باچھوں پر زبان پھیرتے ہوئے ہکلا کر کہا "میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے"

اجنبی چُپ رہا۔

پرتھی پال سنگھ جوہڑ کے کنارے پر چڑھ گیا۔ وہ حیرت سے اجنبی کے منہ کو تک رہا تھا۔ آخر وہ جواب کیوں نہیں دیتا۔ اور جب وہ اس سے سات آٹھ قدم کے فاصلے پر تھا تو اجنبی نے حرکت کی۔ اس کے دانت چمکے اور "چخ" کی آواز کے ساتھ تھوک کی پچکاری چھوٹی اور اس کے قدموں میں آن گری ــــ اور اس کے بعد پھر خاموشی۔

قدرے تامل کے بعد پرتھی پال سنگھ اور آگے بڑھا کہ شاید وہ اس کی صورت پہچان سکے۔ دو قدم دور سے رُک گیا۔ ہاں وہ اس کی صورت سے واقف تھا۔ لیکن وہ اسے اب بھی نہیں پہچان سکا۔

"میں پالا سنگھ ہوں۔"

پرتھی پال سنگھ کو بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ ابھی تک اسے یہ بات یاد نہیں آئی کہ اُس نے اُسے کہاں دیکھا ہے لیکن نام ــــ پالا سنگھ تو اس نے سُن رکھا تھا۔ وہ اس نام کے شخص کے اوصاف سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ شخص اچھے کیریکٹر کا آدمی نہیں ہے۔ لڑاکا اور بدمعاش ہے۔ لیکن وہ اُس کا پیچھا کیوں کر رہا تھا۔ آخر اسے اس کا کیا حق ہے۔ لیکن شاید اس کا پیچھا کرنے والا کوئی اور ہو۔ کیوں نہ وہ اس سے دریافت ہی کرے۔

"کیا تم ہی میرا پیچھا کر رہے تھے؟"

"ہاں۔" برملا جواب ملا۔

پرتھی پال سنگھ کو کچھ غصہ بھی آیا اور کچھ تعجب بھی ہوا۔ اُس نے پیشانی پر بل ڈال کر پوچھا "کیوں؟"

اس پر پالا سنگھ کا بھاری بھرکم ہاتھ ہوا میں اٹھا اور اُٹھا ہاتھ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ پلٹا اور پھر جب پرتھی لڑکھڑا کر گرا تو اسے احساس ہوا کہ اُس کی گردن اور رخسار کی رگیں جل اُٹھی ہیں اور ایک کان میں بھائیں بھائیں کی آوازیں آ رہی ہیں ایک مرتبہ ساری

دُنیا اُس کی آنکھوں تلے سے چکر کھا گئی۔ اس کی کس کر بندھی بندھائی پگڑی بل کھاتی ہوئی پرے جا گری

پرتھی پال سنگھ کو بے حد طیش آیا۔ آنکھیں اُبل پڑیں۔ آنکھ جھپکتے میں زمین پر سے اُٹھا اور چیتے کی سی تیزی کے ساتھ حملہ آور کی جانب بڑھا اور بڑی تندی سے جھپٹ پڑا۔

ان معاملات میں بالا سنگھ کا ہاتھ بہت صاف تھا۔ اُس نے اندھا دُھند آگے بڑھتے ہوئے دُشمن کے پیٹ میں گھونسا رسید کیا۔ وہ "حق" کی صدا کے ساتھ آگے کو جُھک گیا۔ پھرتی سے ایڑھے کر گدی پر جھانپٹ جو رسید کیا تو پرتھی پال سنگھ تیورا کر جوہڑ کے بیچ میں پیشانی اور ناک کے بل گرا اور دُور تک گھسٹتا ہوا چلا گیا۔ پیشانی، ناک، اور ہونٹ بُری طرح چھل گئے۔

بالا سنگھ بھی جوہڑ میں کُود پڑا۔ شاید پرتھی پال سنگھ کے جسم میں اُٹھنے کی سکت باقی نہیں رہی تھی۔ لیکن نہ معلوم کس جذبے کے تحت وہ ہڑبڑا کر اُٹھا اور سیدھا کھڑا بھی نہ ہونے پایا تھا کہ بالا سنگھ نے اُس کے جبڑوں تلے بڑے دھماکے سے گھونسہ جڑ دیا۔ پرتھی پال سنگھ کو محسوس ہُوا کہ اس کے مسوڑھوں میں سے گرم گرم نمکین خُون نکل کر اس کے لعاب دہن میں مل رہا ہے اور اس کے ساتھ اُس کے ذہن پر بادل سے چھا رہے ہیں۔

بالا سنگھ نے حضور صاحب (حیدر آباد دکن) کا بنا ہُوا تین صفر ول والا بھاری بھرکم کڑا آگے بڑھا کر انتہائی نفرت سے ہتھیلی کے نچلے حِصّے کا ایک جھانپٹ اس کے رخسار پر رسید کیا اور گوشت کی ایک بوٹی کٹ کر علیحدہ ہوگئی۔ پرتھی پال سنگھ کو یوں محسوس ہُوا جیسے اس کے رخسار پر دہکتا ہُوا انگارہ رکھ دیا گیا ہو۔

معلوم ہوتا تھا کہ اس کی ٹانگ میں گہری چوٹ آئی ہے۔ اُس کے حواس قریب قریب مختل ہو چکے تھے اور وہ لڑکھڑا کر اور گھسٹ کر بالا سنگھ سے زیادہ سے زیادہ پرے ہٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بالا سنگھ نے بے رحمی سے دانت پیس کر کہا "آج مار مار کر تیرا کچومر نکال دوں گا۔"

پرتھی پال سنگھ کی آنکھوں میں دہشت چھائی ہوئی تھی۔ انتہائی خوف کے مارے وہ پیچھے پیچھے ہٹ رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بڑی مشکل سے چل رہا ہے۔ ادھر بالا سنگھ

نے بھی بھاگ کر اسے دبوچ لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ چنانچہ ان دونوں کے درمیان تیس چالیس قدم کا فاصلہ پیدا ہو چکا تھا۔ ادھر پرتھی اسے خوفزدہ نظروں سے دیکھتا ہوا گاؤں کی جانب بھاگ رہا تھا۔ ادھر پالی دانت بھینچے اطمینان سے قدم بقدم اُس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

گاؤں کے بالکل قریب پرتھی پال کے چند آدمی کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ انھوں نے اس کا جو یہ حال دیکھا تو انہیں بے حد تعجب ہوا کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے۔

پرتھی پال نے خشک گلے سے ہکلا کر کہا۔ "اس حرامی کے ..... بچے ..... کو مارو ..... بدمعاش ..... مادر .....۔"

وہ لوگ آستین چڑھا کر اس کی جانب بڑھے تو پالی نے للکار کر کہا۔ "آؤ! .. لیکن بیٹا یاد رکھو میں پالا سنگھ ہوں۔"

حملہ آوروں کے قدم جہاں کے تہاں رُک گئے

یہ دیکھ کر کر پرتھی پال پھر لنگڑاتا ہوا بھاگ نکلا۔ پالا سنگھ دل جمعی اور یکسوئی کے ساتھ اس کی جانب بڑھتا چلا گیا۔ ان کا مکان گاؤں کے سرے پر ہی تھا۔

بیٹھک میں پرتھی پال سنگھ کا باپ اور دیگر رشتے دار بیٹھے خوش گپیوں میں محو تھے۔ دفعتاً پرتھی پال سنگھ کا خون میں لتھڑا ہوا مسخ چہرہ اندر کی طرف بڑھا۔ پھر پالا سنگھ نے اسے بالوں سے پکڑ کر باہر کھینچ لیا۔

گھر میں اک دم شور مچ گیا۔

پالا سنگھ کے سر پر تو خون سوار تھا۔ اُس نے نہایت بے جگری سے پرتھی پال کو دیوار میں دھانس دیا اور اُس کی گردن پہ بازو رکھ دیا اور قریب تھا کہ وہ اس کا ٹینٹوا اور گردن کی رگیں مل ڈالے کہ کئی آدمی اکٹھے ہو کر آن پہنچے اور اُنھوں نے مل ملا کر ڈنڈوں، جوتوں، تھپڑوں، گھونسوں اور پاؤں کی ٹھوکروں سے بے رحمی سے مار مار کر پالا سنگھ کا بھرکس نکال دیا۔ یہاں تک کہ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ اُسے بالوں سے گھسیٹ کر بھوسے کی کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا اور طے پایا کہ رات بھیگ جانے پر اس کے جسم کا قیمہ کر کے بڑی نہر میں بہا دیا جائے۔

۱۷

رات کے ساڑھے گیارہ بجے کے قریب جوالا سنگھ کالی لوئی بدن پر لپیٹتا ہُوا اپنے گھر میں سے نکلا اور جلد جلد قدم اُٹھاتا ہُوا گاؤں کی گلی میں گھس گیا۔ نیم تاریک گلیوں میں گھومنے والی آوارہ بچھڑیوں کو دھتکارتا ہُوا کرم دین کے گھر پہنچ گیا اور اُس کے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ پہلی بار تو خاموشی طاری رہی دوسری بار کنڈی بجانے سے اندر سے ہلکی سی آواز آئی، پھر کرم دین رضائی لپیٹے باہر نکلا۔ جوالا سنگھ کو دیکھا تو ذرا گھبرا سا گیا۔ کہ آخر اس قدر بے وقت آنے میں کیا بھید ہے۔

وہ زمانے کا نشیب و فراز دیکھے تھا۔ بظاہر دل کا حال چھپا کر بولا:

"آؤ بھئی جوالا سنگھ اندر چلے آؤ۔"

اندر لے جا کر اسے تکریم سے چارپائی پر بٹھایا اور خود ذرا پرے ہٹ کر حقّے کے ہلکے ہلکے کش لینے لگا۔ کرم دین کو معلوم تھا کہ ڈاکے والا معاملہ ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے بالکل دب گیا تھا۔ اب نہ جانے اور کیا آفت آن پڑی تھی۔

"کیا سو گئے تھے؟" جوالا سنگھ نے بات شروع کی۔

"نہیں تو ـــــ میں بوڑھا آدمی ٹھہرا اب اتنی نیند کہاں؟ ابھی ابھی تو میں نے حقّہ تازہ کیا تھا۔ جرا اُونگھ آئی کہ تم نے دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ . . . . لیکن بھئی تم جرا بے وقت آئے ہو اس لیے دل میں کھُد بُد ہو رہی ہے کہ کوئی کھاس بات ہے۔ . . . "

"ہے تو کھاس بات۔" جوالا سنگھ نے کھانس کر گلا صاف کیا اور پھر کرم دین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

کرم دین کا ذہن کچھ کام نہیں کرتا تھا۔ وہ ہمہ تن گوش ہو رہا تھا۔

جوالا سنگھ نے رازدارانہ لہجے میں کہنا شروع کیا۔ "ایک بہت بری کھبر آئی ہے۔

معلوم ہُوا ہے کہ ٹنڈ پور والوں نے پالا سنگھ کو جان سے مار دیا ہے۔"

حُقّے کی نے کرم دین کے ہاتھ سے چھُوٹ گئی اور حُقّہ گرنے سے بال بال بچا۔

"نہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"ہاں مجھے بھی یقین نہیں آیا تھا — لیکن یہ بات سچ ہے۔"

"تم سے کس نے کہا۔"

"ٹنڈ پور کے دو چمار یہ خبر لائے ہیں۔"

"انھیں کس نے بتایا۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"وہ کہتے ہیں جن لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اُنھوں نے بتایا۔"

"لیکن پالا سنگھ مار کھانے والی آسامی نہیں ہے۔"

"شاید اسے دھوکے سے مار اگیا ہو۔"

"آخر اس کا کچھ سبب بھی تو ہونا چاہئیے۔"

جوالا سنگھ کو کچھ زیادہ علم نہیں تھا بولا۔ "بھئی اس سے زیادہ مجھے کچھ خبر نہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب یہ بتاؤ کہ ہمیں کیا کرنا چاہئیے۔ میں یہ خبر پاتے ہی پہلے تمہارے پاس لپکا ہُوا آیا ہوں۔ تمہارے مشورے ہی سے کچھ کرنا ہوگا۔"

کرم دین سوچ میں پڑ گیا پھر سر ہلا کر بولا۔ "ہائے کیسا گبرا جوان تھا بھئی خُدا کرے یہ خبر گلت ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایسی دشمنی بھی کس کی تھی اس سے۔ ۔ ۔"

"کیا پتہ خُود ہی اُلجھ پڑا ہو کسی سے۔"

"ہاں بھئی کیا پتہ ہے اس کا۔"

یہ کہہ کر کرم دین پھر سوچ میں ڈوب گیا۔ چندے تامل کے بعد اُس نے سر اُٹھایا اور جوالا سنگھ کے چیچک بھرے چہرے کی جانب دیکھ کر بولا:

"بھئی ایک بات آئی ہے میرے کھیال میں تایا پرشاد سے ملنا چاہئیے۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔ وہ بھی بڑا سیانا آدمی ہے لیکن میں پہلے تمہارے پاس چلا آیا۔ کیونکہ وہ جرا پڑھا لکھا آدمی ہے اور پڑھے لکھے آدمی کی کھوپری کا ایک آدھ پیچ جرور ڈھیلا ہوتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چلو اب اس کے پاس چلیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر یہ کھبر سچ ہے تو ہم پالا سنگھ کے قاتلوں کا آج ہی سیاپا بول دیں گے۔

"دیکھو جلدی باجی مت کرو اور نہ ابھی شور مچاؤ۔"

جب وہ دونوں دروازے سے باہر نکلے تو آگے سے نواب کندھے پر لٹھ دھرے آتا دکھائی دیا۔ جوالا سنگھ نے للکار کر کہا "اوئے نواب یہ بے وقت کہاں جا رہے ہو بھاگے ہوئے۔"

انھیں دیکھ کر نواب فوراً ان کے قریب چلا آیا اور گھبرائی ہوئی آواز میں بولا: "میں پالی کے گھر جا رہا ہوں۔ میں نے بہت بری خبر سنی ہے کہ منڈ پور والوں نے پالی کو بہت مارا ہے۔"

"بہت مارا ہے یا جان ہی سے مار دیا ہے۔"

نہیں جان سے تو نہیں مارا لیکن شاید مار دیں۔

"مگر اس کو مارنے والے ہیں کون۔" کرم دین نے سوال کیا۔

"ارے وہی پرتھی پال سنگھ کے خاندان والے تو ہیں اور کون ہوتا۔۔۔"

"آخر ان کی کیا دشمنی ہے جی۔"

نواب نے اصل راز سے پردہ اٹھانا مناسب نہیں سمجھا۔ بولا "بھئی ہے تو عورت وورت کا جھگڑا۔۔۔۔"

اس پر جوالا سنگھ کے کان کھڑے ہوئے "اچھا بھئی ذرا کھل کر بتاؤ۔۔۔۔"

"کھل کر کیا بتاؤں۔ یونہی کیا س سے کہتا ہوں کوئی جروری تو ہے نہیں یہی بات ہو۔

کرم دین نے نواب سے کہا۔ دیکھو ابھی پالی کی ماں کو اس کی کوئی خبر نہ دو نہیں تو وہ سارا گاؤں سر پر اٹھالے گی۔ آؤ تم ہمارے ساتھ تایا ہر پرشاد کے پاس چلو۔"

ان تینوں نے تایا ہر پرشاد کو جا جگایا۔ وہ بچارا بھونچکا سا رہ گیا کہ آخر نصف رات گئے یہ کیا مصیبت آن پڑی۔

جب اسے ساری کہانی کا پتہ چلا تو وہ بولا "بھائیو اب تو جلد از جلد کچھ کرنا چاہیے۔ راستے میں شنگارے کو کہتے چلو کہ گاؤں کے چُنے ہوئے جوانوں کو بھی خبر کر دے۔ اتنے میں ہم جوالا سنگھ کے گھر میں بیٹھ کر مشورہ کر لیں گے۔

جوالا سنگھ کے وہاں کوئی نہ کوئی چور اچکا پناہ لینے کے لئے آ ہی نکلتا تھا ہر روز اس رات بھی دو آدمی آئے ہوئے تھے جو صورت سے ٹھگ معلوم ہوتے تھے۔ ان کی صورتیں مکروہ اور تیور شیطانی نظر آتے تھے۔

رفتہ رفتہ لوگ اکٹھا ہونے لگے۔

نواب کی اطلاع یہ تھی کہ پالا سنگھ ابھی تک جان سے نہیں مارا گیا تھا۔

جس طرح جنگل میں دو خشک بانسوں کی رگڑ سے چنگاری پیدا ہو کر آناً فاناً سارے جنگل میں آگ بھڑک اُٹھتی ہے اسی طرح گاؤں کے جوانوں کے کانوں تک بھنک پہنچتے ہی وہ جوق در جوق جوالا سنگھ کے گھر پر جمع ہونے لگے اور جوں جوں لوگ جمع ہوتے جاتے تھے۔ توں توں موقعہ کی نزاکت اور اہمیت کا احساس بڑھتا جاتا تھا۔

پالا سنگھ کی بابت تفصیلی خبر نہیں مل سکی۔ اس وقت تک متضاد قسم کی خبریں مل تھیں۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا کہ معاملہ نازک تھا جو کچھ کرنا ہو وہ فوراً ہونا چاہیے۔

مختلف قسم کے منصوبے باندھے گئے۔ یہ ڈنگا کی عزت اور آبرو کا سوال تھا۔ گاؤں کے طاقتور ترین نوجوان کی زندگی اور موت کا سوال تھا۔ اگر ٹنڈ پور والے اس طرح پالی کو کتے کی موت مار کر اسے کہیں غائب کر دینے میں کامیاب ہو گئے تو یقیناً بڑی مشکل کا سامنا ہو گا۔ یہ بات ڈنگا کی روایات کے سراسر خلاف تھی۔ اور اس نگر کی جو ساکھ سالہا سال سے قائم تھی وہ مٹی میں مل جائے گی۔

جوالا سنگھ نے سرخ آنکھیں گھما کر کہا "واہگورو نہ کرے کہ پالی کو کوئی آنچ آئی ہو لیکن اگر اس کا بال بھی بینکا ہُوا تو ہم بھٹیوں کے گھر کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے اور ان کی عورتوں اور بچوں سب کو ختم کر دیں گے "

ہر پرشاد نے جوالا سنگھ کو چپ کراتے ہوئے کہا "سردار صاحب! اس وقت تو یہ سوچیے کہ ہمیں کرنا کیا ہے۔ کونسا قدم کس طرح اُٹھانا ہو گا"

یہ صلاح بھی ٹھہری کہ مخالف پارٹی کو پیغام بھیج دیا جائے کہ وہ پالی کو صحیح و سالم ہمارے حوالے کر دیں ورنہ ان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے گی ۔۔۔۔۔ اس پر نواب کو بڑا طیش آیا۔ چمک کر بولا "دیکھیے اس طرح کام نہیں چلے گا۔ میں آپ سب سے ایک ہی بات کہوں گا کہ ہم لوگوں کو ہر طرح سے تیار ہو کر ان پر حملہ کر دینا چاہیے جو ہو سو ہو ــــ پالی کو ان سے اس طرح طلب کرنے میں ہماری توہین ہے۔ ہم طاقت سے اسے چھین کر لائیں گے اور اگر ہم نے پالی کا پتا نہ پایا تو پھر جو ہم سے بن پڑے گا

کریں گے۔"

جوالا سنگھ کا تو پہلے سے ہی خیال تھا وہ تہبند پھڑپھڑاتا ہوا اٹھا اور اس نے اپنے طویل اور عریض صحن میں اپنی لاٹھی سے زمین پر لکیر کھینچتے ہوئے بھاری آواز میں کہا "میرا ابھی یہی کھیال ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب جس مائی کے لال کو میدان سے پیچھے نہیں ہٹنا ہے اور جو جان ہتھیلی پر رکھ کر دشمن سے ٹکر لینے کو طیار ہو وہ اس لکیر سے اس پار چلا آئے"

اس براہِ راست چیلنج پر پہلے چند لمحوں تک تو سکوت طاری رہا پھر سن چلے جوان لکیر کے اس پار آنے لگے۔

بڈھے بوڑھوں کے سوا سب لوگ لکیر پار کر چکے تھے۔ ان میں سے ہر ایک خود سر اڑیل جوان تھا بھلا پیچھے کون رہتا۔

انہیں یک جا جمع دیکھ کر جوالا سنگھ نے گہری سانس لی اور اس کا سینہ ابھر کر بہت بڑے صندوق کے مانند دکھائی دینے لگا۔ اُس نے اپنی موٹی گردن گھما کر ان سب کا جائزہ لیا۔ اُس نے اپنے دو مہمانوں کو بھی ان میں شامل کر لیا اور پھر بولا:

"اب ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے"

کرم دین اور ہر پرشاد محتاط ضرور تھے لیکن نوجوان کے جوش و خروش کو دبانا ناممکن تھا۔ بلکہ اس وقت تو ان کی سوکھی رگوں میں بھی گرم گرم خون گردش کرنے لگا۔

ہر پرشاد اور کرم دین نے آپس میں مشورہ کر کے کہا "لیکن بھائی اس بات کا خیال رہے کہ یہیں سے شور مچاتے ہوئے مت جانا۔ ابھی تو کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہونی چاہیے۔ ۔ ۔ ۔ اور دیکھو بھئی جوالا سنگھ اگر پائی زندہ ہو، تو کوشش اسی بات کی کرنا کہ بغیر کسی کو جان سے مارے تمہارا کام بن جائے۔ یوں لڑنا پڑے تو بے شک ڈٹ کر لڑو لیکن اگر کسی کی جان نہ لو تو اچھا ہے۔"

اس فساد کے نتائج بھی دونوں بوڑھوں کے پیشِ نظر تھے۔

اس وقت جوالا سنگھ سب کو سامان بانٹنے میں مصروف تھا۔ ہر جوان کو ایک مضبوط لٹھ اور بوقتِ ضرورت اس بوجھ اٹھانے کے لیے چھوی البعض نے صفاجنگ لینے پر بھی اصرار کیا لیکن فیصلہ یہ ہوا کہ صفاجنگ ہمراہ لے لئے جائیں۔ اس خطرناک ہتھیار کا استعمال محض بوقتِ ضرورت ہی کیا جائے۔ یوں ساتھ لے جانے کو تو جوالا

سنگھ کے دو مہمانوں نے موٹر کے اسٹیرنگ کی نالیوں کی بنی ہوئی بندوقیں بھی اور ایک تھیلا کارتوسوں کا بھی ہمراہ لے لیا۔ جوالا سنگھ نے لاٹھی اور چھوی کے علاوہ دیسی ساخت کا بے ڈول بڑا سا پستول تہبند میں اڑس لیا۔ اور پھر ہر پرشاد کی بات کا جواب دینے کے لئے گھوم کر ان کی طرف تیز و تند نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا: "اس چیز کا فیصلہ تو انہیں پر ہے اگر موت اُن کے سروں پر منڈلا رہی ہے تو پھر کوئی طاقت بھی انہیں بچا نہیں سکتی۔"

کُل چھتیس آدمی ہر قسم کے ہتھیاروں سے لیس جوالا سنگھ کے گھر سے نکلے۔ چنتو جو ہتھیار بانٹنے میں مصروف رہی تھی۔ اسے پیچھے چھوڑ دیا گیا۔ حالانکہ وہ ان کے ہمراہ جانا چاہتی تھی۔

یہ قافلہ تیز تیز قدم اُٹھاتا کھیتوں میں اُگی ہوئی فصلوں کو روندتا ہوا طوفانی سیلاب کے مانند بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ سامنے چاندنی کے دُھندلکے میں منڈ پورکیجڑ میں لتھڑے ہوئے کچھوے کے مانند نظر آنے لگا۔

جوالا سنگھ نے قدم روک کر ساتھیوں کی جانب ایک نظر دیکھا اور غرا کر کہا "جوانو! اب ہم منزل کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ اب بھی موقعہ ہے تم میں سے جو کوئی واپس جانا چاہے وہ جا سکتا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ آگے بڑھ کر جس کسی نے بھی قدم پیچھے ہٹایا تو یہ اُس کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔"

جوالا سنگھ کی یہ بات خالی خولی دھمکی نہیں تھی۔ تاہم ان میں سے ہر ایک نے آگے بڑھنے پر آمادگی کا اظہار کیا۔

اب سارے گاؤں کی ناکہ بندی کر دی گئی تاکہ پرتھی پال سنگھ کے خاندان کا کوئی فرد بھاگ نہ سکے۔ احتیاطاً ہر گلی کی ناکہ بندی کے لئے دو دو آدمی روانہ کر دئے گئے۔ باقی لوگ کھیتوں میں جُھک جُھک کر چلتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ جگمگاتی ہوئی چھویاں اور آسمان کی جانب اُٹھتی ہوئی بندوقوں کی نالیاں ایک نئے طوفان کا پتہ دیتی تھیں۔

پالا سنگھ کو اس علاقے میں سب لوگ جانتے تھے، پرتھی پال کے آدمیوں نے اسے بُری طرح پیٹا تو ضرور تھا لیکن چونکہ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہ سکی تھی اس لئے وہ اسے جان سے مار ڈالنے سے ہچکچاتے رہے اور پھر ادھر اُدھر کے لوگوں نے ان سے یہ بھی کہا تھا کہ اول تو جو سلوک وہ اب تک پالے کے ساتھ کر چکے تھے۔ اسی کا نتیجہ ان کے حق میں بہت بُرا نکلے گا لیکن اگر کہیں اس کی موت ہو گئی تو پھر وہ خود بھی بچ نہیں سکیں گے۔

اس پر ان لوگوں کو بہت طیش آیا۔ ایک تو زیادتی سراسر پالی کی تھی اور اس پر تمسخر۔ کر دھمکیاں۔ لیکن جاننے والے کہتے تھے کہ جو کچھ پالی نے کیا تھا اسے نظر انداز کر دیا جاتا تو اچھا ہوتا۔ اس طرح جتنے منہ اتنی باتیں۔ لیکن اس کا یہ نتیجہ ضرور نکلا کہ وہ پالی کو جان سے مار ڈالنے کا پروگرام فی الفور پورا نہ کر سکے۔

پالی بھوسے کی کوٹھڑی میں بند تھا۔ اس کے زخم اسے مار ڈالنے کے لئے کافی تھے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ اس کے زخموں کی مرہم پٹی کی جائے، مگر وہاں اس کا کون تھا چنانچہ وہ بدستور نیم بے ہوشی میں پڑا رہا۔

نصف رات گزر چکی تھی۔ سارے گاؤں پر موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ ورد دیوار اور مکانوں میں کھڑے ہوئے پیپل کے پیڑ بے حد پُر اسرار دکھائی دیتے تھے۔ کتے اناج بھوننے والی بھٹیوں کے اندر دبکے پڑے تھے۔ سردی کی شدت کی وجہ سے کوئی متنفس ادھر اُدھر پھرتا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بھینس و دیگر مویشی تک چھپروں کے نیچے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ گاؤں کے لوگ سہمے ہوئے تھے۔ نہ جانے اب کیا طوفان آئے۔

دفعتاً ٹیس کرتی ہوئی بندوق کی گولی رات کی مکمل خاموشی کا سینہ چیرتی ہوئی نکل گئی۔

گاؤں میں کئی اشخاص نے آنکھیں کھول دیں۔

دوبارہ ایک اور گولی کی آواز سنائی دی۔

لوگوں نے کہا کہ بھٹین کے مکان کی جانب سے بندوق چلنے کی آوازیں آرہی ہیں۔ گھر والوں کے کان بھی کھڑے ہو گئے۔ پرتھی کا باپ چھت پر چڑھ گیا کہ شاید قریب کے کھیتوں کی جانب کچھ دکھائی دے۔ اس کے ہاتھ میں بھی پکی رائفل تھی۔ دھندلی روشنی میں اس نے سر اٹھایا ہی تھا کہ ایک گولی سائیں سے آئی اور اوپر رکھی ہوئی ایک ناکارہ مدھانی کا ایک سرا صاف اُڑ گیا اور اس کے بعد تو تڑاتڑ گولیاں چلنے لگیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ باقاعدہ فوج نے حملہ بول دیا ہے۔ گاؤں میں لوگوں نے چلانا شروع کر دیا۔ کھیتوں میں بلند جنگی نعروں اور گالیوں کی بوچھار شروع ہو گئی غرض کہ کچھ ایسا ہنگامہ مچا کہ مویشی کھونٹوں سے رسیاں تڑا کر بے مہار بھاگ نکلے۔ کتے کمین گاہوں سے نکل کر بے تحاشہ بھونکنے لگے۔ ایک آدھ چھرا لگنے پر بیاؤں بیاؤں کا شور مچانے لگے۔

کوئی شخص ڈر کے مارے گھر سے باہر قدم نہیں نکالتا تھا۔ جن لوگوں کو اس واقعہ کا

علم تھا کہ ان لٹیروں سے کوئی بات بھی بعید نہ تھی۔ ممکن ہے اسی بہلنے سے گاؤں بھر کو لوٹ لے جائیں۔

اسی ہنگامے میں بیس پچیس آدمی پرتھی کے مکان کی جانب بڑھے، کچھ تو پیچھے چھپ گئے اور اُنھوں نے نگاہ چھت پر رکھی تاکہ اگر اوپر سے کوئی شرارت ہو تو گولی داغ دیں اور کچھ نچلے دروازے پر پہنچ کر گالیاں دے دے کر دروازہ کھولنے کے لیے للکارنے لگے۔

جب اس طرح دروازہ نہیں کھلا تو اُنھوں نے کندھوں سے دھکے مار مار کر دروازہ توڑ ڈالا۔ شاید اس قدر شدت سے حملہ نہ کیا جاتا تو پالی ان کے حوالے کر دیا جاتا۔

اب یہ سمجھا گیا کہ لڑائی ناگزیر ہے۔ چنانچہ چند لٹھ باز بوکھلائے ہوئے آئے اور اندھا دھند لاٹھیاں گھمانے لگے۔

اب باقاعدہ لاٹھیوں سے لڑائی ہونے لگی۔ چھویوں اور بندوق یا پستول کا استعمال نہیں ہُوا۔ مدافعت کرنے والے مٹھی بھر آدمی چند گھڑی بعد یا زخمی ہو کر گر پڑے یا بھاگ نکلے۔۔۔

۔۔۔ اور میدان حملہ آوروں کے ہاتھ رہا۔ پرتھی پال سنگھ کے قریبی رشتے دار رائفل چلانے پر تلے ہوئے تھے، لیکن پرتھی پال سنگھ کی ماں نے چلّا کر کہا: "بھائیو! ہمیں کچھ مت کہو تمہارا آدمی اُس کمرے میں بند ہے۔"

دو چار آدمی اُدھر بھاگے۔ دروازہ کھول کر پالی کو باہر نکالا گیا۔

دفعتاً آواز بلند ہوئی: "پالا سنگھ مر گیا ہے۔"

اس پر جوالا سنگھ کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اُس نے چلّا کر کہا: "اوئے شیریا۔ لاٹھی پر چھوی چڑھا لو جرا۔" شیرا چھوی چڑھانے لگا اور جوالا سنگھ کا اشارہ پا کر پرتھی پال سنگھ کے گھر کے سارے افراد کو عورتوں اور بچوں سمیت کھدیڑ کر مکان کے سامنے کھلی جگہ میں لے آئے۔ مردوں نے کچھ مدافعت کی کوشش کی لیکن ان پر قابو پا لیا گیا۔

قریب تھا کہ ان کے سر گاجر مولی کے مانند کٹنے شروع ہو جائیں۔ اڑوس پڑوس کے لوگ جوان کی مدد کی جراُت نہیں کر سکتے تھے۔ چپکے چپکے اپنے مکانوں ہی میں سے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے ـــــ عین اس وقت پالی کا سر ہلا۔ پھر شور مچ گیا: "پالی زندہ ہے۔۔۔۔ پالی زندہ ہے۔"

اس طرح بے گناہوں کے سر کٹنے سے بچ گئے۔

بے ہوش پالی کے جسم کو ایک چارپائی پر ڈال کر کندھوں پر اٹھا لیا گیا اور وہ سب اپنے گاؤں کو روانہ ہو گئے۔

حملہ آور بگولے کی طرح آئے اور آندھی کے مانند چلے گئے۔

لیکن جاتے جاتے جوالا سنگھ نے پھیکی چاندنی میں چمکتی ہوئی چھوی ہلائی اور کہا کہ اگر پالی کی جان نہ بچ سکی تو پھر لوٹ کر آؤں گا اس گھر کے ایک آدمی کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔

پالی تو خیر بچ نکلا۔ لیکن اس واقعہ کے دوسرے روز ہی پرتھی پال سنگھ کے گھر والے شہر ایک رشتے دار کے وہاں چلے گئے۔ پولیس میں رپورٹ ہوئی تو شام سے پہلے پہلے پولیس ڈنگا پہنچ گئی اور پکڑ دھکڑ شروع ہوئی۔

اس ہنگامے میں حصہ لینے والے سارے آدمی حراست میں لے لئے گئے۔

گاؤں میں بڑی گہما گہمی رہنے لگی۔ بڑے بوڑھے کہتے تھے خاصی مدت کے بعد اس قدر زوردار واقعہ پیش آیا تھا۔ گاؤں میں گھر گھر سے مقدمہ لڑنے کے لئے چندہ وصول کیا گیا۔

اردگرد کی بستیوں میں بھی یہ بات مشہور ہو گئی۔ لوگ اس مقدمے کی خبریں سننے کے لئے بے چین رہتے تھے۔ ہر رہٹ، ہر دھرمشالہ اور ہر گوردوارے میں اسی واقعہ کا چرچا تھا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ آخر پالی نے پرتھی پال کو کیوں مارا۔ اس پر خوب چہ میگوئیاں ہوتی رہیں۔ چند دنوں بعد پالا سنگھ کے زخم بھر گئے اور وہ ایک مرتبہ پھر مشکی گھوڑے کے مانند چاق چوبند للکارتا ہوا گھومنے لگا۔ لیکن زیادہ تیزی سے حصہ لینے والوں کی ضمانتیں بھی منظور ہو گئیں۔

چھ مہینے تک مقدمہ چلتا رہا۔ آخر فیصلہ ہوا تو ہر ایک کو کچھ نہ کچھ سزا ضرور ملی۔ پالا سنگھ کو ڈیڑھ سال قید بامشقت کی سزا دی گئی۔

۱۸

ڈیڑھ برس قید میں کاٹنے کے بعد جب پالا سنگھ جیل سے باہر نکلا تو اس نے زمین پر زور سے تھوکا اور سر اُٹھا کر ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔

وہی سردیوں کا موسم تھا اور دس بجے کا وقت۔ سردی کڑاکے کی پڑ رہی تھی لیکن دھوپ کی گرمی سے بدن کو عجیب قسم کی راحت سی محسوس ہوتی تھی۔

پالا سنگھ نے دیکھا کہ دُنیا اب بھی اسی قدر حسین ہے جس قدر حسین کہ وہ اسے چھوڑ گیا تھا۔ ہواؤں میں وہی تازگی، درختوں پر وہی ہریالی، آسمان کی وہی نیلاہٹ پرندوں کی وہی بلند پروازیاں، انسانوں کی وہی گہما گہمی۔ غرض کسی شے میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا تھا۔

خود پالی وہی پُرانا پالی تھا۔ وہی بلند و بالا اینڈا بینڈا جوان۔ جیل میں اسے کسی قسم کی تکلیف نہیں محسوس ہوئی تھی۔ دُودھ، دہی، گھی، مٹھائی غرض ہر شے کا انتظام کر لیا گیا تھا۔ بالکل گھر کا سا آرام تھا صرف جیل کی چار دیواری سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ اگر بنظرِ غور دیکھا جائے تو پالا سنگھ کا چہرہ پہلے کی بہ نسبت زیادہ بھرپور نظر آتا تھا۔ جسم قدرے اور پھیل گیا تھا۔ وزن بھی زیادہ ہو گیا تھا۔

ایک مرتبہ پھر آزاد پرندے کی مانند اُس نے خوش خوش چلتی پھرتی دُنیا کو دیکھا اور پھر ایک گہری سانس لے کر سینہ پھُلا دیا۔

گاؤں پہنچا تو بیشتر ساتھی جیل سے رہا ہو چکے تھے ان سے مُلاقاتیں ہوئیں۔ سرتوں! ــــ سرتوں اب اپنے خاوند کے پاس رہتی تھی۔ بہت پُوچھ پُچھ کے بعد پالی کو یہی معلوم ہو سکا کہ شادی ہو جانے سے سرتوں کچھ ایسی ناخوش نہیں تھی۔ سال بھر کے بعد ایک بچّہ بھی پیدا ہو گیا تھا اور اب وہ اپنے گھر میں بڑی خوش و خرم تھی۔

یہ باتیں سُن کر پالی کو سخت کوفت ہوئی۔ لیکن اس نے سوچا کہ ایک مرتبہ تو سرتوں

کے درشن ضرور کروں گا۔

بالآخر چند ہی روز کے بعد ریل پر سوار ہو کر وہ اُس شہر میں پہنچ گیا جہاں چھاؤنی کے ایک کوارٹر میں اس کی دلنواز محبوبہ رہتی تھی۔

وہاں متعدد کوارٹر قطار در قطار دُور تک چلے گئے تھے۔ اس کے پاس پُورا پتہ موجود تھا۔ کوارٹر کا نمبر پندرہ اسے زبانی یاد تھا۔ نمبر دیکھتا ہُوا جب وہ ایک سرے والے پندرہ نمبر کوارٹر کے آہنی دروازے کے سامنے پہنچا تو اس کے پاؤں خود بخود رک گئے۔

صبح گیارہ کا وقت تھا۔

اُس نے جُھک کر انگوچھے سے دیسی جوتوں کی گرد جھاڑی۔ چہرہ صاف کیا۔ داڑھی اور مونچھوں پر ہاتھ پھیرا اور پھر جب اُس نے آگے بڑھ کر سیاہی مائل آہنی دروازے پر دستک دی تو اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ انتظار کا ایک ایک پل سال بھر سے کم نہیں تھا۔

دوسری بار دستک دینے کے چند لمحوں بعد اندر سے دروازے کی کُنڈی ہلنے کی آواز آئی۔ دروازہ کھلنے کو تھا۔ پالی کا کلیجہ اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔ بھلا دروازہ کھولنے کو کون آیا ہوگا۔ شاید سرنی کا خاوند ہو یا کوئی نوکر یا خود سرنی!

پہلے دروازہ تھوڑا سا کھلا۔ پالی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا اور پھر سارا دروازہ کُھل گیا اور سامنے ۔ ۔ ۔ ۔ سرنوں کھڑی تھی۔

ایک مرتبہ تو پالی کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔

تازہ دھوئے ہوئے تہ در تہ سیاہ بالوں میں سرنوں کا حسین چہرہ دمک رہا تھا۔ کٹورہ سی مدھ ماتی آنکھیں پلکوں کے بوجھ کے باعث مکمل طور پر کُھلنے سے معذور تھیں۔ سینے کی گولائیاں زیادہ بے باکی سے نمایاں ہو رہی تھیں۔

پالی ایک قدم پیچھے ہٹ گیا جیسے سنسان جنگل میں کالے بادلوں تلے سے دفعتاً چاند نکل آنے پر بارہ سنگھے بدک جاتے ہیں۔

اسے دیکھ کر سرنوں کا چہرہ پھول کے مانند کِھل گیا۔ دانت دمکنے لگے۔ اور اس کے دونوں ہاتھ جُڑ گئے۔ رس بھرے لبوں سے "ست سری اکال" کی ہلکی سی آواز نکلی۔ پھر اُس نے اوڑھنی کا پلو سر پر ڈال کر شیریں آواز میں کہا:

"اندر چلے آیئے۔"

پالا سنگھ کی باچھیں چر گئیں۔ بھاری آواز میں بولا:۔

"تم نے پہچان لیا مجھے . . . . ؟"

"کیوں نہیں . . . . . . آپ کو نہیں پہچانوں گی، تو بھلا اور کسے پہچانوں گی . . . . .

آپ کب آئے . . . . . ؟"

اس کی مراد جیل سے تھی۔

اس پر پالا سنگھ کے چہرے پر ہلکا سا گلابی رنگ دوڑ گیا۔ اُس نے قدرے تامل کے

بعد حساب لگا کر جواب دیا:

"آٹھ روز ہو گئے ہیں"

چھوٹے سے صحن سے گزر کر وہ اندر والے برآمدے میں پہنچے۔ سرتوں نے پھرتی سے

ایک چارپائی ڈال دی اور اندر سے چار خانے کا کھیس لا کر بچھا دیا۔ پالی اس پر بیٹھا تو

کھاٹ چرچرانے لگی۔

سرتوں پھر بولی "وہ تو گھر پر نہیں ہیں۔ صبح کھانا کھا کر دفتر چلے جاتے ہیں۔ شام

کو پانچ بجے لوٹ کر آتے ہیں"

"تو کیا سارا دن گھر پر اکیلی رہتی ہو؟"

"نہیں تو پڑوس کی عورتیں آ جاتی ہیں یا میں اُن کے وہاں چلی جاتی ہوں۔ گپ شپ

ہو جاتی ہے اور کچھ ادھر اُدھر کے کام سے بھی نبٹ لیتی ہوں"

یہ کہہ کر وہ دروازے تک گئی اور باہر کی جانب ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔

اس اثنا میں پالی چھوٹے سے صحن کا جائزہ لینے لگا۔ زمین پر ننھے ننھے کنکر پتھر

پھیلے ہوئے تھے۔ صحن کے دونوں کناروں پر لمبی لمبی کیاریاں بنی تھیں جن کا زمین میں

گڑی ہوئی آڑی اینٹوں کی قطاروں نے احاطہ کر رکھا تھا۔ ایک جانب کی کیاریوں

میں گینڈے اور چنبیلی کے پھولوں کے پودے تھے اور دوسری جانب کی کیاریوں میں پیاز

اور ٹماٹر کے پودے دکھائی دے رہے تھے۔ کیاریوں کے قریب کیچڑ میں لت پت دو گھریے

پڑے تھے اور چند کھلونے بھی صحن میں بکھرے پڑے تھے۔ اندر کا برآمدہ چھوٹا سا تھا۔

فرش محض اینٹوں کا بنا تھا۔ اندر دو کمرے معلوم ہوتے تھے۔ ایک کمرے میں چارپائیاں

اور کچھ بھاری سامان نظر آ رہا تھا اور دوسرے میں ایک آدھ پلنگ، دو کرسیاں ایک تپائی

اور ہلکے سامان کے علاوہ لوہے کی مضبوط سلاخوں والی کھڑکی دکھائی دے رہی تھی۔

گھوم پھر کر اس کی نظر دوبارہ سرتوں پر جا ٹکی۔ جو نہ جانے کیوں باہر کے دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ سرو کی طرح لچکتا ہوا اس کا بلند و بالا جسم دعوتِ نظارگی دے رہا تھا۔ وہ اس کے بالوں کا پھیلاؤ دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔

بالآخر وہ لوٹی اور اسے منتظر پا کر بے اختیار ہنس دی۔ بولی "پڑوسن کے لونڈے سے قریب کی دکان سے سبزی منگوائی ہے۔ سوچا آپ کو بھوک لگی ہوگی۔ . . . "

"نہیں ایسی جلدی بھی کیا ہے۔"

"کوئی مضائقہ نہیں . . . . باتیں بھی ہوتی رہیں گی اور کھانا بھی طیار ہوتا رہے گا . . . . لیکن ہاں . . . . آپ سامان تو کچھ لائے ہی نہیں۔"

"میرا یہاں ٹکنے کا خیال نہیں ہے۔"

"کیوں؟"

"کوئی خاص بات بھی نہیں . . . . یوں ہی . . . . میں نے سوچا ادھر سے ہو کر جانا ہے تو ملتے جائیں۔"

"بھئی یہ تو بُری بات ہے کہ آپ ملنے کے لئے آئیں اتنی مدت کے بعد اور پھر ایک دم ہی واپس چلے جائیں . . . . . "

پالی سنبھل کر بولا "نہیں ایک دم تو نہیں البتہ رات کو چل دوں گا . . . "

"آخر کہاں جا رہے ہیں آپ؟"

"ذرا آگے جا رہا ہوں۔" اس نے جھوٹ بولا۔

"یہی تو بُری بات ہے۔" وہ مُنہ بسور کر بولی۔

"پھر آ جاؤں گا کبھی . . . . اب تو ملاقات ہوتی ہی رہے گی۔"

پالی کو اس بات کا کوئی اندازہ نہیں تھا کہ سرتوں اس سے کس طرح پیش آئے گی۔ اسے اس امر کا تو خواب میں بھی خیال نہیں تھا کہ سرتوں کے وہاں اس کی ایسی آؤ بھگت ہوگی۔ خیر آئندہ سہی۔ وہ اپنا بسترا ساتھ لے کر آیا کرے گا اس مرتبہ تو اس نے ایک بھاری بھرکم کمبل لانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

سرتوں سامنے پیڑھی پر بیٹھی ننھی ننھی جرابیں بُن رہی تھی۔ اس پر پالی کو دفعتاً جو

خیال آیا تو بے اختیار بول اُٹھا۔

" منّا کہاں ہے؟"

سرتی نے قدرے شرما کر کہا:

اندر سویا پڑا ہے۔"

پاآی اُٹھ کر اندر گیا جہاں بچہ سویا پڑا تھا۔ اس کا سر ایک بہت بڑے سُرخ رنگ کے شلغم کے مانند تھا۔ بچہ حسین تھا۔ اُس نے اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور پھر باہر آکر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

" اچھا جی ....." سرتوں نے پھر کہنا شروع کیا" اب گاؤں کی باتیں سنائیے۔ کمئے آپ کی بے بے اور بھابی کی طبیعت کیسی ہے؟"

" بہت اچھی ہے۔"

" ہمارے وہاں بھی گئے تھے آپ؟"

" جی ہاں۔ سب سے ملا تھا..... وہ سب بڑے آنند میں ہیں۔"

" باقی میری سہیلیاں بھی ملیں کہ نہیں۔"

" بہتیری ملی تھیں۔"

" کیسی تھیں، کچھ کہتی تھیں؟"

" کچھ کیوں ـــ بہت باتیں کرتی تھیں....."

سرتوں خوش ہو کر بولی۔" آخر میں بھی تو سنوں کہ وہ کیا باتیں کہتیں تھیں۔"

" تمہیں یاد کرتی تھیں....."

" اور وہ رکھی بھی ملی تھی....."

" کون رکھی....."

سرتوں نے پُر معنی انداز سے دیکھ کر کہا" وہی..... جو..... جو..."

.... ہاں ....." پاآی کے لبوں پر کشادہ مسکراہٹ پھیلنے لگی۔ ہاں بھئی وہ تو تمہاری جگری سہیلی تھی۔"

" ہاں بیچاری بہت اچھی تھی۔ میرے دُکھ درد کی ساتھی....."

" وہ تمہیں حُسن کی مورتی سمجھ کر پُوجا کرتی تھیں۔"

" حُسن کی مورتی ....." وہ قدرے جھینپ کر منہ چھپانے لگی۔

پالی نے جرأت پاکر کہا۔ "اور اس میں شک بھی کیا ہے۔ آخر اور کون تھی جو تمہاری برابری کر سکتی۔ سچ تو یہ ہے کہ تمہارے بغیر سارا گاؤں سُونا سُونا سا دکھائی دیتا ہے.... لیکن آخر کار لڑکیوں کو پرائے گھر جانا ہی پڑتا ہے سرتی۔ تم کیا جانو....."

اتنے میں ایک لڑکا سبزی لیے اندر داخل ہوا ــــ سرتی کو تنہا پاکر پالی اور ہی جانب بہہ نکلا تھا۔

لڑکے سے سبزی لے کر سرتی اُٹھ کر اسے دروازے تک رخصت کرنے کے لیے گئی اور پھر دروازے کی چٹخنی چڑھا آئی۔

پالی نے خود بھی محسوس کیا کہ وہ بہکنے لگا تھا۔ اچھا ہُوا جو وہ لڑکا بیچ میں آن کُودا ورنہ نہ جانے وہ کیا بک دیتا۔

سرتی کے چہرے سے ناپسندیدگی کے آثار ہویدا نہیں تھے۔ وہ بڑی دل جمعی سے ادھر اُدھر گھومتی رہی۔ پھر ایک بڑا تھال، کاغذ کا بڑا سا ٹکڑا اور سبزی کا تھیلا لے کر آئی اور کھاٹ کے دوسرے سرے پر بیٹھ گئی اور بولی۔

"لیجئے اب ہم بیٹھ کر مٹروں میں سے دانے نکالیں گے اور خوب باتیں کریں گے۔"

جب وہ سر جُھکا کر مٹروں میں سے دانے نکالنے لگی تو پالی اس کی تیزی سے حرکت کرتی ہُوئی رنگین اور نازک اُنگلیوں کو دیکھنے لگا۔ پھر اس کی نظریں اس کے چہرے اور خدوخال کا جائزہ لینے لگیں۔ اب وہ پہلے سے بہت بدل گئی تھی۔ اس کی رنگت میں عجیب نکھار پیدا ہو گیا تھا۔ پہلے وہ ہاتھ سے بنے ہوئے کچّی مٹی کے کوزے کے مانند تھی۔ اب وہ بھٹی میں پک چکی تھی۔ اب اس کے مہکتے ہُوئے بدن سے مرد لذّت یاب ہو چکا تھا۔ اس کے چہرے کے خدوخال میں ایک خاص قسم کی پُرکشش کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ اب کنواری لڑکی کے الھڑپن کے عوض اس کے بدن میں پکے ہُوئے انگور کا سا رس پیدا ہو گیا تھا۔ اب ہر رنگ اور کیفیت میں دیکھنے والے پر اس کا بھرپور وار پڑتا تھا۔ اس کے بال، ابرو، پیشانی، پلکیں، پپوٹے، آنکھیں، رخسار، لب، ناک، ٹھوڑی غرض ہر عضو اپنے جوبن پر پہنچ چکا تھا۔ پالی کے اس قدر قریب بیٹھی ہوئی سرتی، جو درحقیقت اس کے دل کے سنگھاسن پر پریوں کی راجکماری کے مانند براجمان تھی اس سے کس قدر دور تھی.... کالے کوسوں دُور، وہ اسے کبھی

نہیں پا سکتا تھا۔ اس کے دہکتے ہوئے جسم کو سینے سے لگاتا تو درکنار وہ اسے چھو تک نہیں سکتا۔ آخر وہ کون سی خلیج تھی جسے پار کر کے وہ اپنے دل کی ملکہ تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

"آپ چپ کیوں ہو گئے ہیں۔"

"کچھ نہیں" پالی چونکا۔

ڈیڑھ برس جیل میں کاٹنے کے بعد ——— آج اسے عجیب قسم کا احساس ہو رہا تھا۔ یہ کیسا ماحول تھا۔ یہ صورت جو اس کے سامنے موجود تھی کون تھی۔ کیا وہ واقعی عورت تھی۔ کیا وہ فی الحقیقت اس کے سامنے بیٹھی تھی، کیا وہ سچ مچ اس سے بے کراں محبت کرتا تھا۔ . . . . محبت! محبت!! سالہا سال سے . . . . بیس برس سے . . . . بلکہ شاید جنم جنم سے وہ اسے محبت کر رہا تھا۔ اس کے نام کی مالا جپ رہا تھا۔ کس قدر عجیب سی بات تھی۔ وہ اسے نہیں پا سکتا تھا۔ وہ اس کی رگ رگ میں بس چکی تھی۔ اس کی محبت میں اس کے بدن کا رواں رواں سلگ رہا تھا۔ ایک انجانی سی کیفیت اس کے دل پر طاری تھی جیسے کوئی . . . . کوئی اسے یقین دلاتا ہو کہ کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا لیکن کیا ہو گا۔ کیا ہو سکتا تھا اب تک۔

پالی نے پھر سرتوں کے چہرے کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔

نہ جانے کیوں اس نے اس چہرے اور اس بدن کو اپنی ملکیت سمجھا تھا ایک ایسی شے جسے وہ جب چاہے ہاتھ بڑھا کر پکڑ سکتا تھا، اپنا سکتا ہے، ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنی بنا کر رکھ سکتا ہے۔ اس کا حسین چہرہ اسے کیا کیا دھوکے دیتا رہا تھا کیسی کیسی دعوتیں دی تھیں ان شیریں لبوں نے . . . . اس قدر سیدھا سادا چہرہ . . . . پھول کی طرح شگفتہ اور معصوم۔ اس قدر حسین اور معصوم چہرے والی لڑکی کو یقیناً اس سے محبت ہو گی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اس قدر مکمل حسن ہو اور اپنے شیدائی کے دل کی دھڑکن سننے سے معذور ہو۔ دھڑکن سنے اور پھر انتہائی سنگ دلی سے اس سے چشم پوشی کرے نہیں ایسا ہونا ممکن ہی نہیں۔

لیکن اگر واقعی اسے اس سے محبت تھی تو بھلا دنیا کی کوئی طاقت ایسی بھی تھی جو ان دونوں کے درمیان حائل ہو سکتی . . . . نہیں ایسی کوئی طاقت نہیں

تھی دُنیا کے تختے پر۔

اس پر پالی کا دل ڈوبنے لگا۔ حقائق کی تلخی سے اس کا سارا مزا کرکرا ہو گیا۔ اگر اس سنگ دل، اس ظالم، اس بے حس پتھر کو اس سے محبت ہوتی تو پھر وہ ایک بازو کی گرفت میں اس نازک بدن کو لے لیتا اور دوسرے ہاتھ میں طویل لاٹھی پر چڑھی چھوی ہوا میں لہرا کر ساری دنیا کو چیلنج دیتا کہ ہے کوئی مائی کا لعل؟ ہے تو میدان میں آئے! اور اس شیریں لب محبوبہ کو اس کے بازو سے نکالنے کا جتن کرے۔ اس کی للکار زمین کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک گونج جاتی لیکن کسی شخص کی اتنی مجال نہ ہوتی کہ اس کا چیلنج قبول کرتا۔

"نہ جانے آپ پھر کس سوچ میں ڈوب گئے ہیں؟" سرلوں نے شکایت کی۔

"اوہ کچھ نہیں — کچھ نہیں۔"

پھر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ گاؤں کے مختلف افراد، عورتوں، میلوں ٹھیلوں کی۔ پالی نے بڑی توجہ سے بات چیت میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ تاکہ اس کے خیالات بہک نہ سکیں۔

مٹر کے دانے نکل چکے تو سرلوں نے چولہے میں آگ جلائی۔ پالی نے سوچا بچاری کتنی اچھی ہے۔ پڑھی لکھی ہے نا تبھی تو ان سب باتوں کا سلیقہ ہے۔ بچاری کو اس کے آنے کا کس قدر چاؤ ہے۔

سبزی کا پتیلا چولھے پر دھر کر سرلوں نے آٹا گوندھنا شروع کیا اور پھر پالی کی جانب دیکھ کر بولی:

آپ کو بھوک تو لگی ہوگی سخت؟"

"بالکل نہیں بھئی — جب سے آیا ہوں۔ تم کھانا پکانے میں لگی ہو۔ میں اتنی دور سے روٹی کھانے کے لئے تو نہیں آیا۔"

"تو کیا مضائقہ ہے۔ باتیں بھی ہو رہی ہیں اور کھانا بھی پک رہا ہے۔ آخر پیٹ بھرے بغیر تو انسان سے بات بھی نہیں ہو سکتی . . . . ایسے موقع پر جبکہ . . . . وہ بھی گھر پر نہیں ہیں آپ کی تو اضع بھی کس چیز سے کروں۔"

"واہ بھئی میں کوئی بیگانہ ہوں کہ میری اس قدر خاطر کرنے کی ضرورت ہے۔ میں

تو گھر کا جوگی ہوں۔ میری قدر بھلا کیا ہو سکتی ہے۔ وہ کہا ہے نا! گھر کا جوگی جوگڑا باہر کا جوگی سِدھ۔"

باتوں باتوں میں پالی کو یہ چوٹ کرنے کی خوب سُوجھی ___ سرلوں کی صورت سے ظاہر ہوتا تھا کہ تیر نشانے پر بیٹھا ہے۔

وہ قدرے جھینپ کر بولی۔

"نہیں یہ بات تو نہیں . . . . ."

"خوب سمجھتا ہوں۔"

"نہیں نہیں آپ بالکل غلط سمجھتے ہیں۔"

"کیا چیز غلط سمجھتا ہوں۔" پالی نے جرأت سے کام لے کر دریافت کیا۔

"یہی کہ . . . . . وہ جو جوگی کی مثال دی ہے آپ نے۔"

اب ذرا مزے کی باتیں ہونے لگی تھیں۔ پالی نہیں جانتا تھا کہ بات کا رُخ ادھر کو ہو جائیگا اور پھر سرلوں بھی اس قسم کی گفتگو میں گرمجوشی سے حصّہ لے گی۔ پالی نے سلسلہ کلام کو منقطع ہونے سے بچاتے ہوئے کہا۔

"میری مثال ٹھیک ہی معلوم ہوتی ہے۔"

"یونہی وہم ہے آپ کا۔ ورنہ . . . . ."

"ورنہ کیا؟"

"ورنہ یہی کہ میں آپ کی عزت کرتی ہوں۔"

اس پر پالی نے بھاری بھر کم قہقہہ لگایا۔

"بھئی اجّت تو ہوتی ہی چاہئے ہماری۔ ہمارے کام ہی ایسے ہیں۔"

"کام سے کیا ہوتا ہے۔ دل دیکھنا چاہئے انسان کا . . . ."

"اچھا تو تم دل بھی دیکھ لیا کرتی ہو . . . . . ہم تو یہی سمجھے بیٹھے تھے۔ کہ تمہیں کسی کا دل دکھائی ہی نہیں دے سکتا۔"

واہ آخر آپ مجھے کیا سمجھتے ہیں۔"

"تم کو ہم سب کچھ سمجھتے ہیں لیکن دل کے معاملے میں جرا . . . . ."

قدرے سکوت کے بعد سرلوں بولی:

"آپ کو معلوم نہیں میں آپ کے دل کو اور ہی نظروں سے دیکھتی ہوں"

اس پر پالی کے دل میں لڈو پھوٹنے لگے۔ اسے خواب میں بھی یہ خیال نہیں تھا کہ سرتوں اس قدر بے باکی سے اس قسم کی باتیں کرے گی۔ اُس نے شہ پاکر پھر پانسہ پھینکا۔

"بھئی سچ؟"

"سچ" سرتوں نے فراخ دلی سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"بھئی ہمیں بھی تو معلوم ہو کہ ہمیں کس نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ذرا نظر سے نظر ملاؤ تو۔۔"

اس پر سرتوں جھینپ گئی۔ اُس نے آٹے میں سنے ہوئے ہاتھوں کو روکا اور جھکی جھکی نظروں سے پالی کی جانب دیکھا۔

پالی نے سوچا کہ چلو یہ سودا بھی کچھ مہنگا نہیں ہے۔ لیکن کیا سچ مچ سرتوں اسے اور نظروں سے دیکھتی تھی۔ کیا واقعی وہ اس کی قدر کرتی تھی۔ کیا فی الحقیقت وہ دل سے اسی کی تھی؟

آٹا گوندھ کر پرات کو تھالی سے ڈھانپنے کے بعد ہاتھ دھوتے ہوئے سرتوں نے کہا "آپ کیا سمجھتے ہیں کہ آدمی اگر جیل چلا جائے تو وہ بُرا ہو جاتا ہے۔ کئی مہاپرشوں کو بھی جیل جانا پڑتا ہے۔"

"ہاں ــ لیکن میں کوئی مہاپرش یا لیڈر نہیں ہوں۔"

"کچھ بھی ہو۔ آپ کسی بُرے کام کی وجہ سے جیل نہیں بھیجے گئے تھے۔"

"اچھائی بھی کیا تھی اس کام میں۔"

اب پرتھی پال سنگھ کا نام گفتگو میں آنا ناگزیر تھا۔

سرتوں نے قدرے تامّل کیا اور پھر بولی:

"۔۔۔۔۔ البتہ کچھ بدنامی ہو گئی تھی۔۔۔۔"

"وہ کیوں۔" پالی نے حیرت سے پوچھا۔

"آپ نے۔۔۔۔۔ اسے مارا۔"

"ہاں۔"

"ایک روز پہلے میری ڈولی گئی تھی۔ لوگ عجیب عجیب باتیں کرنے لگے تھے۔۔۔۔۔"

"اچھا!!"

"آپ تو اپنے چکر میں رہے۔ لیکن جب میں سسرال سے واپس آئی تو مختلف قسم کی باتیں لوگوں کی زبانی سننے میں آئیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"کیسی باتیں؟"

"یہی آپ کے اور میرے متعلق۔"

پالی کو اس بات کا کچھ بھی علم نہیں تھا۔

"لیکن شکر کا مقام ہے کہ وہ باتیں زیادہ پھیلی نہیں۔ ۔ ۔ ۔"

اس پر پالی کو کچھ شرم بھی محسوس ہوئی اور کچھ لطف بھی آیا کہ آخر ان دونوں کا نام اکٹھا بھی لیتے رہے تھے لوگ۔

"سرتوں! لوگوں کا کیا ہے۔ وہ تو باتیں کرتے ہی رہتے ہیں — ان کے منہ میں لگام نہیں دی جا سکتی۔"

نہ جانے پالی نے یہ بات کیوں کہہ ڈالی تھی۔ وہ اس بات کی اپنی زبانی تردید کیوں کرے آخر۔

سرتوں نے توا چولھے پر رکھ کر پالی کے ہاتھ دھلا دئے۔

آٹے کا پیڑا بناتے ہوئے اُس کی جانب دیکھے بغیر سرتوں نے پوچھا:

"آخر آپ نے اسے کیوں مارا؟"

پالی نے غور سے سرتوں کے چہرے کی جانب دیکھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ آخر یہ سوال کرنے سے اس کا مقصد کیا تھا۔ لیکن سرتوں کا چہرہ جھکا ہُوا تھا وہ اپنے کام میں محو معلوم ہوتی تھی۔ پیشتر اس کے کہ وہ کوئی جواب دے سرتوں نے اپنے خیالات میں گم پھر کہنا شروع کیا:

"جب میں سسرال سے پہلی دفعہ واپس گئی تو مجھے معلوم ہُوا کہ آپ نے اسے پیٹا ہے۔ بلکہ آپ اسے جان سے مار دینے کے درپے تھے لیکن وہ کسی نہ کسی طرح بچ نکلا۔ میری سہیلی نے مجھے یہ کہانی سنائی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"کیا کہتی تھیں وہ؟"

"اُنھوں نے بتایا کہ آپ کیسے اس کو بُری طرح سے پیٹتے پیٹتے اس کے گھر تک لے گئے تھے۔ وہ آپ کا مقابلہ نہیں کر سکا اور نہ کھیتوں میں کام کرنے والے ان کے آدمیوں میں سے کسی کی اتنی ہمت ہوئی کہ آپ کی راہ روک سکے۔"

"ہاں سرتوں! اس روز میری راہ روکنے کی کوئی ایسا شخص ہی کوشش کر سکتا تھا جسے اپنی جان کی پرواہ نہ ہوتی۔ اور تم جو پوچھتی ہو کہ میں نے اسے کیوں پیٹا۔۔۔۔ سو اس بات کا کیا جواب دوں؟ مجھے خود معلوم نہیں کہ میں نے اسے کیوں مارا۔ بس یوں سمجھو کہ میرے سر پر بھتنا سوار ہو گیا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ اسے کچا چبا ڈالوں۔۔۔۔"

"وہ بے چارہ خود حیران ہوتا ہو گا کہ آپ کا اُس نے کیا بگاڑا تھا۔ سچ مچ اس غریب نے آپ کا کیا بگاڑا تھا جو آپ اس کی جان لینے پر تُل گئے تھے؟"

"اچھا تو تمہارے خیال میں اُس نے میرا کچھ بگاڑا ہی نہیں تھا۔ اس مردود نے تو میری ساری اُمیدوں کا خون کر ڈالا تھا۔ زندگی میری نظر میں بالکل ہی بے معنی بنا دی تھی۔ اس وقت میں اندھا ہو گیا تھا۔ کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ کسی پہاڑ سے ٹکرے لوں یا طوفانی دریا کے آگے اپنا سینہ حائل کر دوں۔ سرتوں تم بھلا اس درد اور دُکھ کو کیا سمجھو۔ میں اپنے دل کی کیفیت بیان نہیں کر سکتا اور میرا تو یہ خیال ہے کہ اس کو بیان کرنا ایک سرے ہی سے ناممکن ہے۔ اگر تمہارے سینہ میں دل ہے اور وہ دل کچھ محسوس بھی کر سکتا ہے تو یوں سمجھ لو کہ میری وہی حالت تھی جو کسی ایسے انسان کی ہوتی ہے جس کے جگر میں تیز چھرا دھنس گیا ہو اور نہ تو اس کی جان نکلتی ہو اور نہ درد میں کمی محسوس ہوتی ہو۔۔۔۔"

"واہگورو واہگورو کیسا دردناک منظر کھینچا ہے آپ نے۔ اب بس کیجیے میں اور کچھ نہیں سُننا چاہتی۔ ذرا چارپائی آگے گھسیٹ لائیے تاکہ میں گرما گرم پھلکے دیتی جاؤں آپ کو۔۔۔۔"

بالی چارپائی گھسیٹ کر آگے لے گیا اور بولا "تم نے روٹی پکانے کی خواہ مخواہ تکلیف کی۔ اگر بیٹھنے بھی نہیں پایا تھا کہ تمہیں روٹی کی فکر لگ گئی۔"

"اس میں حرج ہی کیا ہے۔ آخر آپ کو کھانا تو کھانا ہی تھا۔۔۔۔"

"ہاں لیکن ایسی جلدی بھی کیا تھی۔"

"جلدی کیا ہے دیکھئے دھوپ کہاں سے کہاں جا پہنچی ہے۔ باتوں باتوں میں کچھ پتہ ہی نہیں چلا اور کھانا بھی طیار ہو گیا ہے۔ کھانا پکانا تو ہمارا کام ٹھہرا۔ بھلا اس میں تکلیف کیسی؟"

یہ کہہ کر سرتوں نے گورے گورے ہاتھوں سے کھانے کا تھال بالی کی جانب بڑھا دیا۔ مٹر بہت عمدہ پکے تھے۔ بالی چٹخارے لے کر بولا "سرتی! تم کھانا بہت مزے دار پکاتی ہو۔

مجھے خواب میں بھی خیال نہیں تھا کہ تم اس کام میں ایسی استاد ہو۔ واہ وا ــــ لیکن ہم جاٹ لوگ، دیہاتی، اجڈ اور ان گھڑ ٹھہرے۔ بھلا ہم اس کی کدر کیا جانیں۔"

"بس مہربانی ہے۔ مجھے بنانے کی کوشش نہ کریں۔ ہمیں اپنی قابلیت کا بخوبی علم ہے۔"

"جی آپ میں جو جو قابلیت ہے آپ کو ان کا پتہ ہی کہاں ہے۔ یہ تو کوئی ہم ہی سے پوچھے۔"

اس پر سرنوں مسکرا کر چپ ہو گئی۔

کھانا کھا کر پالی نے لمبے لمبے ڈکار لئے اور انگوچھے سے منہ صاف کیا اور جتنی دیر تک سرنوں چوکا برتن کرتی رہی۔ وہ اس کے پاس بیٹھا باتوں میں مصروف رہا۔

کام کاج سے فرصت پا کر سرنی بولی: "آیئے اندر چلیں۔"

وہ لوگ اس کمرے میں گئے جہاں بچہ سویا پڑا تھا۔ پالی نے سوئے ہوئے بچے کو دیکھا اور مسکرا کر بولا: "آپ کا بچہ بہت خوبصورت ہے۔ ہو بہو آپ کی شکل ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملے میں بالکل آپ ہی پر گیا ہے۔"

منا بہت بڑے پلنگ پر سویا پڑا تھا۔ سرنوں نے بچے کو پیار کی نظروں سے دیکھا اور پھر اپنے بالوں چھو کر بولی: "میرے بال سوکھ گئے ہیں۔ اب ذرا تیل لگا کر ان میں کنگھی کر ڈالوں ــــ گھبرایئے نہیں میں ادھر سے آئینہ لے آؤں۔ آپ کو یہاں تنہا بیٹھنا پڑے گا۔"

یہ کہہ کر وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ اس کی غیر حاضری میں پالی نے کمرے کا سرسری سا جائزہ لیا۔ کمرہ معمولی طور سے سجا ہوا لیکن صاف ستھرا تھا۔ دروازے کے قریب دسویں گورو گوبند سنگھ کی ایک تصویر لٹکی ہوئی تھی جس میں وہ گھوڑا دوڑاتے اور باز اڑاتے چلے جا رہے تھے۔ ان چیزوں سے نظر ہٹا کر پالی مضبوط سلاخوں والی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ تاحدِ نگاہ اونچی نیچی ڈھلانیں پھیلی تھیں۔ تیز دھوپ میں بھنگے سے اڑتے دکھائی دیتے تھے۔ قریب کسی قسم کی کوئی تیز آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ یہ جگہ شہر کی گہما گہمی سے دور تھی۔ فضا پر عجیب قسم کی خاموشی اور سکون طاری تھا۔

اتنے میں سرنوں کنگھی، تیل کی شیشی اور آئینہ لے کر وہاں آگئی اور پلنگ پر بیٹھ کر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

کچھ دیر تک دونوں طرف خاموشی طاری رہی۔ پھر سرنوں نے یہ سکوت کو توڑتے ہوئے پوچھا۔

"دیکھیئے آپ کو ہماری جگہ پسند آئی؟"

"ہاں ـــــ یہاں گاؤں کی سی کھاموشی ہے۔"

"مجھے خود خاموشی اور سکون پسند ہے۔"

قدرے تامل کے بعد پالی بولا۔ "لیکن سرنوں جب دل ہی کو شانتی حاصل نہ ہو تو بھلا یہ باہر کی شانتی کس کام آسکتی ہے۔"

سرنوں نے بوجھل بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے پوچھا "بھلا آپ کو کس بات کی چنتا ہے۔ چین کی بانسری بجاتے ہیں آپ۔"

پالی کا جیسے دل دُکھ گیا ہو۔ قدرے رقت انگیز لہجے میں بولا "سرنی! یہ تم کہتی ہو . . . بیزار بننے کی کوشش کرو لیکن تم میرے دل کی کیفیت سے ناواقف نہیں ہو۔"

اس پر پھر خاموشی طاری ہوگئی۔

بالآخر رنگین پھندنوں والی چوٹی گوندھ کر سرنوں پھر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

چند منٹ بعد نیا لباس زیب تن کرکے لوٹ آئی۔

پالی نے اسے دیکھا تو اس کے دل میں اک ہُوک سی اُٹھی۔ اس وقت سرنوں کے حُسن و جمال کی جو کیفیت تھی اس کا بیان کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ ایک ایک عضو سے حُسن و شباب اور رعنائی کے سوتے پھوٹ پڑے تھے۔ آنکھیں مدھ ماتی ہو رہی تھیں شیریں لبوں میں آبِ حیات کا چشمہ پوشیدہ تھا۔ جسم کے پھیلتے سمٹتے، اُبھرتے اور لچکتے ہوئے خطوط نمایاں ہو رہے تھے۔ سارا جسم شاخِ گل کے مانند لرزاں تھا۔

سرنوں نے بلند و بالا پالی، اور اس کے سر پر بندھی ہوئی دو تین شملوں والی پگڑی سلکی تہبند اور متجسس آنکھوں کا جائزہ لیا۔

پالی نے کہا "سرنوں! کیا تمہیں بچپن کا زمانہ یاد ہے؟ شاید تم ان باتوں پر ہنستی ہوگی۔ لیکن سچ جانو، میں اس زمانے کو کوشش کرکے دل سے بھلا نہیں سکا۔ میرے انگ انگ اور نس نس میں تم سما چکی ہو۔ میں ہمیشہ تمہیں اپنی اور صرف اپنی سمجھتا رہا۔ لیکن مجھے جب اس بات کا پتہ چلا کہ تم برتھی پال سنگھ کو پسند کرتی ہو تو میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی ـــــ سرنوں یہ درست ہے کہ میں شکل سے تمہارے قابل نہیں تھا۔ لیکن تمہاری سراسر بے رُخی کے قابل بھی تو نہیں تھا۔ کاش تم نے مجھے ایک موقع دیا ہوتا۔

صرف ایک سُوکا ئیں بڑا آدمی ہی سہی۔ میں بھٹکا ہُوا سہی۔ میں ڈاکو اور لٹیرا ہی سہی لیکن تمہاری راہ میں تو آنکھیں بچھاتا تھا ئیں۔ تمہیں ایک نظر دیکھنے کے بچھوڑں بعد میں نے سُدھرنا شروع کر دیا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

سرتوں اس کے قریب پہنچی اور کھڑکی کی سلاخوں کو تھام کر کھڑی ہو گئی۔ اور دُور اُفق کی جانب کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھنے لگی۔

سرتی کو اس قدر قریب پاکر پالی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

سرتوں چُپ کھڑی تھی لیکن اُس کے تیور صاف بتا رہے تھے کہ اے دوست! اب ان باتوں کو بھلا دینا ہی بہتر ہے۔ جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ اب کب تک بیتی باتوں کو یاد کر کر کے ہلکان ہوتے رہو گے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم مجھے اس قدر شدّت کے ساتھ محبت کرتے ہو۔ اور پھر وہ زمانہ ہی اور تھا۔ سوچنے اور سمجھنے کا انداز ہی جُدا گانہ تھا۔

کچھ دیر تک بھدّا اور اُکتا دینے والا سکوت طاری رہا۔ پھر دفعتاً سرتوں بول اُٹھی۔

"آپ سے ایک بات پُوچھوں؟"

"پُوچھو۔"

قدرے تامّل کے بعد وہ پھر بولی۔" اگر آپ پرتھی پال سنگھ کی جگہ ہوتے اور میں آپ سے کہتی کہ مجھے بھگا کر لے چلئے تو اس صُورت میں آپ کیا کرتے؟"

پالی نے سرتوں کا دلی منشا بھانپنے کیلئے اس کی نظروں سے نظریں ملانے کی کوشش کی لیکن وہ باہر کی جانب دیکھتی رہی۔ پالی کو کچھ سُوجھ نہیں رہا تھا کہ کیا جواب دے۔

"آپ بولتے نہیں۔"

"سرتوں ـــــ میں نہیں جانتا کہ تم نے یہ سوال کیوں کیا ہے لیکن اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ـــــ اگر تم نے مجھ سے یہ بات کہی ہوتی تو میں تمہیں بھگا لے جاتا۔"

یہ کہہ کر اُس نے مُنہ پھیر لیا اور دوسری جانب کو دیکھنے لگا۔ چند لمحوں کے بعد اُس نے محسوس کیا کہ سرتوں کا بدن اُس کے جسم سے چھُو رہا ہے وہ اس کے بہت قریب آ چکی تھی۔ پالی نے اس کا نازک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور الفاظ بے تحاشہ اُس کے مُنہ سے نکلنے لگے۔

"سرتوں میں تمہیں اور صرف تمہیں سے محبت کرتا ہوں۔ تم نہیں جانتیں کہ میں اپنا سب کچھ ہار چکا ہوں۔ جان اور دل تم پہ نچھاور کر چکا ہوں۔ تم میرے تن اور من کی رانی ہو۔ تم نے اپنی دُنیا سے نکال باہر کر کے مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔ سرتوں تم بچپن سے میری رگ رگ میں سمائی ہوئی ہو۔

میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔ تمہارے سامنے میں ایک بچے کی طرح ہوں۔ سچ کہو ظالم! میں نے
تمہارا کیا بگاڑا تھا جو تم نے مجھے تباہ و برباد کر دیا۔ میں سب کچھ تم سے کہہ دینا چاہتا تھا۔ لیکن
تم نے مجھے اس بات کا کبھی کوئی موقع ہی نہیں دیا۔ سرتوں یقین کرو۔ تمہارے بنا زندہ رہنا
میرے لیے محال ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

یہ کہہ کر اس نے سرتوں کو ننھی گڑیا کی طرح اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ اُس کے
بھرپور جسم کو اپنے بازوؤں کی گرفت میں پاکر اپنے سینہ پر اس کی سخت چھاتیوں کا لمس،
اور اُس کے دہکتے ہوئے رُخساروں اور دہکتے ہوئے سُرخ لبوں کو اس قدر قریب پاکر
پالی کی عقابی آنکھوں میں وحشت رقص کرنے لگی۔

سرتوں نے کسمسا کر چشم زدن میں اپنے آپ کو اس کی گرفت سے آزاد کیا اور جا بیٹھی
بچے کے قریب جاکر بیٹھ گئی ۔۔۔ اُس کی لمبی چوٹی کے رنگین پھندنے لہرانے لگے۔

پالی گلوگیر آواز میں بولا" سرتوں! اس قدر پتھر دل نہ بنو۔ مجھے بے موت مرنے سے بچالو۔
میرا یہی قصور ہے ناکہ تمہارے حُسن کے جادُو کے سامنے اپنے آپ کو لاچار پاتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔"

سرتی نے گھوم کر اُس کی جانب دیکھا۔ اُس کی آنکھیں یوں دکھائی دیتی تھیں جیسے
شبنم میں نہائے ہُوئے کنول۔

وہ بڑھ کر اُس کے قریب ہو بیٹھا اور سرگوشی میں بولا" جان سے پیاری سرتی!
اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ آؤ ہم بھاگ چلیں۔ اس دنیا سے دُور اپنی نئی دُنیا بسائیں گے ۔ ۔ ۔"

"نہیں اب نہیں ۔۔۔ ہرگز نہیں۔ اب میری شادی ہو چکی ہے۔ میں ایک بچے کی ماں
بن چکی ہوں۔ مجھے اپنے پتی سے کوئی شکایت نہیں۔ میں انہیں دغا ہرگز نہیں دوں گی اور
نہ اپنے بوڑھے ماں باپ کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکا لگنے دوں گی!"

پالی نے پاگلوں کے سے لہجے میں کہا" سرتی احمق مت بنو۔ میرا کہنا مان لو ۔ ۔ ۔ ۔"

"بس بس ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ مجھ سے ایسی کوئی بات نہ کہیں۔ آپ مجھے غلط سمجھے ۔ ۔ ۔ میں
اس قماش کی عورت نہیں ہوں۔ جو ہونا تھا سو ہو چکا ۔ ۔ ۔ ۔ آپ اس قسم کی باتیں زبان
پر نہ لائیں۔ میرے ہمدردانہ سلوک کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ ہوش و حواس ہی کو خیرباد
کہہ دیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

پالی نے والہانہ انداز سے سرتوں کو گھسیٹ کر اپنی گود میں لے لیا اور زور سے لپٹا کر

اس کے تمتماتے ہوئے رخسار پر ہونٹ جما دیئے۔

سرتوں تڑپ کر اُٹھی اور پرے ہٹ کر کھڑی ہوگئی اور جھلا کر بولی "دیکھئے آپ شرافت کی حدود سے تجاوز کر چکے ہیں اور میں آپ سے آخری بار کہتی ہوں کہ ہوش کے ناخن لیجئے۔ اگر واقعی آپ میں کوئی شرافت ہی نہیں ہے تو میری عزت ہی کا خیال کیجئے۔"

سرتوں کے قہر نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ اس کی بگڑی چیتون، برہم زلفوں دہکتے ہوئے رخساروں، اُس کی چھاتیوں کے تلاطم نے اسے پالی کی نظروں میں اور بھی حسین بنا دیا تھا۔ پالی کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کا جسم بھڑکتی ہوئی آگ کی لپیٹ میں آگیا ہے اور اب اس کے بس کی بات ہی نہیں رہی ـــــ اُس کے سامنے کھڑی ہوئی عورت ـــ حسن و شباب کے مجسمے کی طلب جس شدت سے اس وقت پیدا ہوئی پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اخلاق اور شرافت سے وہ اس وقت کوسوں دُور تھا۔ اس وحشی جذبے کے تحت وہ قطعاً بھلا بیٹھا تھا کہ وہ وہاں کس غرض سے آیا تھا۔ اسے کیا کرنا تھا اور کیا نہیں کرنا تھا ـــ اُس نے چند ثانیوں تک عقابی نظروں سے سرتوں کی جانب دیکھا۔ پھر نہ جانے سرتوں نے اُس کی آنکھوں میں کیا دیکھا کہ وہ ہلکی سی چیخ مار کر دوسرے کمرے کی جانب دوڑی۔ ادھر پالی تیر کی سی تیزی سے اس کی طرف لپکا۔ پیشتر اس کے کہ سرتی اندر سے دروازہ بند کر سکتی۔ اُس نے اپنا بازو اندر ڈال دیا۔ سرتوں نے دروازے کا تختہ پے در پے مار کر اس کا بازو لہولہان کر دیا لیکن وہ کندھے کا دھکا دے کر اندر داخل ہونے میں کامیاب ہوگیا۔

سرتوں پیچھے ہٹ گئی۔ اس وقت اس کی صورت وحشت زدہ ہو رہی تھی گورے گورے بدن کا بیشتر حصہ کپڑے پھٹ جانے کے باعث عریاں ہوگیا تھا۔ وہ پالی کو قہر آلود نظروں سے دیکھتی ہوئی وحشی بلی کے مانند رنگین پایوں والے بڑے پلنگ کی پٹی کے ساتھ ساتھ قدم بقدم پیچھے کی طرف ہٹ رہی تھی۔

سرتوں نے اُس کی نظروں میں نظریں ڈال کر مدھم لیکن مضبوط آواز میں کہا۔ "اگر اب تم نے مجھے ہاتھ لگایا تو میں چیخ کر سب کو خبردار کر دوں گی اور تم پولیس کے حوالے کر دیئے جاؤ گے۔"

لیکن معلوم ہوتا تھا کہ پالی کے دل پر اس بات کا خاک بھی اثر نہیں ہُوا تھا۔ معاً اس نے جست لگا کر سرتی کو ننھے چوزے کی مانند دبوچ لیا۔ ایک بازو میں سرتی کے جسم کو باندھ

سمیت جکڑ لیا اور دوسرے بازو کی کہنی تلے اس کا شانہ دبا کر ہاتھ سے اس کا منہ بند کر دیا۔ سرتوں کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ لیکن اس کے منہ سے آواز تک نہیں نکل سکتی تھی۔ وہ پاتی کی آہنی گرفت میں مچھلی کے مانند پیچ و تاب کھا رہی تھی لیکن کچھ بس نہیں چلتا تھا۔ اگرچہ اُس کے پاؤں زمین پر ٹکے تھے۔ لیکن اس کا بدن کمان کی طرح بل کھا کر پشت چارپائی سے جا لگی تھی۔ اُوپر سے پاتی دباؤ ڈال رہا تھا۔ نیچے سے چارپائی کی پٹی بُری طرح چبھ رہی تھی۔ اس کی جان آفت میں پڑ گئی تھی۔

اب پاتی کو محسوس ہُوا کہ سرتوں اس کی گرفت سے ہرگز نہیں نکل سکتی تھی۔ حالانکہ وہ پوری قوت سے مدافعانہ انداز سے تڑپ رہی تھی۔ لیکن یہ سب کچھ بے سُود تھا۔

سرتوں نے دم لینے کے لیے تامل کیا اور پاتی اس کی جانب خوابناک نظروں سے دیکھنے لگا۔ اُسے یوں محسوس ہُوا جیسے کہ اب تک وہ بے برگ و گل ویرانے میں گھومتا رہا ہے۔ کوئی اس کا پُرسانِ حال نہیں تھا۔ کوئی حبیب کوئی غمخوار نہیں تھا۔ وہ تنہا تھا، کمزور تھا، بے بس تھا، بے یار و مددگار تھا۔ کسی نے اس پر لطف و کرم کی ایک نگاہ تک ڈالنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ وہ سالہا سال تک خلا میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ کسی نے اسے اس کا حق دلانے کی کوشش نہیں کی۔ یہاں تک کہ اس پر رحم بھی نہیں کیا۔ کسی نے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ملا تھا۔ اس کا دل رو رہا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دینا چاہتا تھا۔ وہ اپنے بازوؤں میں اپنے جسم و جان کے اس قدر قریب اس عورت کو لپٹائے ہوئے تھا جس کی ایک مسکراہٹ کے لئے وہ اپنی جان تک قربان کر سکتا تھا۔ اُس نے دھیرے سے نیم وا آنکھوں کو مکمل طور پر کھول کر انتہائی محبت اور لجاجت سے کہنا شروع کیا: "سرتوں! دیکھو اس قدر خفا کیوں ہوتی ہو۔ میں تمہارا دشمن نہیں ہوں تمہارا غلام ہوں تمہارے ابرو کے ایک اشارے پر جان حاضر کر سکتا ہوں۔ کچھ تو خیال کرو۔۔۔۔"

سرتی کے رویے میں کوئی فرق نہیں آیا۔ تازہ دم ہو کر وہ اس کی گرفت سے آزاد ہونے کے لئے پھر بے طرح تڑپنے لگی۔ اس پر پاتی نے دوسرا بازو اُس کی کمر تلے سے نکالا اور کہنی اس کی چھاتیوں سے ذرا اُوپر ٹیک کر دباؤ جو ڈالا تو ناتواں عورت حرکت کرنے سے بھی معذور ہو گئی۔ پاتی نے منت آمیز لہجے میں کہا:

"میرے دل کی رانی! اس طرح تمہیں بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ تم پلنگ پر لیٹ جاؤ

اور میری بات سنو . . . . . . "

یہ کہہ کر اُس نے سرتوں کو آرام سے لٹا دیا۔ لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ وہ اس کی گرفت میں سے نکل نہ سکے۔ غم و غصے کے مارے سرتوں کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ تنگ اور نازک نتھنے پھڑک رہے تھے۔ پالی بے حس نظروں سے کچھ دیر تک اُس کی جانب دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے انتہائی پیار سے اس کے ہونٹوں کو چوم لیا۔ آنکھوں، پپوٹوں، ابروؤں، پیشانی، بالوں، ٹھوڑی، رخساروں، گردن غرض ہر حصّے کو اُس نے پاگلوں کی طرح بار بار چوما۔ بار بار پیار کیا۔ اُس کے گھنے بالوں میں اُنگلیاں پھیر پھیر کر . . . .

پھر اُسے یُوں محسوس ہُوا جیسے کوئی آندھی یا طوفان میں گھر گیا ہے جس میں اس کی ہستی محض ایک حقیر تنکے کے مانند ہے یا اس کا بدن منوں لکڑی کی چتا میں جلایا جا رہا ہے در روئیں روئیں سے آگ کے شرارے نکل رہے ہیں۔ ایک عجیب قسم کے اذیت دہ انبساط کی سی کیفیت طاری تھی اس پر، جیسے وہ بجلی کے شانوں پر سوار ہو، یا جیسے تیز و تند ہواؤں کی لگامیں اُس کے ہاتھ میں ہوں۔ اور وہ مُنہ زور رفتار سے اُڑا جا رہا ہو . . . . بالآخر اسے یوں محسوس ہُوا جیسے طغیانی چڑھ کر اُتر گئی۔ سرتوں نے مُنہ پھیر کر چہرے پر کپڑا ڈال لیا . . . . . . پالی نے گھڑی بھر کو آنکھیں مُوند کر اپنا سر سرتوں کے نکھرے رنگ کے گداز سینہ پر ڈال دیا۔

چند گھڑی پہلے چہرے پر شدید خشونت کے آثار پیدا ہونے سے پالی کی صورت مسخ ہو گئی تھی اور اب رفتہ رفتہ چہرے کے خطوط اپنی اصلی حالت میں تبدیل ہو رہے تھے۔ بالآخر اُس نے نیم وا آنکھوں سے سرتوں کی اُجلی گردن کا جائزہ لینے کے بعد سر اُٹھایا اور اُس سے نظریں ملائے بغیر پرے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

کمرے میں خاموشی طاری تھی۔

پالی نے سرتوں کی جانب دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ وہ اُس کی آواز کا منتظر تھا۔ کیوں کہ اُسے یقین تھا کہ وہ ضرور اسے کچھ نہ کچھ کہے گی ـــ لیکن اُدھر بھی بے ڈھنگی خاموشی طاری رہی ـــ پھر اس نے دُزدیدہ نظروں سے اُس کی جانب نظر اُٹھائی۔ گردن سے نیچے کا سارا بدن بالکل اُسی حالت میں پڑا تھا جس میں کہ اُس نے اسے چھوڑا تھا ـــ کیا وہ بیہوش ہو گئی تھی ـــ اُس نے اُس کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں ـــ نہیں وہ بیہوش

نہیں تھی۔ اُس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ وہ پلک جھپکے بغیر ٹکٹکی باندھے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے سے اب کسی جذبے کا بھی اظہار نہیں ہوتا تھا۔ اُس نے بدن ڈھانپنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ جو ہونا تھا سو ہو چکا پائی عجب گومگو کی سی حالت میں کھڑا تھا۔ پھر سرتوں کے لب ہلے اور وہ سرد مہری سے بے کیف آواز میں بولی:

"کیوں! منہ کالا کر چکے اپنا۔"

پائی نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن بیشتر اس کے کہ وہ کچھ کہہ پاتا۔ سرتوں اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اُس نے اپنے بدن کی عریانی کی اب بھی کوئی پرواہ نہیں کی۔ اس کے جسم کو اس حالت میں دیکھ کر پائی کو کراہت سی محسوس ہونے لگی۔ "تم محبت کرنے کے اہل نہیں ہو۔ تم صرف گھٹیا سی انسانی خواہشات کے پتلے ہو۔"

یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور اپنی شلوار کے ازار بند کو سنبھالنے لگی۔ پائی کے ذہن میں اُلجھن سی پیدا ہو گئی تھی۔

سرتوں سر کے تیز جھٹکے سے زلفیں پیچھے کی جانب پھینکتے ہوئے بولی۔ "تم زانی اور لٹیرے باپ کے زانی اور لٹیرے بیٹے ہو — تم سے کسی بہتر جذبے کی اُمید کرنا حماقت ہے۔۔"

پائی کے منہ سے چند مبہم سی آوازیں نکلیں ..... سرتوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ اس کی لاٹھی، کمبل اور انگوچھا اس کے چہرے پر دے مارا اور چیخ کر بولی: "اب نکل جاؤ میرے گھر سے۔ خبردار! اب اِدھر کا رُخ کبھی نہ کرنا تم نے میری آبرو خراب کی۔ یہ بات میں کبھی نہ بھولوں گی نہ معاف کروں گی۔"

وہ اسے باہر کی جانب دھکیلنے لگی۔ پائی لڑکھڑاتا ہوا صحن میں نکل آیا۔ وہ قطعاً نہ سمجھ سکا کہ آخر یہ کیا تماشہ ہے۔

بولتے وقت سرتوں کی گردن کی رگیں پھڑک پھڑک جاتی تھیں۔ صحن میں پہنچ کر آنکھوں سے قہر برساتے ہوئے وہ دبی آواز میں غرائی: "میں تم سے نفرت کرتی ہوں — سمجھے؟ میں تمہیں آوارہ کتے سے بھی بدتر سمجھتی ہوں میں تمہیں سدا سے نفرت کرتی ہوں لیکن مجھ پر اس نفرت کا راز آج کھلا ہے۔ جا! ذلیل!..... کمینہ!..... لفنگا!!....."

اسے دروازے سے نکال باہر کرنے کے بعد سرتوں نے آہنی دروازہ بند کر کے کنڈی
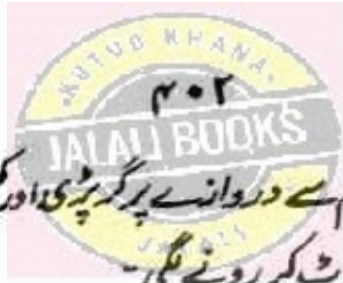
چڑھالی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور خود دھم سے دروازے پر گر پڑی اور کھسکتی ہوئی زمین پر جا گری اور پھر ننھے بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

پالا سنگھ گھر سے باہر کھڑا کچھ دیر تک اُس کے رونے کی آواز سُنتا رہا۔ پھر بھاری قدموں سے چلتا ہوا تیس یا چالیس گز پرے شہتوت کے پیڑ کے نیچے رُک گیا۔

قدرے تامّل کے بعد اُس نے ڈاڑھی کو سنوارا۔ اُوپر والے شملے کو سیدھا کیا اور گھوم کر اس دروازے کی طرف دیکھنے لگا جو اُس کے لئے ہمیشہ کے لئے بند ہو چکا تھا۔

اپنی راہ لگنے سے پہلے اُس نے پَچ کی آواز کے ساتھ اگلے دانتوں کی دراڑ سے تھوک کی پچکاری چھوڑی۔ لعابِ دہن کے ننھے ننھے قطرے اُس کی ٹھوڑی کے بالوں پر لرزنے لگے اور پھر وہ اپنی مخصوص بھاری آواز میں غرّایا:

"ہونہہ! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُلّو کی پٹھی!!"
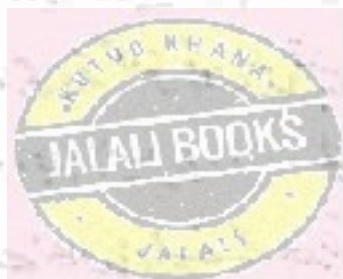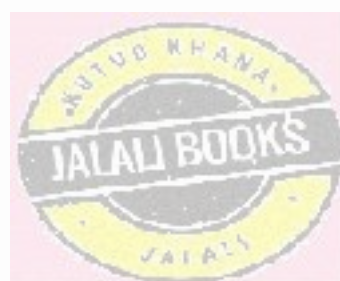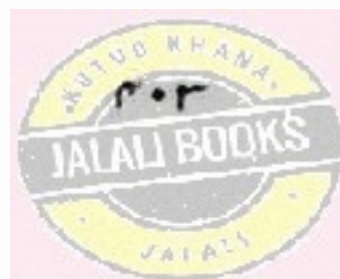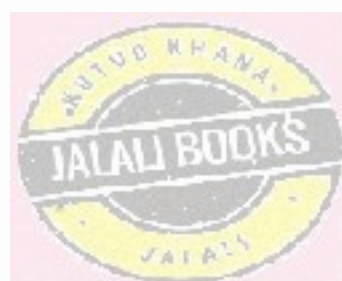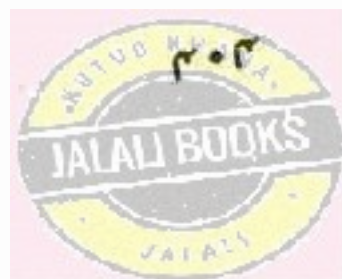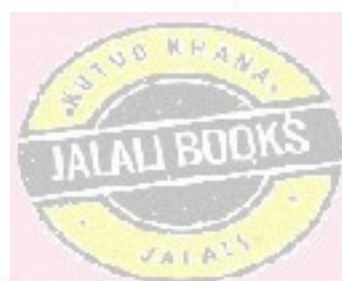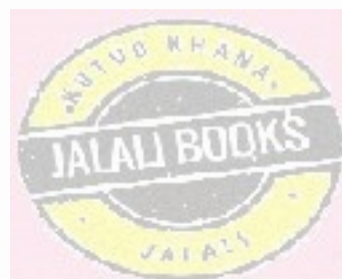
ہماری مطبوعات

کتاب	مصنف
پطرس کے مضامین	پطرس بخاری
پطرس کے خطوط	"
تخلیقات پطرس	"
افسانے، ڈرامے، ناولٹ	"
خطبات پطرس	"
تنقیدی مضامین	"
پانچ برس لمبی سڑک	امرتا پریتم
آشیانہ	"
انچاس دن	"
زندگی نامہ	"
بلاوا	"
ڈاکٹر دیو	"
رسیدی ٹکٹ	"
ایک ہاتھ مہندی ایک ہاتھ چھلہ	"
امرتا پریتم کے افسانے	"
امرتا پریتم کی شاعری	"
محبت نامے	"
میرا کمرہ	"
پنجر	"
یہ سچ ہے	"
ناگ منی	"
رنگ کا پتہ	"
ایک لڑکی ایک جام	"
ایک تھی انیتا	"
زندگی نامہ	
جہان دیگر	قرۃ العین حیدر
فصل گل آئی یا اجل آئی	"

کتاب	مصنف
مضامین رشید	رشید احمد صدیقی
خنداں	"
آشفتہ بیانی میری	"
افسانے ڈرامے	عصمت چغتائی
بدن کی خوشبو	"
چوٹیں	"
دو ہاتھ	"
دل کی دنیا	"
کلیات جگر	جگر مراد آبادی
کلیات ساحر	ساحر لدھیانوی
کلیات شکیل	شکیل بدایونی
جوش کی شاعری	جوش ملیح آبادی
گیتا نجلی	رابندر ناتھ ٹیگور
بغاوت	درشن سنگھ آوارہ
شعلۂ ساز	فراق گورکھپوری
روح کائنات	"
گل نغمہ	"
پاگل	خلیل جبران
جوانی اور محبت	"
مجرم	"
مہمان	"
اس نے کہا	"
جنت ارضی	"
ارضی دیوتا	"
زرد پتے	"
افکار جبران	"
خدا اور دیوتا	"